

کلیاتِ علی سردار جعفری

جلد دوم
(شاعری)

مرتب
علی احمد فاطمی



قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند

ویسٹ بلاک-1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066

Kulliyat-e-Ali Sardar Jafri-Vol. II (Poetry)

Edited by

Ali Ahmad Fatmi

© قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

پہلا ایڈیشن : 1100

سہ اشاعت : جولائی، ستمبر 2005، شک 1927

قیمت : 200/- روپے

شمار سلسلہ مطبوعات : 1235

ISBN : 81-7587-103-2

ناشر: ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، پوسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی-110068

فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، 26108159؛ فیکس: 26108159

ای۔ میل: urducoun@ndf.vsnl.net.in، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈرز، جامع مسجد دہلی - 110006

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ اس کی کارگزاریوں کا دائرہ کئی علوم کا احاطہ کرتا ہے جن میں اردو کی ان کتابوں کی مکثر اشاعت بھی شامل ہے جو اردو زبان و ادب کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور اب نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔ ہمارا یہ ادبی سرمایہ محض ماضی کا قیمتی ورثہ ہی نہیں، بلکہ یہ حال کی تعمیر اور مستقبل کی منصوبہ بندی میں ہماری رہنمائی بھی کرتا ہے۔ اس سے کما حقہ، واقفیت نئی نسلوں کے لیے بے حد ضروری ہے۔ قومی اردو کونسل ایک منضبط منصوبے کے تحت قدیم اور جدید عہد کی اردو کی تصنیفات شائع کرنے کی اس لیے بھی خواہاں ہے تاکہ اردو کے اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا جاسکے اور زمانے کی دستبرد سے بھی اسے محفوظ رکھا جاسکے۔

عہدِ حاضر میں اردو کے مستند کلاسیکی متون کی حصولیابی، نیز ان کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، لیکن قومی اردو کونسل نے حتی الوسع اس مسئلے پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ کلیاتِ علی سردار جعفری اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے کونسل قارئین کی خدمت میں پیش کر رہی ہے۔

اہلِ علم سے گزارش ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں دور کی جاسکے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائریکٹر

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
5-	ایشیا جاگ اٹھا	17-57
6-	پتھر کی دیوار	59-179
1	حرفِ اول	61
2	دیباچہ طبعِ ثانی	71
3	پتھر کی دیوار	73
4	موت	81
5	مقتولِ مامتا	85
6	بہی	87
7	دکن کی شہزادی	92
8	اودھ کی خاکِ حسین	94
9	میرے خواب	101
10	شادی کا دن	107
11	جیل کی رات	108
12	تمھاری آنکھیں	109
13	تجدیدِ وفا	112
14	نیند	114
15	ایک سال	118
16	زندہاں بہ زندہاں	123
17	خونیں ہاتھ	125

127	بھوکی ماں، بھوکا بچہ	18
129	آخری رات	19
131	فیض کے نام	20
137	سجاد ظہیر کے نام	21
140	یلغار	22
147	متفرقات	23
161	اردو	24
164	غزل	25
166	اناج	26
168	غزل	27
169	تہنیت	28
172	حسن کشمیر	29
174	جہلم کا ترانہ	30
177	رائفل کی گولیوں کا نغمہ اور نئے شعری پیکر کی تخلیق	31

7۔ ایک خواب اور 181-313

183	حرفِ اوّل	1
185	ایک خواب اور	2
187	ہاتھوں کا ترانہ	3
190	زندگی	4
193	سرِ طور	5
196	ذوقِ طلب	6
198	ہم نے دیکھا ہے	7
199	غزل (شکستِ شوق)	8
201	مشرق و مغرب	9

205	تمنِ شرابی	10
215	قطعہ (تہنم لب ساقی)	11
215	نفل یاراں	12
216	بشن بادہ ساراں	13
218	مرے عزیز و مرے رفیقو	14
224	نذر عقیدت	15
225	غزل (میں جہاں تم کو باتا ہوں)	16
226	جامِ محبت	17
227	سورنگ	18
228	غزل (لغزشِ گام)	19
229	غزل (گماں اور)	20
230	غزل (دل کے سوا)	21
231	غزل (کھلے ہیں گلزار)	22
232	غزل (ظلم کی کچھ معیا نہیں ہے)	23
233	غزل (سینہ دکھارتے ہیں)	24
234	غزل (دل کے آنگن میں)	25
235	غزل (یاد آئے ہیں)	26
236	لحوں کے چراغ	27
237	یہ زندگی ہے	28
238	حسین تر	29
240	میر اسفر	30
243	کوچہ چاکہ گریباں	31
244	ایک بات	32
245	نوالہ	33
246	دو چراغ	34

248	دردِ عشق	35
249	اہلِ درد	36
250	دو شعر (منزل کوئی نہیں)	37
250	دو شعر (یہ نہ پوچھ)	38
251	دو شعر (شوق کی راہ میں)	39
251	دو شعر (اے ساقی)	40
252	غزل (خزاں ہے چارون کی)	41
243	تمن شعر (خونِ دل)	42
254	غزل (خیر مناء)	43
255	تخلیق کا کرب	44
255	دو شعر (برگِ خشک وزرد)	45
256	دو شعر (تمام رات)	46
256	دو شعر (بات کرو)	47
257	دو شعر (پسند کیوں قاتلوں کو آئیں)	48
257	تمن شعر (یہ بوئے گل)	49
258	سلام	50
259	قطعہ (حسن تیرا)	51
260	تمن شعر (کنارِ شوق)	52
260	تمن شعر (ہنوں زلفِ معنبر)	53
261	دو شعر (زخمِ تازہ کی سوغات)	54
261	قطعہ (ہوائے صبحِ مشرق)	55
262	پانچ شعر (جس سے.... کبھی)	56
263	آباد ویرانے	57
264	مرے خواب	58
265	ایک پھول	59

266	قطعه (شعانی لے کر)	60
266	ترے پیار کا نام	61
267	جب ترانہ لیا	62
268	وردا اک چاند ہے	63
268	غم کا ہیرا	64
269	اجنبی آنکھیں	65
269	شعلہ لبی	66
270	پیاں بھی ایک سمندر ہے	67
270	شعلہ و شبنم	68
271	یا قوت لبی	69
271	چاند کو رخصت کر دو	70
272	آرزو کے صنم خانے	71
274	تم نہیں آئے تھے جب	72
276	تو مجھے اتنے پیار سے مت دیکھ	73
277	بہت قریب ہو تم	74
278	تمہارے ہاتھ	75
279	نسیم تیری قبا	76
280	پیاں کی آگ	77
281	قتالِ عالم	78
282	قطعه (نسیم صبح تصور)	79
283	غزل (خوگر روئے خوش جمال ہیں ہم)	80
284	غزل (ہے کہ نہیں)	81
285	غزل (حسرتِ دل ہے)	82
286	غزل (اور بھی تیز)	83
287	غزل (نغمہ زنجیر ہے)	84

288	تین شعر (رفیق بھی ہے)	85
289	دوستائے	86
290	شعلہ حسن	87
291	قطعہ (آتیرے ہونٹ چوم لوں)	88
291	قطعہ (ابھی جوان ہے)	89
292	تن کی چاندی، من کا سونا	90
293	قطعہ (متحد ہو کے اٹھے)	91
294	شامِ غم	92
296	لطفِ سخن	93
297	ستارے	94
298	خجروں کی روشنی	95
299	قطعہ (ہر ایک خوشی)	96
300	جب مباح آئے گی	97
301	قلبِ آفتاب	98
302	برہنہ پا ہے بہار	99
305	پتھرِ مسیحا دست	100
308	رہبر کی موت	101
309	صندل و گلاب کی راکھ	102
311	فاصلے	103
312	متفرق اشعار	104
315-380	پیراہنِ شرر	8
319	پیراہنِ شبنم پنڈت آنندزائن ملّا	1
324	حرفِ اول	2
333	پیراہنِ شرر	3

334	تم بھی آؤ	4
335	اے چل	5
337	یہ لہو	6
339	دعا	7
341	قطعہ	8
342	غزل	9
343	غزل	10
344	غزل	11
345	غزل	12
346	جنگ بازوں کا فرمان	13
347	کون دشمن ہے؟	14
351	شہرِ تمنا	15
353	دستِ فریاد	16
353	اشکِ ندامت	17
354	صبحِ فردا	18
357	ہمارے نام	19
360	غزل	20
362	جرعہ جرعہ قطرہ قطرہ	21
363	چار شعر	22
364	موسموں کا گیت	23
373	حرفِ آخر	24
375	تا شقند کی شام	25
377	اسے نہ ڈھونڈو	26
378	امانتِ غم	27

381-470

لہو پکارتا ہے

9

385	حرف اول	1
386	ایک شعر	2
387	لہو پکارتا ہے	3
389	گفتگو	4
391	نظم	5
392	نظم	6
392	قطعہ	7
393	آرزوئے تشنہ لبی	8
394	چار شعر	9
394	دو شعر	10
395	غزل	11
396	تمہارا شہر	12
399	پھول، چاند، پرچم	13
401	لدی تے	14
403	ایک پرانی داستان	15
405	اب بھی روشن ہیں	16
407	شعور	17
408	برہنہ فقیر	18
410	نفرتوں کی سپر	19
411	قطعہ	20
411	دو شعر	21
412	غزل	22
413	جشن دلداری	23

415	غزل	24
416	دینوازلہو	25
417	قطعہ	26
417	کون جی بولے گا	27
418	تین شعر	28
418	دو شعر	29
419	قطعہ	30
419	دو شعر	31
420	دو شعر	32
420	خون کا اجالا	33
421	سجاد ظہیر	34
421	صلیب	35
422	چار شعر	36
423	غزل	37
424	نظم	38
425	غزل	39
426	دو شعر	40
427	غزل	41
428	شاعر	42
429	غزل	43
431	غزل	44
432	نظم	45
432	نظم	46
432	نظم	47
433	غزل	48

434	غزل	49
435	غزل	50
436	صبح نوا	51
437	کارل مارکس	52
438	غزل	53
439	غزل	54
440	خاموشی	55
441	چھوٹا سادل	56
442	تین شعر	57
443	غزل	58
444	غزل	59
445	اشعار	60
445	تین شعر	61
446	ہندستان کے بھوکے اساتذہ	62
446	اشعار	63
447	نظم	64
448	اقبال کی آواز	65
448	تین شعر	66
449	غزل	67
451	تہنیت	68
453	غزل	69
454	قطعہ	70
454	تین شعر	71
455	کاسنہ سر	72
456	لمحے آفتاب	73

457	غزل	74
459	افریقی لڑکی	75
460	جشی میرا بھائی	76
463	لوئی آراگون	77
464	پابلو نرودا	78
466	جولیو کیوری	79
467	پال روسن	80
469	ایلیا ابرن برگ	81
469	فیض احمد فیض	82
470	کرشن چندر	83

471-533

بعد چند نظمیں وغزلیں

473	کر بلا (ایک رجز)	1
477	آبلہ پا	2
480	غزل	3
481	غزل	4
482	غزل	5
483	سیلِ وقت (رقصِ خزاں)	6
484	خواب پریشاں	7
486	رقصِ ابلیس	8
487	رقصِ ابلیس کے بعد	9
490	دعائے مغفرت	10
490	ایک شعر	11
491	نومبر میرا گہوارہ	12
504	دل اور شکستِ دل	13
506	اسے شہ سوارو	14
508	اعطش	15

510	میں دیوارِ زنداں	16
511	چار شعر	17
511	ہوے دل	18
512	دو شعر	19
512	نئی نسل کے نام	20
514	غزل	21
514	ایک شعر	22
515	راجِ نراج	23
516	غزل	24
517	غزل	25
518	غزل	26
518	ایک شعر	27
519	ایک شعر	28
519	ایک نظم	29
520	سندر کی بیٹی	30
522	دو شعر	31
523	دولتِ دنیا کا حساب	32
524	کرشمہ	33
525	پروین شاہ کر	34
528	صفارت خانہ جاں	35
529	غذرا خیر الایمان	36
529	تمیں شعر	37
530	احمد فراز کے نام	38
531	وید مقدس	39
532	چند الکا	40
533	غزل	41

ایشیا جاگ اٹھا

(سن اشاعت۔ پہلی بار۔ اکتوبر 1950،

دوسری بار۔ مارچ 1952)

یہ ایشیا کی حسین بستی ہے نینک کا راستا نہیں ہے
اڑیں گے جس میں تمہارے بمبار اب یہ ایسی ہوا نہیں ہے
تمہیں گزرنا پڑے گا ہر گام پر تلنگانے کی زمیں سے
تمہارے سر پر پہاڑ برسیں گے چھاپہ ماروں کی آستیں سے
بھنور کے حلقے تمہارے پیروں میں اپنی زنجیر ڈال دیں گے
ہواؤں کے ہاتھ تم کو نیلی فضا سے اوپر اچھال دیں گے

کرشن چندر کی حسین و جمیل

کہانیوں کے نام

جو

ایشیا کی جنگ آزادی کے خوبصورت ہتھیار ہیں

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
 قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
 جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
 جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

اقبال

حرف اول

اب سے ہوگا ایشیا پر ایشیا والوں کا راج
 دستِ محنت کو ملے گا دستِ محنت سے خراج
 زندگی بدلی ہے بدلا ہے زمانے کا مزان
 پھوز دیں گے ہم یہ آنکھیں ہم کو مت آنکھیں دکھاؤ
 ایشیا سے بھاگ جاؤ

ہم نے دیکھے ہیں بہت ظلم و ستم قبر و عتاب
 نوچ لیں گے ہم تمھاری سلطنت کا آفتاب
 ہم بھی دیں گے تم کو اب جوتے سے جوتے کا جواب
 ہاں بڑے آئے کہیں کے لاٹ صاحب جاؤ جاؤ
 ایشیا سے بھاگ جاؤ

لد گئے وہ دن کہ جب آقا تھے تم اور ہم غلام
 ہم وہ بے حس تھے کہ تم کو جھک کے کرتے تھے سلام
 آج ہم ہیں بد دماغ و بد زبان و بد لگام!
 سیر کا بدلہ ہے سیر اور پاؤ کا بدلہ ہے پاؤ
 ایشیا سے بھاگ جاؤ

ہاں کبھی تھا ایشیا مجبور و محکوم و فقیر
 دوسروں کا ذکر کیا خود اپنی نظروں میں حقیر
 قبر کا مردہ یہ جسم نو جوان و روح پیر
 زخم خوردہ پیٹھ پر تاریک صدیوں کا دباؤ
 ایشیا سے بھاگ جاؤ

ایشیا روح لطافت پیکر حسن و جمال
 دھان کے کھیتوں کا سبز ڈھاک کے پھولوں کے گال
 بجلیوں کے نرم و نازک ہاتھ طوفانوں کے بال
 آہن و فولاد ہے مضبوط شانوں کا گنھاؤ
 ایشیا سے بھاگ جاؤ

ماؤ، استالن کا بھائی، لینن اعظم کا لال
 مٹھیوں میں تتلیوں کی طرح، روح ماہ و سال
 نرم آنکھوں میں محبت گرم ماتھے پر جلال
 اس کے کھین بار ہاتھ اور ایشیا والوں کی ناؤ
 ایشیا سے بھاگ جاؤ

ڈالروں کے زور پر اس درجہ اترا تے ہو کیا
 ہم کو اپنی توپ اپنے ٹینک دکھلاتے ہو کیا
 ہائیڈروجن اور ایٹم بم سے دھمکاتے ہو کیا
 ہم نہیں ڈرنے کے، جا کر اپنے بھوتوں کو ڈراؤ
 ایشیا سے بھاگ جاؤ

یہ کہنے، ملک کے غدار، ڈالر کے غلام
 جن کے منہ میں تم نے ڈالی ہے حکومت کی لگام
 یہ بغل بچے، یہ پٹھو بھی نہیں آئیں گے کام
 یہ تو ہیں بھاڑے کے ٹٹوان پہ مت بازی لگاؤ
 ایشیا سے بھاگ جاؤ

تئوریاں بدلے ہوئے ہیں اب زمین و آسمان
 بجلیاں لے کر اٹھا ہے دل کی آہوں کا دھواں
 آنکھ سے آنسو کے بدلے دھل رہی ہیں گولیاں
 بن گئے ہیں راتفل کی آنکھ اب سینے کے گھاؤ
 ایشیا سے بھاگ جاؤ

دیکھتی ہیں مڑ کے صدیاں چین کی فوجوں کی شان
 ہے ہمالہ کی بلندی پر بغاوت کی اٹھان
 نڈیوں کے دل پہ چھا پے مار قدموں کے نشان
 دشمنوں کو گھیرے لیتا ہے پہاڑوں کا گھاؤ
 ایشیا سے بھاگ جاؤ

دیت نامی فوج چلتی ہے کہ چلتے ہیں پہاڑ
 موج سرکش ہے کہ اڑتے ہیں اچھلتے ہیں پہاڑ
 انقلابی جوش ہے جیسے پھٹتے ہیں پہاڑ
 چوٹیوں پر آج روشن ہیں بغاوت کے الاؤ
 ایشیا سے بھاگ جاؤ

جنگلوں سے حملہ آور ہیں ملایا کے دلیر
 گونجتے ہیں بادلوں کی طرح سے برما کے شیر
 ہندو پاکستان جاگ اٹھے، نہیں ہے کوئی دیر
 آمد آمد عدل کی، ظلم و ستم کا چل چلاؤ
 ایشیا سے بھاگ جاؤ

خاک ایراں میں سلگتی ہیں دہلی چنگاریاں
 مصر و ترکی کی زمیں پر خون کی گلکاریاں
 شام اور لبنان میں اٹھنے کی ہیں تیاریاں
 وقت کی تلوار کا خم ہے کہ ابرو کا کھنچاؤ
 ایشیا سے بھاگ جاؤ

نہن رہے ہیں جال مل کر آج تسبیح و جینو
 بچ کے جا سکتا نہیں دیسی بدیسی کوئی دیو
 پڑ رہی ہے ہر قدم پر اک تلگانے کی نیو
 دھان اور گیہوں کے پودوں میں کمانوں کا جھکاؤ
 ایشیائے بھاگ جاؤ

آندھیوں کا زور ہے نعروں کی بوچھاڑوں کے ساتھ
 نفرتوں کی بارشیں آنکھوں کے انگاروں کے ساتھ
 موت اڑتی ہے تمہارے شاہی بمباروں کے ساتھ
 اب نہیں ممکن تمہارے تاج و پرچم کا بچاؤ
 ایشیائے بھاگ جاؤ

آگ کا دریا ہے اب پورب کے سرچشموں کا تیل
 بن گئی ہے آہنی زنجیر انگوروں کی نیل
 شہ پہ شہ پڑتی ہے اب باقی کہاں ہے کوئی کھیل
 پٹ چکے ہیں سارے مہرے شاہ و فرزین بھی اٹھاؤ
 ایشیائے بھاگ جاؤ

تم کو کچے مال کے بدلے ملے گی ایک لات
 بن گئے ہتھیار، ہتھانوں کے مزدوروں کے بات
 خاک کے سینے سے لاوا بن کے اب نکلے گی دھات
 جان کی بازی ہے اب اس خاک کے ذروں کا بھاؤ
 ایشیائے بھاگ جاؤ

چل رہے ہیں وقت اور تاریخ کے کھیتوں میں مل
 پھل رہے ہیں بیڑ کی شاخوں میں تلواروں کے پھل
 سانس لیتے ہی بچ اٹھتے ہیں ہواؤں میں دہل
 الاماں بگڑی ہوئی سرکش فضاؤں کا تناؤ
 ایشیائے بھاگ جاؤ

ایشیا ہنسیوں کا جنگل ہے تمہارے واسطے
 ساحلوں کی ریت بھول ہے تمہارے واسطے
 خون سے لبریز چھاگل ہے تمہارے واسطے
 بوند پانی بھی نہ دیں گے تم کو پانی کے پیاؤ
 ایشیا سے بھاگ جاؤ

تم جہاں بھی پاؤں رکھو گے زمیں ہٹ جائے گی
 ظلم کی گردان ہوا کی دھار سے کٹ جائے گی
 یہ نفاذ اک بم کے گولے کی طرح پھٹ جائے گی
 سلطنت کی فکر چھوڑو خیر جانوں کی مناؤ
 ایشیا سے بھاگ جاؤ

ایشیا کی خاک پر دم توڑتا ہے سامراج
 ایشیا کی ٹھوکروں میں ہے ملوکیت کا تاج
 ایشیا میں ایشیا کا جشن آزادی ہے آج
 ایشیا کے خون میں ہے صبح مشرق کا رچاؤ
 ایشیا سے بھاگ جاؤ

ایشیا کی جنگ آزادی ہے اک دنیا کی جنگ
 ہے ہمارے زخمِ دل میں سارے عالم کی امنگ
 ہاں بدل جانے کو ہے اب مشرق و مغرب کا رنگ
 آج سب مل کر پکارو، مل کے سب نعرے لگاؤ

’ایشیا سے بھاگ جاؤ‘

’ایشیا سے بھاگ جاؤ‘

یہ ایشیا کی زمین، تمدن کی کوکھ، تہذیب کا وطن ہے
 یہیں پہ سورج نے آنکھ کھولی
 یہیں پہ انسانیت کی پہلی سحر نے رُخ سے نقاب الٹی
 یہیں سے اگلے گیوں کی شمعوں نے علم و حکمت کا نور پایا
 اسی بلندی سے دید نے زمزمے سنائے
 یہیں سے گوتم نے آدمی کی سامانتا کا سبق پڑھایا
 یہیں سے مڑوک نے عدل و انصاف اور محبت کے راگ چھیڑے
 ہماری تاریخ کی ہوائیں مسیح کے بول سن چکی ہیں
 ہمارا سورج محمد مصطفیٰ کے سر پر چمک چکا ہے
 ارا ب ہمارے قدیم آکاش کے ستارے
 قدیم آنکھوں سے ماؤ کی سرخ فوج کی شان دیکھتے ہیں

یہ خاک وہ خاک ہے کہ جس نے
 نہرے گہوں کے موتیوں کو جنم دیا ہے
 یہ خاک اتنی قدیم جتنی قدیم انسان کی داستانیں
 عظیم اتنی عظیم جتنی ہماریہ کی بلندیاں ہیں
 حسین اتنی حسین جتنی حسین اہنٹا کی اپسرائیں
 یہ اپنی فیاضیوں میں دریائے نیل و گنگا کے کم نہیں ہے۔
 یہ گود بچوں سے اور پھولوں سے اور پھلوں سے بھری ہوئی ہے

حقیر کپنگ مرچکا ہے
 ذلیل چرچل کو شاید اب تک خبر نہیں ہے

ہمارے کھنڈروں کے نام بھی ان کی ساری بکواس سے گراں ہیں
 ہمارا ورثہ منجھڑاڑو سے لے کے دیوار چین تک ہے
 ہماری تاریخ تاج اور سیکری سے ابرام مصر تک ہے
 ہمیں روایات کے خزانوں سے بائبل و نیاوٹے ہیں
 فصاحتوں نے ہمارے بچپن کے ہونٹ چومے
 بلاغتوں نے بڑی حسین لوریاں سنائیں
 زبان کھولی تو وید، انجیل اور قرآن بن کے بولے
 ہماری تخیل آسانوں کی ان بلند یوں کو چھو چکی ہے
 جہاں سے فروسی اور سعدی
 نظامی، خیام اور حافظ کے چاند سورج چمک رہے ہیں
 بلندیاں جن پہ المیک اور پاک تلسی
 کبیر اور سور حکمران ہیں
 انہیں فضاؤں کی بجلیاں ہیں
 جو سزا اقبال اور ٹیگور کے ترانوں میں گونجتی ہیں
 جو آج ناظم کی شاعری میں تڑپ اٹھی ہیں
 جو لوہ سوں کی کہانی بن کر چمک رہی ہیں

2

گزر چکے ہیں ہمارے سر سے
 ہزاروں سالوں کے تند طوفاں
 مصیبتوں کی ہوائیں، ظلم و ستم کی آندھی
 نہ جانے کتنے سکندروں کی وبائیں آئیں
 ہزاروں چنگیز اور تیمور، ان گنت مانچولیرے

کہیں سے راون کہیں سے ضحاک اپنے بالوں میں سانپ گوندھے
 کہیں سے ہسٹنگز اور کلا یو
 کہیں سے ڈاکر کہیں سے دیول
 کوئی سیہ فام کوئی بھورا کوئی سفید اور کوئی پیلا
 غرض ہر اک رنگ روپ کے بھیڑیوں کے حملے
 مگر یہ انمول خاک پھر بھی حسین پھر بھی جوان رہی ہے
 ہمارے رستم ہمارے ارجن مرے نہیں ہیں
 وہ جنگلوں اور پہاڑیوں میں زمین پر کاشت کر رہے ہیں
 ہمارے فرہاد اب بھی تیشے چلا رہے ہیں
 جوان لیلیٰ حسین شیریں، کنواری ہیر اب بھی گارہی ہے
 شکستہ لائیں گھنیرے پیڑوں کے سبز سایوں میں ناچتی ہیں
 ہم ایشیا کے عوام سورج کی طرح ڈوبے ہیں اور ابھرے
 دکھوں کی انگی میں تپ کے نکھرے
 ہماری آنکھوں کے آگے کتنی سیاہ صدیوں کی سانس ٹوٹی
 نہ جانے کتنے بلند پرچم
 ہماری نظروں کے سامنے سرنگوں ہوئے ہیں
 اٹلتے دیکھے ہیں تخت ہم نے
 اجڑتے دیکھے ہیں تاج ہم نے
 ہمارے سینے سے جانے کتنی رتھوں کے پیسے گزر چکے ہیں
 مگر ہم اس بھوک، قتل، افلاس کے اندھیرے
 حوادثِ روزگار کے تند و تیز شعلوں میں ان گنت جنم لے چکے ہیں
 ہم اپنی دھرتی کی کوکھ میں بیج کی طرح دفن ہو گئے ہیں
 مگر نئی صبح کی ہوا میں
 بہار کی کونپلوں میں تبدیل ہو کے باہر نکل پڑے ہیں

ہماری نظروں میں اگلے وقتوں کے سورماؤں کے کارنامے
 گئے ٹکوں کے افق دھندلکوں میں چھپ چکے ہیں
 مگر پرانے دلاوروں کے پرانے چہرے
 پرانے گردوغبار میں جگمگا رہے ہیں

یہ بے دلی کیوں
 جھجک یہ کیسی

چل اے بغاوت کے عزم اے انقلاب کے آہنی ارادے
 اٹھادے اے ذوق و شوق تاریخ کے رخ آتشیں سے بڑھ کر
 ہمارے بیتے ہوئے مہدوسال کی نقابیں
 پڑی وہ ڈکوں پہ چوٹ گونجیں وہ ڈھول کی دل نشیں صدائیں
 ہزاروں تلواریں بجلیوں کی طرح سے چمکیں
 ہوا میں جھکائیں ناچ اٹھیں

زمین کی کانپتی ہتھیلی پہ زلزلے، زلزلوں کی لہریں
 وہ دیکھو الموط کی پہاڑی ابھر رہی ہے

بلند چوٹی پہ ایک دھوبی
 وہ المقع کہ جس کی نظروں کی آگ کے سرخ سرخ بادل
 فضا میں پھیلے، زمیں پہ برے
 اور اپنی بیتاب بجلیوں سے

دیار بغداد میں خلافت کی شان و شوکت کو پھونک ڈالا
 عرب کے جاگیردار و بھاگو

تمھاری فوجوں کی چھاؤنی پر کسان لشکر جھپٹ پڑے ہیں
 زمین اور آسمان شعلوں کے پیرہن میں لرز رہے ہیں

دیارِ خیبر

جہاں پٹھانوں کے غول حلقوں میں تاپتے ہیں
 اور ان کے ڈھولک کی تھاپ اور نگ زیب کا دل ہلا رہی ہے
 یہ آفریدی ہیں اور وہ مہمند اور وہ شنواریوں کا جرگہ
 دُفوں پہ 'غیرت' کا لفظ دو شیرہ انگلیوں سے لکھا ہوا ہے
 رباب کے تار جنگ اور جنگ 'کہہ رہے ہیں
 غرور کر اے زمینِ خیبر
 کہ تجھ کو خوشحال خاں تنک سا عظیم شاعر عطا ہوا ہے
 وہ جس کا ہر لفظ اک رجز ہے
 زمانہ اور نگ زیب کو بھولتا چلا جا رہا ہے لیکن
 وہ باغی شاعر، وہ رہنما، سورما سپاہی
 ہر اک صدی میں اٹھے گا خیبر کی وادیوں سے
 نئی جوانی، نئی بہاروں، نئی تمنا کا ساز لے کر
 جہاں کہیں دل کا درد ہوگا
 جہاں کہیں غم کا سوز ہوگا
 جہاں کہیں حق کی بات ہوگی
 کسی بھی گوشے میں ایشیا کے
 جہاں کہیں آدمی بغاوت کا نام لے گا
 وہیں سے خوشحال خاں کی لکار گونج اٹھے گی اس کے نغمے برس پڑیں گے

'سہاوری' لے کے پہاڑ انگریزوں کے لے کے جا گئے
 زمیں کا نقارہ تیز گھوڑوں کی تیز ٹاپوں سے بج رہا ہے
 پہاڑ کی چوٹیوں نے توپوں کا روپ دھارا

چٹانیں قلعوں کی شکل لے کر ابھر رہی ہیں
 کسان سیلاب بن کے ابلے
 پلٹ گئیں وقت کی ہوائیں
 الٹ گئیں سلطنت کی چالیں
 مغل شہنشاہیت کو مہراشر کے تیروں نے نوج ڈالا
 کسان، سیلاب، زلزلے، شور، گیت، نعرے
 بغاوتیں، انقلاب، شورش
 غدر کا ہیجان، ٹامپنگ کا ابال اور باکسر کا طوفان
 یہ سب دلیروں کے مورچے ہیں
 جو تیس صدیوں سے لڑ رہے ہیں
 یہ سر ہمیشہ کٹا کئے ہیں
 یہ دل ہمیشہ لٹا کئے ہیں
 یہ بات گتے رہے ہیں لوہے کی جھکڑی میں
 یہ پیر سڑتے رہے ہیں زنداں کی بیڑیوں میں
 زمیں امر ہے
 ہوا امر ہے
 امر ہے پانی
 امر عوامی دلوں کی دھڑکن
 جو آسمان کی کھلی فضاؤں کو ڈھونڈھتی ہے
 عوام مرتے نہیں ہیں سو جاتے ہیں زمیں کی سنہری مٹی میں منہ چھپا کر
 وہ اپنی ماں کی سنہری چھاتی سے سر لگا کر بہار کے خواب دیکھتے ہیں
 زمین سے کونپلیں نکلتی ہیں اور آکاش سے ستارے
 ہوا سے بادل، گرج سے بجلی
 عوام کی راکھ سے بغاوت کی آگ، شعلوں سے زندگانی

سلام لو ایشیا کے نو خیز سرفروشنوں کی بختوں کا
 پرانے وقتوں کے سورماؤ
 گئے ٹیگوں کے افق سے کیوں دیکھتے ہو ہم کو
 ہم آخری جنگ لڑ رہے ہیں
 تمہارے ہاتھوں میں ابتدا تھی
 ہمارے ہاتھوں میں انتہا ہے
 تمہارے ہاتھوں میں صرف تلوار تھی ہمارے
 جو ان ہاتھوں میں دقت و تاریخ کی عنایاں ہے
 ہمیں تم اپنے جوان شانوں کا زور اپنی
 عقابانی آنکھوں کا نور دے دو
 بلند ماتھے کی روشنی لے کے آؤ۔۔۔ آؤ
 کہ ہم کو معلوم ہے تم اب تک مرے نہیں ہو
 کہ تم کبھی بھی نہیں مرو گے
 کسان فوجوں کو اپنی الموط کی پہاڑی سے لے کے اترو
 حجاز اور نجد کے خوش آواز ساربانوں کو ساتھ لاؤ
 ہمارے لشکر میں آؤ تم اپنے زرد دریا کے ساحلوں سے
 ہمارے لشکر میں آؤ کوہاٹ اور خیبر کی وادیوں سے
 ہمارے لشکر میں آؤ میرٹھ کے اور دہلی کے مورچوں سے
 سہارنپور کی چٹانیں اک بار پھر ترانوں سے گونج اٹھیں
 اور ایشیا کے پٹھانوں کے کسمپاسے جاگیں
 کہ سامراجی دلوں کے پتھر
 لرز اٹھیں ان کی راجدھانی کے سارے ایوان کاہنوں کے

یہ ایشیا کی زمیں، تمدن کی کوکھ، تہذیب کا وطن ہے
 بڑھائیں اپنی دکان پچھتم کے سارے سوداگروں سے کہہ دو
 ہمارے بازار میں لہو کا ذلیل بیوپار بند کر دیں
 کہ ان کی توپوں کے اور مشینوں کے واسطے اب
 یہاں سے ایندھن نہیں ملے گا

وہ دن گئے جب

یہاں تم آئے تھے اپنی ہستی کی کوڑھ لے کر
 زبان پر بائبل تھی، ہاتھوں میں رافیل تھی
 لبوں پہ میٹھی ہنسی، نگاہوں میں زہر، دل میں ہوس پرستی
 شکاری کتوں کی طرح تم ایشیا کی ہستی میں پھر رہے تھے
 تمہاری رفتار جس طرح توپ کے دھماکے
 تمہاری ہر سانس جیسے بارود اڑ رہی ہو
 تمہاری پرچھائیاں دباؤں کی پیر بن گئیں
 ہماری آنکھوں نے پھر یہ دیکھا
 کہ بادلوں سے ہمارے آنسو برس رہے تھے
 زمین سے قحط، کھیت سے بھوک اُگ رہی تھی
 زبان گوگنی تھی، انگلیاں سن گئیں، سانس بے کیف و بے ترنم
 ستارے تار بچکیوں میں الجھ گئے تھے

وہ دن گئے جب

تمہارے ہاتھوں میں رافیل تھی، ہمارے ہاتھوں میں کچھ نہیں تھا
 ہتھیلیوں پر فقط لکیروں کو گن رہے تھے
 شمار کرتے تھے آنسوؤں کا

مگر غلامی نے یکڑوں سال کی غلامی نے ہم کو لڑنا سکھا دیا ہے
 ہمارے اشکوں کی بوندیں اب گولیوں میں تبدیل ہو گئی ہیں
 تم اس پہ پھولے ہوئے ہو شاید
 کہ چیا نگ کی طرح چند بھاڑے کے بوڑھے نچو
 تمھاری رتھ میں بٹتے ہوئے ہیں
 کچھ اندھی آنکھوں کے نیل اب بھی تمھارا کولھو چلا رہے ہیں
 تمھاری جنگی مشین میں کچھ
 گھسے ہوئے ٹوٹے پھولے پُزے لگے ہوئے ہیں
 مگر یہ غدا رکب تلک کام آسکیں گے
 کہ ایشیا اپنی نیند کی کیفیت سے بیدار ہو چکا ہے
 ہماری آنکھوں میں آگ — تیور میں بجلیاں ہیں
 ہمارے سینے میں درد، ہونٹوں پہ گیت، ہاتھوں میں رائفل ہے

5

یہ کیا کہا؟ تم نے ہم کو تہذیب اور تمدن کا نور بخشا؟
 بجا ہے، سچ ہے
 جو تم نہ ہوتے تو ہم نہ ہوتے
 نہیں کوئی شک نہیں کہ تم نے زمین پر پٹریاں بچھائیں
 یہ دوسری بات ہے کہ ان پٹریوں کے نیچے
 ہماری لاشیں بچھی ہوئی تھیں
 ہمارے ساحل پہ تم دخانی جہاز لائے
 اور ان میں تو پیں کھڑی ہوئی تھیں
 ہمارے ساحل کے زخم اب بھی

لہو کے ہونٹوں سے درو اور میس کی زباں سے
تمہاری 'تہذیب' کے قصیدے سنار ہے ہیں
جہاز جو تین سو برس سے

سمندروں پہ رواں دواں ہیں
ہمارے آنسو کروڑوں آنکھوں سے ان جہازوں کو دیکھتے ہیں
جوج کے نور سے نکل کر اندھیری راتوں میں چھپ رہے ہیں
وہ جن میں ہندستان، برما،

ملایا، ایران، شام، لبنان، مصر، ترکی، یمن کی محنت لدی ہوئی ہے
الاکچی، زعفران، انگور، کوند، ٹین، تیل، چاول،

ربر، ستارے، کپاس اور چاندنی بھری ہے
ہمیں مشینوں سے اور ملوں سے گلہ نہیں ہے
کہ جن پہ انسانیت کی عظمت کی سرخ مہریں لگی ہوئی ہیں
گلہ ہے تم سے

جنھوں نے انسان کی بنائی ہوئی مشینوں کو ڈانٹوں میں بدل دیا ہے
گلہ ہے اُن سے

جنھوں نے پہیوں میں ہڈیاں ایشیا کی پیسیں
اور ان سے چاندی کے ڈھیر، سونے کے اونچے اونچے پہاڑ اٹھائے
گلا ہے ان بوڑھے سود خوروں سے، نفع بازوں کی سازشوں سے
جو سوت کے تار اور ریشم کی ڈھیریوں کو
بنگل کے اپنے بدن کی چربی بڑھا رہے ہیں
مگر یہاں ہم

کسان، مزدور، موچی، دھوبی
کہہ رہے ہیں، لوہار، اپنے جسموں پہ کھال پہنے ہوئے کھڑے ہیں
ہماری آنکھیں جلے ہوئے خواب — اور چہرے
اڑے ہوئے رنگ ہیں — دلوں میں

سنہری آشاؤں کی چٹائیں بھڑک رہی ہیں

تمھاری 'تہذیب' سڑ چکی ہے
 تمھارا جھوٹا 'تمدن' اپنے فریب میں دفن ہو گیا ہے
 تمھاری 'تہذیب' قتل و غارت کا ناچ کوزوں کی راگنی ہے
 تمھاری 'تہذیب' بھوکے بچوں کی موت ماؤں کی خودکشی ہے
 تمھاری 'تہذیب' دست کاروں کے خون آلود ہاتھ ٹوٹے ہوئے انگوٹھے
 تمھاری 'تہذیب' دھوپ میں سوکھتی ہوئی پٹیوں کے پر بت
 تمھاری 'تہذیب' قصر پیننگ کی جلی راکھ کا ہے غازہ
 تمھاری 'تہذیب' زہر وانیون کی تجارت
 تمھاری 'تہذیب' ایشیا کی زمیں پہ ننگی پڑی ہوئی ہے

6

یہ ایشیا کی زمیں، تمدن کی کوکھ، تہذیب کا وطن ہے
 جہیں پہ تاروں کا ناچ، بیروں میں جھاگ کی جھانجھنوں کا نغمہ
 زمین — صدیوں پرانا چہرہ
 کسان — صدیوں پرانے ہاتھوں میں اپنے لکڑی کے ہل سنبالے
 غریب مزدور، جلتی آنکھیں
 اچاٹ نیندوں کی تلخ راتیں
 تھکے ہوئے ہاتھ، بھاپ کا زور، گرم فولاد کی گرانی
 جہاز، ملاح، گیت، طوفاں
 کپہار، لوہار، چاک، برتن
 گوانٹیں دودھ میں نہائی

الاؤ کے گرد بوڑھے افسانہ گو، کہانی
 جوان باؤں کی گود میں گھسے گھسے بچوں کے بھولے چہرے
 لپکتے میدان، گائیں، بھینسیں
 فضاؤں میں بانسری کا لہرا
 ہری بھری کھیتیوں میں شیشے کی چوڑیاں ٹھٹھکی رہی ہیں
 اداس صحرا پیہروں کی طرح سے خاموش اور گنیمبر
 کھجور کے پیڑ بال کھولے
 دھن کی آواز دھولکوں کی گھمک
 سمندر کے قہقہے ناریل کے پیڑوں کی سرد آہیں۔
 ستار کے تار سے برستے ہوئے ستارے
 اتار کے پھول، آم کا بور، سیب و بادام کے شگوفے
 کوٹھار، کھلیان، کھاد کے ڈھیر، کنواری پگڈنڈیوں کی گردش
 بلند بانسوں کے جھنڈ ہنستی دھنک کے نیچے
 گھنیرے جنگل
 پٹھار، میدان، ریگزاروں کے گرم سینے
 گہکھائیں بخت کی طرح ٹھنڈی
 سمندروں میں کنول کے پھولوں کی طرح رکھے ہوئے جزیرے
 چمکتے مونگوں کی مسکراہٹ
 وہ پیپوں کی ہنسی، وہ سنہنٹال لڑکیوں کے چمکتے دانتوں کی طرح موتی
 وہ مچھلیاں گوشت سے بھری کشتیاں جو پگھلی
 سفید چاندی میں تیرتی ہیں
 وہ لمبی لمبی حسین ندیاں
 جوانی موجوں سے ساحلوں کے لرزتے ہونٹوں کو چومتی ہیں
 دلہن بنی وادیوں کی نازک کمر میں جھرنوں کے نرم حلقے
 پہاڑیوں کی ہتھیلیوں پر دھرے ہوئے نینکوں کنورے

ستارے منہ دیکھتے ہیں جھیلوں کے آئینے میں
 ہمالیہ کے گلے میں گنگا کی اور جمنہ کی شوخ بانہیں
 پہاڑ کی آندھیوں کے ماتھوں پہ برف کے نیلگوں دوپٹے
 بلند یوں پر خفیف سا ارتعاش ہلکی سی راگنی کا
 ہوا کے پیروں میں جیسے گھنگھر و بندھے ہوئے ہوں
 کہیں فضاؤں میں برف کے پھول اڑ رہے ہیں
 کہیں جوالا کھسی کے شعلے
 جو اپنی زلفوں کو پچھلے لاوے کی کنگھیوں سے سنوارتے ہیں
 ہواؤں کی انگلیاں چٹاروں کے سرخ بالوں میں رنگتی ہیں

یہ ایشیا ہے، جوان، شاداب اور دھنواں ایشیا ہے
 کہ جس کے زردھن غریب بچوں کو بھوک کے ناگ ڈس رہے ہیں
 وہ ہونٹ جوں کے دودھ کے بعد پھر نہ واقف ہوئے کبھی دودھ کے مزے سے
 زبانیں ایسی جنھوں نے چکھائیں ہے گیسوں کی روٹیوں کو
 وہ پیٹھ جس نے سفید کپڑا چھو نہیں ہے
 وہ انگلیاں جو کتاب سے مس نہیں ہوئیں ہیں
 وہ حیر جو بوٹ اور پلیپر کی شکل پہچاننے نہیں ہیں
 وہ سر جو تکیوں کی نرم لذت سے بے خبر ہیں
 وہ پیٹ جو بھوک ہی کو بھو جن سمجھ رہے ہیں
 یہ نادروں کا رانساں

تھیں فقط ایشیا کی جنت ہی میں ملیں گے
 جو تین سو سال کے 'تمدن' کے بعد بھی 'جانور' رہے ہیں

کہاں ہو 'تہذیب اور تمدن' کی روشنی لے کے آنے والو
 تمھاری 'تہذیب' کی نمائش ہے ایشیا میں

نظر انما قریب آء
 یہ کوڑھیوں نے نجوم دیکھو
 یہ دیکھو بیٹے کی تے، یہ طاعون کی ہے گھٹی
 یہ جسم کے آبلے ہیں اس آتشک کی گرمی
 جو ایشیا کو ملی ہے انعام سامراجی پابہوں سے
 یہ پیٹھ دیکھو، یہ پیٹھ کتنی حسیں ہے جس پر
 تمہارے کوڑوں کی بدایاں ہیں
 یہ پھانسیوں پر لٹکی لاشیں
 یہ جیل خانوں میں بند انسان
 یہ دل جو ہیں گولیوں سے چھلنی
 یہ آنکھ کی پتلیاں جو خون اور پیپ کی طرح بہہ رہی ہیں
 یہ چہرے کھنڈروں کی طرح ٹوٹے
 یہ ہاتھ لکڑی کی طرح سوکھے
 یہ پینٹ منکوں کی طرح پھولے
 یہ مفلسی اور یہ جہالت کی رات، بے چاند بے ستارہ
 یہ بھوک، یہ بے بسی، یہ نفرت
 یہ ہنستے پھوڑے
 لٹکتے گھینگے
 دکتے ناسور، چیتنے زخم، ریگتے جسم، جیسے کیزے
 تمہاری سرمایہ دار 'تہذیب' کی کہانی سنار ہے ہیں
 بلاؤ اپنے مصوٰروں اور بت گروں کو
 کہیں زمانے میں اس قدر دزدانک چہرے نہیں ملیں گے
 تمہاری شاہانہ یادگاروں سے ایشیا کا
 ہر ایک کو نا بھرا ہوا ہے
 کہیں پہ بحراب فتح باندھی

کہیں رعونت کی لاٹ اٹھائی
 کہیں پہ کانٹے کے گھوڑے ڈھالے
 کہیں پہ پتھر کے بت بنائے
 مگر یہ 'تمذیب اور تمدن' کی یادگاریں کہیں نہیں ہیں
 بلاؤ اپنے مصوّروں اور بت گروں کو
 کہو کہ ان دردناک چہروں سے ایک اک میوزیم بنادیں
 تمہارے کارِ عظیم کو جاوداں بنادیں

7

زمین سونا اگل رہی ہے
 فضائیں چاندی اٹا رہی ہیں
 ہواؤں میں بُن برس رہا ہے
 سمندر اپنی تڑپتی موجوں کے جال میں مچھلیاں لیے ہیں
 زمیں کے سینے پہ پیڑ، پھل، پھول، نانج، گہرائیوں میں کانیں
 سیاہ ہیرے، سیہ خزانے
 ہر ایک پتھر کی رگ میں دوڑا ہوا ہے لوہا
 ہر اک پرت کو نکلے سے پر ہے
 وہ تیل کے سر پہ مہر چٹھے
 کہ جن میں پچھلے ہوئے ستارے بھرے ہوئے ہیں
 سنہرے شہوت کے درختوں پہ نرم ریشم کے ننھے کیڑے
 چمکتے پیرازہنوں دکتے ہوئے دوہتوں کے خواب پر خواب بن رہے ہیں
 سین پر زور آبشاروں میں بجلیوں کی ترپ نہاں ہے
 ہر اک ندی اپنے جل کی بھتی سے بہہ رہی ہے

ماں نے ہندوؤں کی روشیں، چرخوں کے نغے
 دیکھتے انجی۔۔۔ میں جو آندھیوں کے آگے تے ہوئے ہیں
 کہ: ہمارے بلن کی دولت
 ندی نے پانی کی طرح بہتی
 اسی جیسا تک یہ مندر میں جا رہی ہے
 اداس ہے ایشیا کا چہرہ
 بدن ہے ہنگام

سڑک پہ بچوں کی ننھی ننھی
 ہتھیلیاں ٹھیکروں کی صورت پڑی ہوئی ہیں
 ہزاروں بیکار ہاتھ شانوں پہ جھولتے ہیں

یہ کیسی سفاک انگلیاں ہیں
 جھٹوں نے لوہے کے تیز تاخون¹ پہلوؤں میں گڑا دیئے ہیں
 یہ انگلیاں جو ہمارے جسموں سے کھال بھی کھینچ لے رہی ہیں
 یہ لمبی لمبی سفید ٹلیاں
 سفید جو نکلیں

ہزاروں میلوں کے فاصلے سے
 ہمارے جسموں سے خون دھرتی سے تیل کو چوس لے رہی ہیں
 زمین پر پاپوں کی صورت بچھی ہوئی ہیں
 مندروں میں پڑی ہوئی ہیں
 ہوا میں تانے کے تار بن کر کھینچی ہوئی ہیں
 ہماری گردن پہ نیلے نیلے نشان دیکھو
 یہ بوڑھے بتلوں کی انگلیاں ہیں
 جو سامراجی انگوٹھیوں سے جڑی ہوئی ہیں

کہاں ہوا ایشیا کے بیٹو
 تمھاری ماں اور اس کی عصمت
 فرانس، امریکہ اور برطانیہ کے چٹکوں میں بک رہی ہے
 تمھارے اپنے ہی گھر کے غذا آج دلال بن گئے ہیں
 وہ کون ہیں؟ ان کے نام کیا ہیں؟
 وہ ملک و قوم و وطن کے غذا ر عہد حاضر کے میر جعفر
 میں ان کینوں کے گندے ناموں کی گندی فہرست کیوں گناؤں
 کہ تم خوب جانتے ہو
 میں ان کے ناپاک نام سے اپنے فن کی پاکیزگی کو ناپاک کیوں کروں گا
 انھوں نے بھی ایشیا کی ٹھنڈی ہواؤں میں پرورش ہے پائی
 ہمارے چشموں کا میٹھا پانی پیانے چوھوں کی آگ تاپی
 مگر یہ کتنے
 خود اپنے گھر کے نمک سے، روٹی سے اور پانی سے منحرف ہیں
 یہ سانپ ہیں سانپ ان کے منہ میں
 ہماری گایوں کا دودھ بس بن کے رہ گیا ہے
 یہ بھیڑیے بستیوں میں پھرتے ہیں سوٹ اور وردیاں پہن کر
 ذلیل اور بے حیا کہ جے چند و میر جعفر کو شرم آئے
 حقیر اتنے کہ گندے گھوڑے بھی دیکھ کر ناک بھوں چڑھائیں
 یہ ایشیا کے پرانے ناپاک دشمنوں سے ملے ہوئے ہیں
 تمھیں خبر بھی ہے تم غلاموں کی طرح سے پیچے جاتے ہو

تمھاری قیمت ہے چند ڈالر
 تمھیں خبر بھی نہیں مگر تم
 ہزار ہتھیوں کی جنگی رتھ میں جتے ہوئے ہو
 تمھارا لوہا پکھل کے موت اور جنگ کا روپ ڈھالتا ہے
 روٹی کے گالوں سے کار تو سوں کے منہ بھرے ہیں
 تمھارے گھر بے چراغ، اندھی ہے لودیوں کی
 مگر تمھارے شریف نیتا

شریف آقا

تمھاری دھرتی کا تیل لوہے کے ہاتھیوں کو پلا رہے ہیں
 تمھارے منہ اور پیٹ گیسوں کی روٹیوں کو ترس رہے ہیں
 مگر تمھارے سنہرے گیسوں کا چاندی جیسا سفید آٹا
 سیاہ بارود بن گیا ہے

ہواؤں کے گیت، بم کے گولوں میں دب گئے ہیں
 سمندروں کی حسین نیلائیوں پہ جنگی جہاز اپنی
 سیاہ پرچھائیوں کی چادر بچھا رہے ہیں
 نظر اٹھاؤ

فضا میں شعلوں کا جال پھیلا ہوا ہے دیکھو
 زبان کھولو

اور اپنے نیتاؤں، دہلی آقاؤں سے یہ پوچھو
 اگر تم آزاد ہو تو پھر کیوں بندھے ہولندن کے اصطبل میں؟
 اگر تم آزاد ہو تو نیویارک اور پیرس کے گندے گھوروں پہ کیوں پڑے ہو؟
 ہماری دھرتی پہ آخر امریکی اور انگریزی لشکروں کے پڑاؤ کیوں ہیں؟
 یہ ایشیا کے عوام پر ظلم و جبر کیوں ہے؟
 یہ جنگ کس کے خلاف ہے؟ کون لڑ رہا ہے؟
 یہ سامراجی نگاہیں کس سمت اٹھ رہی ہیں

ادھر جدھر زندگی تھرکتی ہے نو بہاروں کے پیرہن میں
 جہاں غلامی کا غم نہیں اکھڑیوں میں اشکوں کا غم نہیں ہے
 جہاں یہ ظلم و ستم نہیں ہے
 جہاں لڑائی کی کوئی تیاریاں نہیں ہیں
 جہاں یہ بمباریاں نہیں ہیں
 فقط ستارے ہیں چاندنی ہے
 سرور ہے، رقص ہے، بہاریں ہیں، زندگی ہے
 وہ سوویت یونین حسین و جمیل رنگوں کی مسکراہٹ
 جو سارے مشرق کو اپنے رنگیں وحش کی آغوش میں لیے ہے
 طویل مضبوط، جیسے لینن کا ہاتھ جو ایشیا کے سر پر دھرا ہوا ہے

وہ سویت جس نے اپنے دامن سے ساری دنیا کے اشک پونچھے
 بلکتے ہو ننوں سسکتی آنکھوں کو مسکرانے کا گر سکھایا
 وہ سویت جس نے قتل و غارت گری کی رسم ٹھہن اٹھادی
 نظامِ ظلم و ستم مناکر نجات کا راستہ دکھایا
 بڑی محبت کے ساتھ جوڑا کروڑوں ٹوٹے ہوئے دلوں کو
 کروڑوں ٹوٹے ہوئے دلوں سے نئے جہاں کا محل اٹھایا
 وہ جس نے محکومیت کی صدیوں پرانی زنجیر توڑ ڈالی
 وہ جس نے اک جہشِ نظر میں بدل دی انسانیت کی کایا
 جواں ہتھوڑوں کی ضرب کاری نے سونے چاندی کے تاج کچلے
 جھکا دیا بادشاہ زادوں کا سر، غلاموں کا سر اٹھایا
 وہ جس نے محنت کے ہاتھ کو اور روٹیوں کو وقار بخشا
 وہ جس نے سب طلب کی مظلومیت کو حسن طلب سکھایا
 وہ جس نے شانہ جھنجھوڑ کر ایشیا کو بیدار کر دیا ہے

پرانے مُردوں کے دل میں بھی زندگی کی تحریک کو جگایا
 وہ سویت جس نے مختلف نسل و رنگ قوموں کی یونین سے
 نئی تہمتا کا ساز چھیڑا، نئی محبت کا راگ گایا
 ذلیل جنگوں کے مورچے ڈھاکے ساری انسانیت کی خاطر
 وقار انسان کے روح و دل کا حسین تر مورچہ بنایا
 وہ جس نے قابو میں کر کے دریاؤں اور ہواؤں کی سرکشی کو
 اجازتے رنگوں کو رنگ بہار کا پیر ہن پہنایا
 اٹھا لیا مسکرا کے آکاش سے دھنک کا رباب رنگیں
 فلک سے نیچے زمیں پہ جنت کے خواب رنگیں کو کھینچ لایا
 جہیں پہ لینن کا سرخ سورج، لبوں پہ استانی تہنم
 وہ سویت جس کے سر کے اوپر ہے روح امن داماں کا سایا

یہ وہ ستارہ ہے جس کی میباک روشنی میں
 ہم ایشیا کے عوام اپنی حسین منزل کو دیکھتے ہیں
 جو آنکھ اس حسن کو حقارت سے دیکھنے کے لیے اٹھے گی
 ہم اس کی نظروں کو چھین لیں گے
 جو ہاتھ اس جھگڑاتے تارے کو توڑنے کے لیے بڑھے گا
 ہم اس کو شانوں سے کاٹ دیں گے
 جو پیر اس سرزمین کی جانب اڑا کر چلیں گے وہ پیر توڑ دیں گے
 اگر کسی کی زبان اس کے خلاف اک لفظ بھی کہے گی
 ہم ایسی کالی زبان مژدی سے کھینچ لیں گے
 یہ سویت یونین، محبت کی ناؤ، انسانیت کا لنگر
 ہماری قوت، ہماری حکمت، ہمارا ساتھی، ہمارا رہبر
 کہو کہ ہم نفع خوریوں کے لیے رگوں کا لہو نہ دیں گے

کہو کہ ہم زہر گھولنے کے لیے دلوں کے سبب نہ دیں گے
 کہو لڑائی کے راکھشس کو ہم اپنے بچوں کے سر نہ دیں گے
 کہو کہ شعلوں کی ٹانگوں کو ہم اپنے آباد گھر نہ دیں گے
 کہو کہ یہ ایشیا کی بستی ہے ٹینک کا راستہ نہیں ہے
 اڑیں گے جس میں تمہارے بمبار اب یہ ایسی ہوا نہیں ہے
 تمہیں گزرتا پڑے گا ہر گام پر تلنگانے کی زمیں سے
 تمہارے سر پر پہاڑ برسیں گے چھاپا ماروں کی آتیں سے
 تمہاری راہوں کو چین اور ویتنام کے شیر روک لیں گے
 تمہاری فوجوں کو کوریا کے عوام دوزخ میں جھونک دیں گے
 بھنور کے حلقے تمہارے پیروں میں اپنی زنجیر ڈال دیں گے
 ہواؤں کے ہاتھ تم کو نیلی فضا سے اوپر اچھال دیں گے
 ہم آج بیدار ہو چکے ہیں تمہیں ابھی تک خبر نہیں ہے؟
 یہ ہم کے گولے اگے ہوئے ہیں ہمارے کاندھوں پر سر نہیں ہے
 ڈرو ہماری دہکتی آنکھوں سے آگ کی جن میں ندیاں ہیں
 ڈرو ہمارے تڑپتے ہاتھوں سے جن کی جنبش میں بجلیاں ہیں
 ڈرو کہ ہم اک جہان نو کی زمیں پر تعمیر کر رہے ہیں
 ڈرو کہ ہم خون دل سے خوابوں میں رنگ تعبیر بھر رہے ہیں

9

اٹھو اٹھو ایشیا کے بیٹو
 پہاڑ کی چوٹیوں سے اترو
 زمیں کی گہرائیوں سے نکلو
 ملوں کے پہیوں کو چھوڑ کر اس مرکز پہ آؤ

جہاں میں اک سرخ رنگ جھنڈے کے ٹھنڈے سائے میں گارہا ہوں
 ملوں کے بھونپو کو چیتنے دو
 جہاز وانجن کی سیٹیاں بج رہی ہیں، بجتے بھی دو، کہ یہ وقت سرکشی ہے
 جھپٹ پڑوادیوں سے طوفاں کا زور بن کر
 اُبل پڑو ندیوں سے سیلاب کی طرح، کشتیوں سے اترو
 سنو، سنو، میرے بھائی، ہاں تم
 جو اپنے جالوں میں سیکڑوں سال سے سمندر کی مچھلیاں بھر کے لارہے ہو
 جو سیکڑوں سال سے اسی چاک پر اسی سرخ سرخ منی سے سرخ برتن بنا رہے ہو
 جو سیکڑوں سال سے انھیں برگدوں کے نیچے
 تھکے تھکے بازوؤں سے آرا چلا رہے ہو
 جو سیکڑوں سال سے اسی دکان میں بیٹھے
 سنہرے لوہے سے تل کی پھالیں بنا رہے ہو
 میں تم کو آواز دے رہا ہوں
 سفید دھوٹی سیاہ کوٹ اور سیاہ ٹوپی پہننے والے
 میرے برادر، خفاندہ ہونا
 میں پوچھتا ہوں تمہاری ٹوپی پہ میل کیوں ہے؟
 تمہارا کوٹ اور تمہاری دھوٹی پھٹی ہوئی ہے
 مجھی سے شرمارہے ہو بھائی؟
 جواب دو، میں تمہارا ہمدرد و آشنا ہوں
 تمہاری حالت چھپی نہیں ہے
 تمہاری بیٹی کے پاس اسکول کی کتابیں نہیں ہیں،
 بیوی کے ہاتھ میں چوڑیاں نہیں ہیں
 پرانے جوتے کی کیل تلوے میں چبھ رہی ہے

مرے جواں سال دوست حیراں کیوں ہو؟ میں اجنبی نہیں ہوں

تمہارا ساتھی ہوں اب سے سو سال پہلے تم سے
 میں چین و برام میں مل چکا ہوں
 تمہارے ہاتھوں میں ایک بندوق جسم پر ایک خاکِ وردی
 کہ جس پہ گردوغبار کی تہہ جمی ہوئی تھی
 تمہاری وردی بدل چکی ہے
 مگر مرے دوست اپنا دشمن ابھی وہی ہے
 وہی پرانا ذلیل، خزانہ، سامراجی
 تم ایشیا کے سپوت ہو، نو جوان سپاہی
 کسان ماؤں کے نو نہالو
 میں صرف یہ کہہ رہا ہوں اپنی زمین کا احترام کرنا
 وطن کی دولت، گھروں کے دروازوں کے محافظ
 تم اپنی بہنوں کے خواب، بچوں کی مسکراہٹ کے پاسباں ہو

ارے یہ تم ہو؟
 بتاؤ تم اب ملک کہاں تھے؟
 میں تم کو ایک ایک ساحل ایک ایک پورٹ پر ڈھونڈتا پھرا ہوں
 میں تم سے شگنائی میں ملا تھا
 خبر نہیں کتنے سال گزرے
 عدن کے ساحل پہ تم کھڑے تھے
 تمہارا بندر سے منہ کا کپتان تم کو اکثر
 خلاصی کہہ کر پکارتا تھا
 پھر ایک دن تم نہ جانے کس بات پر یکا یک گرج اٹھے تھے
 تم ایشیا کے طویل ساحل کی آبرو ہو
 سمندروں پر نگاہ رکھنا
 کہ دشمنوں کے جہاز اور ڈاکوؤں کے بیڑے

ہمارے سائل کے آس پاس اب بھی تیرتے ہیں

مری بہن! ہاں میں تم کو پہچانتا ہوں آؤ

قریب آؤ

تمہارے ماتھے کا خون اب تک تمہا نہیں ہے؟

تمہارے سینے پہ اب بھی سنگین کانٹاں ہے

مگر وہ سیسے کی گرم گولی

تمہارے پہلو کو چیر کر جو نکل گئی تھی

اسے میں ایک ایک آدمی کو دکھا رہا ہوں

یہ دیکھو میں اس کو ہاتھ میں لے کے پوچھتا ہوں

یہ گولی کس ملک میں بنی ہے؟

کہاں سے آئی ہے؟ کون لایا؟

یہی سہلا جو ہمیں اپنے دوست مغرب کے سامراجی حرام خوروں سے مل رہی ہے؟

اٹھو مری ماں تمہاری بیٹی مری نہیں ہے

وہ زخمی ہاتھوں میں سب سے آگے

جلوس میں ایک سرخ جھنڈا لیے کھڑی ہے

اٹھو مری ماں

تم اپنے سر کے سفید بالوں کی چاندنی سے

اندھیری راتوں میں نور بھر دو

وطن کے سچے کو جگمگا دو

تمہارے ہاتھوں کی جھڑیاں مسکرا رہی ہیں

مری شریف وغیرہ ماں اپنا مریکی ہاتھ اپنے بیٹوں کے سر پہ رکھ دو

ہم آخری جنگ لڑنے میدان میں جا رہے ہیں

تمہاری آنکھوں میں اشک ہاتھوں کی جھڑیاں مسکرا رہی ہیں

جہاں میں طوفان آرہا ہے

چہار اور شانسی کے غاروں سے اُن گنت آفتاب نکلے
 بغاوتیں وادیوں سے ٹھکس پہاڑ سے انقلاب نکلے
 سپاہی بن بن کے زرد دریا کے پہلوؤں سے حباب نکلے
 اور ان حبابوں کے تند طوفان میں چین کشتی چلا رہا ہے
 جہاں میں طوفان آرہا ہے

پرانی صدیوں کو نوک سنگین پر اٹھائے ہوئے ہیں دہقان
 دلوں سے بیتاب ہو کے باہر نکل پڑے ہیں دلوں کے ارمان
 وہ فوج چلتی ہے جیسے آندھی، وہ جھنڈے اڑتے ہیں جیسے طوفان
 زمین کو زلزلوں کا مضبوط ہاتھ جھولا جھلا رہا ہے
 جہاں میں طوفان آرہا ہے

سہرے محلوں پہ گرم لوہا برس رہا ہے شرار بن کر
 ہزار نقش قدم ابھرتے ہیں لاکھ نقش و نگار بن کر
 زمین اڑتی ہے آسمان کی بلندیوں پر غبار بن کر
 غبار جو اڑ کے آج نیو یارک اور لندن پہ چھا رہا ہے
 جہاں میں طوفان آرہا ہے

بہت بہت شکر یہ نرو مین و مارشل کی نوازشوں کا
 نکل گیا چین میں دیوالہ ہی ڈین، احسین کی سازشوں کا
 یہی ہے انجام چیانگ جیسے حرام خوروں کی کاوشوں کا
 کہ نامرادی کا ہاتھ ظلم و ہوس کی گردن دبا رہا ہے
 جہاں میں طوفان آرہا ہے

کہاں ہو امریکی بد معاشو، یہ چین کا انقلاب دیکھو

تمہارا منہ ایک ہی طمانچے میں پھر گیا ہے جواب دیکھو
وہ کس طرح مسکرا رہے ہیں شہید روحوں کے خواب دیکھو
چمکتی کرنوں کی جوت پڑتی ہے ایشیا جگمگا رہا ہے
جہاں میں طوفان آرہا ہے

پکار کر چین کہہ رہا ہے کہ ایشیا کی نجات ہوں میں
بظاہر اک ملک ہوں حقیقت میں لیکن اک کائنات ہوں میں
جو ایستان کے دل سے نکلی وہ ماؤ کے لب کی بات ہوں میں
وہ بات جس کا حسیں فسانہ طویل ہوتا ہی جا رہا ہے
جہاں میں طوفان آرہا ہے

یہ وہ سیاست ہے جس نے خنجر کی نوک سے بیڑیوں کو کاٹا
یہ وہ فراست اٹک گیا سامراجیوں کے گلے میں کانٹا
یہ وہ سخاوت ہے جس نے کھیتوں کو روٹیوں کی طرح سے بانٹا
یہ ہے وہ داتا جو دونوں ہاتھوں سے اپنی دولت لٹا رہا ہے
جہاں میں طوفان آرہا ہے

اب آج پہلے پہل بنے ہیں غموں کے بیٹے دکھوں کے پالے
وہ انگلیاں کٹ گئیں حلق¹ سے نکال لیتی تھیں جو نوالے
پھلی کچھ اس طرح فصل اب کی کہ بھر گئے چاولوں کے پیالے
کسان کھیتوں میں ناجی ہوتا ہے اور موتی اُگتا رہا ہے
جہاں میں طوفان آرہا ہے

جو بند تھیں سامراجی روڈوں سے کھل گئیں آخرش وہ راہیں
لیوں سے بوسے اڑے عقیدت کے، آنکھ سے پیار کی نگاہیں
حسیں سر قند کے گلے کا ہیں ہار، اب نالین کی بانہیں
بخارا بیتاب ہو کے پیکنگ کو گلے سے لگا رہا ہے

1. 'حلق' کو میں نے 'مُحَلَق' کے وزن کے بجائے 'فَلک' کے وزن پر استعمال کیا ہے کیونکہ عام بول چال میں لوگ لام کو تحرک ہی بولتے ہیں۔ اس لیے 'مُحَلَق'۔

جہاں میں طوفان آرہا ہے

چلتا ابرونگار چیس کا دلوں پہ جادو چلا رہا ہے
 دیکتے رنگ شفق کا پرچم لبو کی سرخی بڑھا رہا ہے
 بلند جوئے کا ہاتھ فتح و ظفر کا رستہ دکھا رہا ہے
 ہمالیہ پر کھڑا ہے ماؤ اور ایشیا کو بلا رہا ہے
 جہاں میں طوفان آرہا ہے
 جہاں میں طوفان آرہا ہے

11

یہ شاعری شاعری نہیں ہے

رجز کی آواز، بادلوں کی گرج ہے، طوفان کی صدا ہے
 کہ جس کو سن کر

پہاڑ آتے ہیں سبز ماتھوں میں برف کی کلغیاں لگائے
 دھوئیں کے بالوں میں سرخ شعلوں کے ہار گوندھے
 سمندر آتے ہیں جھاگ کی جھانچھنیں بجاتے
 ہوائیں آتی ہیں اپنے جھونکوں کی نیلگوں کو پھنیں گھماتی
 گھٹائیں آتی ہیں بجلیوں پر سوار ہو کر
 پتھر آتے ہیں اپنے کاندھوں پہ ندیوں کی کند ڈالے
 چٹنائیں آتی ہیں اپنا گہر گراں سنبھالے
 وہ جنگل آتے ہیں آندھیوں کے نشان اڑاتے
 وہ ریگ زاروں کے غول اپنے دفنوں پہ گاتے
 ببول آتے ہیں اپنے کانٹوں کے ہاتھ اٹھائے
 درخت آتے ہیں پتیوں کی ہری ہری تالیاں بجاتے

منار آتے ہیں منبروں کے بلند ذکون پہ چوٹ دیتے
 زمین آتی ہے اپنی دھولک پہ تال دیتی
 اجالے آتے ہیں کرم سورج کی ڈھال اٹھائے
 اندھیرے آتے ہیں سرد تاروں کے تیر جوڑے
 وہ کھیت آتے ہیں اپنے پودوں کی فوج لے کر
 وہ جہاز جھکاڑ اپنے سینے میں چھاپا ماروں کے دل چھپائے
 شہید آتے ہیں خوں کے ہونٹوں سے گیت گاتے
 سیاسی قیدی فلسفہ زنداں کے خواب لے کر
 کسان کنیا کس جلتی آنکھوں میں جلتی دوزخ کے گرم شعلے
 جوانیاں عارضوں کی سرنی میں رنگ و بوئے گلاب گھولے
 دھڑکتے سینے شفق کے آنچل میں حسن کی بجلیاں چھپائے
 ہتھیلیاں آتی ہیں حسا کے کنول جلائے
 پیار آتے ہیں ہستے ہونٹوں کے پھول لے کر
 حسین ماکس بن پہ فصل بہار کی کوئلیں بجائے
 جہنمے بچوں کی مٹھیاں تھلیاں دبائے
 ستارے پکلوں سے نور کی کشتیوں کو کھیتے
 کتابیں آتی ہیں گنگناتی

مکان آتے ہیں آہ بھرتے

کلرک آتے ہیں اپنی بظلوں میں کاغذی فائلیں دبائے
 ہتھوڑے آتے ہیں جنگ بازوں کا دل ہلاتے
 جہاز آتے ہیں راج ہنوں کا روپ دھارے
 وہ سگنل آتے ہیں اپنے مغرور سر اٹھائے
 وہ انجن آتے ہیں بھاپ کے قہقہے لگاتے
 بوائلر آتے ہیں جہنم پہ مسکراتے
 وہ پتے آتے ہیں سامراجی حرام خوروں کا سر کھلتے

ٹھٹکی رنگین چوڑیاں جیسے کرشن کے پتھر کو گھماتی
 چمکتے نیلے بھوؤں کی ترچھی کمان اٹھائے
 وہ آنکھیں آتی ہیں جن میں اپنے غموں کا کابل لگا ہوا ہے
 وہ ہونٹ آتے ہیں جن میں کیلیں ٹھکی ہوئی ہیں
 وہ ہاتھ آتے ہیں جن کو دھویا گیا ہے شبنم کے آنسوؤں سے
 وہ ہاتھ آتے ہیں جو بلوں کو چلا رہے ہیں
 وہ ہاتھ آتے ہیں جو مشینوں کو چھو رہے ہیں
 وہ ہاتھ آتے ہیں جن میں جھنڈے اُگے ہوئے ہیں
 وہ ہاتھ آتے ہیں جن پہ نظمیں لکھی ہوئی ہیں
 وہ ہاتھ آتے ہیں جو کہانی سنا رہے ہیں
 وہ ہاتھ آتے ہیں جو ستارے بنا رہے ہیں
 وہ ہاتھ جو بجلیوں کی گردن پکڑ رہے ہیں
 جو سنگ و آہن سے اپنا پنجہ لٹا رہے ہیں
 وہ ہاتھ جو ساریں کو رنگوں کی ناند میں ڈوب دے رہے ہیں
 وہ ہاتھ جو اپنی انگلیوں سے زمیں کی تقریر لکھ رہے ہیں

اب ایشیا کی زمیں پہ ہاتھوں کا ایک جنگل اُگا ہوا ہے
 یہ سنگ مرمر کی، سنگ اسود کی مٹھیاں ہیں
 کنول کی کلیاں، کپاس کے پھول، بم کے اور تاریل کے گولے
 کہاں ہے اے نومردس صبح بہار آجا
 ہماری بیتاب مٹھیوں میں
 شفق کا سینہ دور

چاند تاروں کے پھول
 کرنوں کی سرخ افشاں بھری ہوئی ہے

ہمارے ہاتھوں میں ہاتھ دوسویت کیہ زم کی بہارو
 ہمارے ہاتھوں میں ہاتھ دواے عوامی جمہوریت کے ہستے ہوئے ستارو
 ہمارے ہاتھوں میں ہاتھ دو یورپ اور امریکہ کے جواں بخت کامگارو
 ہم ایک ہیں ایک ہو گئے ہیں
 سیاہ، پیلے، سفید، بھورے
 ہم ایک فصل بہار کے پھول ایک سورج کی روشنی ہیں
 ہم ایک دنیا کے مختلف تاراک مندر کے دل کی موجیں
 الگ الگ پھر بھی ایک ہیں ایک ایک دھرتی کے رہنے والے
 ہم ایک دھرتی کے بسنے والے ہیں ایک انسانیت کے قائل
 نہ کوئی پورب ہے اور نہ کچھم
 زمین سورج کا آئینہ لے کے تاجی ہے
 حیات انساں کی جیت کے گیت گارہی ہے۔

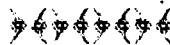
صفیں جمار ہے ہیں ہم قدم بڑھا رہے ہیں ہم

یہ وقت، وقت سرش ہے سرائھا رہے ہیں ہم
 یہ صبح صبح انقلاب گیت گارہے ہیں ہم
 نشان فتح آسمان پر اڑا رہے ہیں ہم
 قدم بڑھا رہے ہیں ہم
 قدم بڑھاؤ راستوں کے پیچ خم میں کچھ نہیں
 گراؤ بجلیاں اب آنسوؤں کے خم میں کچھ نہیں
 بس اک قدم کا فاصلہ ہے اک قدم میں کچھ نہیں

یہ منزل حیاتِ نو ہے مسکرا رہے ہیں ہم
 قدم بڑھا رہے ہیں ہم
 ہمیں ہے فکر دامنوں کی اور نہ آستین کی
 ہمارے ساتھ چل رہی ہیں گردشیں زمین کی
 بدل گئیں ہمارے واسطے ہوائیں چین کی
 ہوئے چین ایشیا میں اب چلا رہے ہیں ہم
 قدم بڑھا رہے ہیں ہم

رواں دواں ہیں نوجواں بے دلتوں کی چھاؤں میں
 ہمارے چھاپے مار شیر شیر گاؤں گاؤں میں
 لگے ہوئے ہیں بھٹیوں کے پر ہمارے پاؤں میں
 ہر ایک گام پر قیامتیں اٹھا رہے ہیں ہم
 قدم بڑھا رہے ہیں ہم
 گذر رہے ہیں قافلے دیارِ صبح و شام سے
 پہاڑ اپنا سر جھکا رہے ہیں احرام سے
 دہل رہی ہے موت نو حیاتِ تیز گام سے
 نقوشِ پائے کتنے مورچے بنا رہے ہیں ہم
 قدم بڑھا رہے ہیں ہم

کہیں ہوا کے تند راہوار پر سواں ہیں
 کہیں گھٹا کی گھن گرج کہیں پہ آبشار ہیں
 کہیں خزاں کا روپ ہیں کہیں رخِ بہار ہیں
 ہر ایک رنگِ روپ میں فضا پہ چھا رہے ہیں ہم
 قدم بڑھا رہے ہیں ہم



نیل میں رہ کے سردار نے اپنا اور سماجی حالات کا کڑی نگاہ سے سماجی تنقیدی تجزیہ کیا اور ایشیا کی خوبصورت سچائی ان پر موثر ہوئی اور انھوں نے اپنی طویل نظم 'ایشیا جاگ اٹھا' لکھی جو بیک وقت رزمیہ بھی ہے اور غنائیہ بھی جس میں ایک کی مثالیت اور غنائی سندرہ ہے۔ اس نظم میں ایشیا کا سارا جمل روپ سمت کر لیا گیا ہے اس نظم میں چار ہزار سالہ تہذیب کی تصویر ہے، یہاں کی غریبی چیتھڑے پہنے دکھائی دے رہی ہے، اس کے عوام کی بغاوت کا بے پناہ جذبہ قومی اور ملی احساسات کو سموتا ہوا ایک طوفانی سمندر میں تہلجیل ہو گیا ہے، میرا خیال ہے کہ اس نظم سے ہماری اردو کی ترقی پسند شاعری اپنے سن بلوغ کو پہنچتی ہے، جوان ہوتی ہے اور خود سردار کی شاعری افادیت اور وجدان کی ان سر بلند یوں کو چھو لیتی ہے جہاں سے عظمت کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں۔

کرشن چندر

پتھر کی دیوار

1953

حرفِ اول

’پتھر کی دیوار‘ میری جیل کی نظموں کا مجموعہ ہے جس میں اب میں نے بعد کی کبھی ہوئی کچھ اور نظمیں بھی شامل کر لی ہیں ’ایشیا جاگ اٹھا‘ اور ’امن کا ستارہ‘ کی تینوں نظمیں اسی مجموعہ کا حصہ تھیں لیکن چونکہ اس مجموعہ کے چھپنے میں دیر ہوئی اور وہ الگ الگ کتابی شکل میں شائع ہو گئیں اس لیے میں نے الگ ہی رکھنا مناسب سمجھا۔

میں جولائی 1950 میں تقریباً بیڑا ساڑھے سال بعد جیل سے رہا ہوا تھا اور میرا خیال تھا کہ ’پتھر کی دیوار‘ دو چار مہینے میں کتابی شکل اختیار کر لے گی۔ لیکن گزشتہ تین سال میں یہ کتاب مختلف ناشرین کے پاس چکر لگاتی رہی۔ اس کی کتابت کئی بار ہوئی اور ہر بار کسی نہ کسی وجہ سے طباعت رک گئی۔ آخر اب تین سال کی دیر سے یہ مجموعہ چھپ رہا ہے جس کے لیے مکتبہ شاہراہ اور اس کے مالک محمد یوسف صاحب کا شکر گزار ہوں جن کی حوصلہ مندی کے بغیر یہ ممکن نہ تھا۔ لیکن اس کی تازگی اور اہمیت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک جبر و تشدد کا موجودہ نظام زندہ ہے اور عوام کے دلوں میں اس کو تبدیل کر دینے کی ہمت اور ایک نئے، بہتر اور خوبصورت نظام کو قائم کرنے کی امنگ باقی ہے۔ اس کے بعد میری نظموں کا کیا حشر ہوگا مجھے اس کی بالکل فکر نہیں ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ میری شاعری وقتی ہے۔ مجھے یہ بات تسلیم کر لینے میں ذرا بھی جھجک نہیں ہے۔ ہر شاعر کی شاعری وقتی ہوتی ہے۔ ممکن ہے کوئی اور اسے نہ مانے لیکن میں اپنی جگہ یہی سمجھتا ہوں اگر ہم اگلے وقتوں کا راگ الاپیں گے تو بے سرے ہو جائیں گے آنے والے زمانے کا راگ جو بھی ہو گا وہ آنے والی نسلیں گائیں گی۔ ہم تو آج ہی کا راگ چھیڑ سکتے ہیں۔

ہر شاعر اپنے فن کے دامن میں روحِ عصر کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے کوئی کم اور کوئی زیادہ لیکن کسی نہ کسی حد تک ہر شاعر روحِ عصر کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے جو اپنی اس کوشش میں جتنا کامیاب ہوتا ہے وہ اتنا ہی اچھا شاعر ہوتا ہے۔ آج کی حقیقت کی کوکھ سے کل کی حقیقت پیدا ہو رہی ہے۔ کل کے عہد کی رگوں میں آج کے عہد کے خون کے کچھ نہ کچھ قطرے ضرور ہوں گے۔ اس اعتبار اور تناسب سے آج کے شاعر کے لغو نہیں کل کچھ دیر پا قدریں پائی جائیں گی۔ دیر پا قدروں کی اس سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں ہے جنہیں کبھی ادب اور فن کی زبان میں ’ابدی قدریں‘ بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ ورنہ اس

تبدیل ہوتی ہوئی کائنات میں جہاں ہر چیز وجود میں آکر عدم میں کھو جاتی ہے، ابدی چیز کیا ہو سکتی ہے اسی لیے میں شاعری میں آج کی حقیقت یا روح عصر کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہوں۔

آج کی حقیقت کیا ہے؟ روح عصر کیسی ہے؟

آج پرانا نظام اور سماج مر رہا ہے اور نیا نظام اور سماج پیدا ہو رہا ہے۔ انسان اپنی پانچ چھ ہزار برس کی طویل تہذیبی تاریخ میں پہلی بار اپنے آپ کو وہم اور طبقات کی زنجیروں سے آزاد کر رہا ہے۔ پہلی بار انسان کے سر سے انسان کے پیدا کئے ہوئے ظلم اور استبداد کا سایہ اٹھ رہا ہے اور پہلی بار اس 'خالص' انسان کا ظہور ہو رہا ہے جو آقا نہیں ہے، غلام نہیں ہے، جاگیردار نہیں ہے، سرمایہ دار نہیں ہے، ظالم نہیں ہے، مظلوم نہیں ہے بلکہ صرف انسان ہے۔ آج پہلی بار اس محنت کش کا ظہور ہو رہا ہے جو جسمانی اور ذہنی محنت کے خانوں میں تقسیم نہیں ہے اور جو اپنی محنت کی قدر و قیمت جانتا ہے۔ آج پہلی بار وہ انسان زمین پر قدم رکھ رہا ہے جو فطرت سے خوف زدہ نہیں ہے اور جو قوانین فطرت کا علم حاصل کر کے فطرت کی قوتوں کو اپنا مطیع اور فرمانبردار بنا رہا ہے۔ آج پہلی بار وہ انسان پیدا ہو رہا ہے جو رنگ اور نسل کے امتیازات اور جغرافیائی حدود میں اسیر نہیں ہے۔ اس انسان کے خواب صدیوں نے ضرور دیکھے تھے، لیکن یہ انسان آج سے پہلے وجود میں نہیں آیا تھا۔ اس لیے حقیقتاً یہ میلاد آدم کی گھڑی ہے۔ یہ جشن آدم کا وقت ہے جو جدوجہد اس مبارک مقصد کے لیے ہو رہی ہے وہ بڑی خوفناک لیکن بڑی عظیم الشان ہے۔ ابھی کچھ ایسی قوتیں موجود ہیں جو انسان کی خلقت میں حائل ہو رہی ہیں۔ وہ اپنی توپوں، بندو قوں اور طیاروں سے اس دنیا ہی کو تباہ کر دینا چاہتی ہیں جس کے گہوارے میں انسان پرورش پا رہا ہے۔ ان شیطانی قوتوں کے مقابلے پر جو قوتیں اٹھ رہی ہیں ان کے ہاتھوں میں سنگیت اور شاعری، علم، حکمت اور ہنر کے قابل شکست حربے ہیں اس جدوجہد کی ترجمانی کرنے، میلاد آدم کی بشارت دینے اور جشن آدم کی قصیدہ خوانی کرنے کا فخر آج کے شاعر کو حاصل ہوا ہے اور مجھے اس پر ناز ہے کہ میں اس صدی کا وہ شاعر ہوں جو ہزار ہا برس پرانے خوابوں کے تعبیر کی صدی ہے۔ میری نظروں کے سامنے یہ دنیا بن رہی ہے، سنور رہی ہے۔ میری نظروں کے سامنے انسان کی تخلیق ہو رہی ہے۔ کروڑوں ہاتھ جن کے بازوؤں میں تعبیر کی قوت ہے ایک ساتھ لہرا رہے ہیں۔ کروڑوں آوازیں جن میں تخلیق کا نغمہ ہے ایک ساتھ گارہی ہیں۔ کروڑوں تخیل جن میں زندگی کا حوصلہ ہے وقت اور تاریخ پر اپنی کندیں پھینک رہے ہیں اور ان میں میر ابھی ایک چھوٹا سا ہاتھ ہے۔ میری بھی ایک بلکی سی آواز، میر ابھی ایک ذرا سا تخیل شامل ہے۔ یہ دلچسپ نظارہ اس صدی سے پہلے کے شاعروں کو کہاں نصیب ہوا تھا۔

اس عہد کے سارے فکری مدر سے تمام احساسات اور جذبات اس ایک حقیقت سے وابستہ ہیں۔ آج کی روح عصر اس حقیقت اور اس سے وابستہ فکری مدر میں اور احساسات اور جذبات سے بنی ہے اور میری ساری کوشش یہی ہے کہ میں اس روح عصر کو سمیٹ سکوں۔ یہ کام بہت بڑا ہے اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں اس میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ لیکن میری کوشش باری ہے اور یہ مجموعہ اس کوشش کا نتیجہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ میں اپنی شاعری کو نالہ، نیم شعی اور آجہو گائی نہیں بناتا۔ کاہوں میں اسے بیک وقت ستار کاغذ اور کھوار کی جھنکار بنانا چاہتا ہوں اور میرے سامنے اقبال کا پیش کیا ہوا یہ آدرش ہے۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم!

دل جس سے پہاڑوں کے دہل جائیں وہ طوفان

بعض لوگوں کو یہ دنیا تاریک اور گندی نظر آتی ہے۔ واقعی یہاں بڑی تاریکی اور گندگی ہے۔ بڑا ظلم ہے بڑا افلاس ہے، بڑی تنگ دلی ہے اور اس لیے وہ اس کو سب سے بڑی حقیقت سمجھ کر پیش کرتے ہیں۔ ہمارے ہندوستان ہی کو لیجئے۔ اس میں تین چار کروڑ بے روزگار ہیں، دس پندرہ کروڑ امانت اور بیمار ہیں۔ بیس پچیس کروڑ بھوکے اور تنگ ہیں۔ کئی کروڑ عیاش اور انسانیت سوز حرکتیں کرنے والے کہنے ہیں۔ میں نے یہ ساری گندگی دیکھی ہے۔ میں نے ایسے باپ بھی دیکھے ہیں جو اپنی بیٹی کو بیچ دینے کی فکر میں ہیں۔ ایسے بیٹے بھی دیکھے ہیں جو بوزھی ماں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ ایسے بچے بھی دیکھے ہیں جنہوں نے بولنا سیکھنے سے پہلے ماں اور بہن کی دالائی کا کام شروع کر دیا ہے۔ ایسے غنڈے بھی دیکھے ہیں جنہوں نے کئی قتل کئے ہیں۔ میں نے بہت کچھ دیکھا ہے لیکن اس کے بعد بھی میں اسے زندگی کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ حاوی حقیقت نہیں سمجھتا۔ کیونکہ میں نے اس گندگی اور غلاظت، سفاکی اور سنگ دلی کے خلاف جدوجہد کرنے والے مجاہدوں کو بھی دیکھا ہے۔ میں نے بہادری کے وہ نظارے بھی دیکھے ہیں جہاں نہتے آدمی گولیوں کی بوچھاروں میں بھی آگے ہی بڑھتے ہیں۔ وہ قربانیاں بھی دیکھی ہیں کہ ذاتی حسرتوں اور آسائشوں کو وسیع انسانیت کے مفاد کے لیے ترک کر دیا گیا ہے۔ یہ وہ قوتیں ہیں جو سماج کی صدیوں پرانی غلاظت اور درندگی کو دور کر کے زندگی اور انسان کو پاکیزہ بنا رہی ہیں۔ پہلی مرنے ہوئی حقیقت ہے اور دوسری زندہ اور ابھرتی ہوئی حقیقت۔ اس لیے پہلی حقیقت اپنی انتہائی خباثت کے باوجود بھی مجھے پست ہمت، مایوس اور قوطی نہیں بنا سکتی۔

میں اپنے نالہ و بکا، آہ و فریاد سے اس غموں سے بھری ہوئی دنیا کو زیادہ غمگین نہیں بنانا چاہتا۔

ماج کی انحطاطی طاقتیں تو یہ چاہتی ہیں کہ اس زہر آلود فضا کو اور زیادہ آلود کیا جائے۔ لیکن ترقی پسند طاقتوں کا تقاضا یہ ہے کہ فضا کو زہر سے صاف کر کے پاکیزہ کر دیا جائے۔ اور بقول ہیلو زروا ہمیں اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ ہم اس ہوا میں زہر گھول دیں جس میں ہم ہی نہیں بلکہ آنے والی نسلیں بھی سانس لیں گی۔ اس لیے میں تاریکی، افلاس، درندگی اور غلاظت کو ماضی کی حقیقت سمجھتا ہوں جو برابر اپنی قبر کے اندر گھسیتی چلی جا رہی ہے۔ اس کے خلاف جو جدوجہد ہے وہ حال کی حقیقت ہے اور اس جدوجہد سے جو نتائج پیدا ہو رہے ہیں، جس انسان کی تخلیق ہو رہی ہے وہ حقیقت ہے جو حال کو مستقبل بنادیتی ہے۔ آج یہ شاندار جدوجہد دنیا کے ہر ملک میں ہو رہی ہے اور اس نے ساری انسانیت کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ ہندوستان، ایران، افریقہ، انگلستان، امریکہ وغیرہ میں جدوجہد کے دوران میں نئے انسان کی تخلیق ہو رہی ہے۔ چین اور سویت یونین وغیرہ میں یہ تخلیق تخیل کی منزلوں کے قریب پہنچ رہی ہے۔ جب ہم روح عصر کو اس طرح سمجھتے ہیں تو وہ ہمارے دلوں میں نشاط اور حوصلہ مندی پیدا کرتی ہے۔ مایوسی اور قنوطیت نہیں۔ پھر منہ سے یہ جملہ نہیں نکل سکتا کہ جب یہ دنیا بدل جائے گی تب میں رونا چھوڑ دوں گا۔ تب منہ سے صرف یہ نکلے گا کہ ہم اپنی فریاد میں لکڑا کی تاثیر پیدا کریں گے۔ اپنے آنسوؤں کو شراروں میں بدل دیں گے۔ اپنے زخموں سے زبانیں پیدا کریں گے۔ شیطنت کے سامنے رونا، لڑنا، پسا ہونا انسانیت کی توہین ہے اور ہماری انسانیت ہمارے سینوں میں زندہ ہے۔ اس یقین سے وہ فن پیدا ہوگا جس پر پیٹ بھری حسین لڑکیاں آہیں نہیں بھریں گی۔ بلکہ جسے کارزار زندگی میں آگے بڑھنے والے انسان اپنا ہتھیار سمجھ کر اٹھالیں گے۔ یہی میری شاعری کا مقصد ہے جس میں کامیاب ہونے کی میں ابھی کوشش کر رہا ہوں اور اس کوشش میں اپنے پڑھنے اور سننے والوں کا تعاون چاہتا ہوں جو مجھے ہمیشہ ضرورت سے زیادہ ملتا رہا ہے۔ مجھے کبھی اپنے پڑھنے اور سننے والوں سے شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ ہاں کبھی کبھی ان کو مجھ سے یہ شکایت ضرور پیدا ہوئی ہے اور بجا طور پر ہوئی ہے کہ میں نے زندگی اور حقیقت کی ترجمانی میں کوتاہی کی ہے۔ اس لیے مجھے اپنی جدوجہد میں اور زیادہ خلوص اور زیادہ محنت سے کام لینا چاہیے۔ اپنی زندگی کے تجربے کو اور زیادہ وسیع نقطہ نگاہ کو اور زیادہ واضح کرنا چاہیے اور ان نظریات سے اور زیادہ بچنا چاہیے جو رجعت پرستی کی کہیں گاہوں سے دن رات ہم پر یلغار کرتے رہتے ہیں اور اکثر غیر شعوری طور سے ہمارے فن میں سرایت کر جاتے ہیں۔

میں اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مختلف قسم اور مختلف سطح کی شاعری لکھتا رہا ہوں۔ میری تمام تر کوشش یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ آدمیوں کے لیے اپنی شاعری کو آسان بنا سکوں۔ اس کوشش

میں میں ان حدود کو توڑ دینا چاہتا ہوں جو بول چال کی زبان اور شاعرانہ زبان کے بیچ میں حائل ہیں۔ جہاں میں ان حدود کو نہیں توڑ پاتا اور بول چال کی زبان میں اپنا مطلب ادا کرنے سے قاصر رہتا ہوں وہاں شاعرانہ زبان بھی استعمال کر لیتا ہوں۔ یہ دراصل بول چال کی زبان کا بجز نہیں بلکہ میری تربیت کا تصور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بول چال کی زبان ہی سب سے زیادہ شاعرانہ زبان ہے لیکن جب کبھی بول چال کی زبان سے ہٹ کر شاعرانہ زبان بنائی جاتی ہے تو وہ مصنوعی ہوتی ہے۔

پرانی تشبیہ اور استعارے، پرانی علامتیں ایک بہت بڑا خزانہ ضرور ہیں لیکن اس خزانے پر قناعت کر لینا نادانی ہے۔ کبھی تو ان کے استعمال سے بڑا حسن پیدا ہو جاتا ہے لیکن کبھی وہ خیالات اور احساسات کو جکڑ بھی لیتے ہیں اور اصلیت پر پردہ ڈال دیتے ہیں کیونکہ زندگی کی نئی حقیقتیں نئے طریق اظہار اور انداز بیان کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اس لیے میں بغیر کسی جھجک کے نئی تشبیہ اور استعارے بھی استعمال کرتا ہوں۔ اور نئی امجری بھی۔ میں نے اس اصول کو بہت مفید پایا ہے کہ تشبیہ اور استعارے اور امجری موضوع کے ماحول سے حاصل کرنے چاہئیں اس لیے آپ کو میرے یہاں ایسے مصرعے ملیں گے جیسے

شام کی آنکھ میں بارود کے کاجل کی لکیر

یا

پہرہ داروں کی نگاہوں سے ٹپکتا ہے لہو

رائفل کرتی ہے فولاد کے ہونٹوں سے کلام

گولیاں کرتی ہیں سیسے کی زباں سے باتیں

یا

رونیاں چٹکوں کی قجائیں ہیں

جن کو سرمایہ کے دلالوں نے

نفع خوری کے جھروکوں میں سجا رکھا ہے

یا

چاولوں کی صورت پر مفلسی برستی ہے

میں صرف زنداں اور قفس کہنے کے لیے تیار نہیں ہوں بلکہ بعض اوقات میں جیل اور قید خانہ کے لفظ کو ترجیح دیتا ہوں صرف پہرہ دار اور پاسان ہی نہیں بلکہ وارڈ اور سردار کے الفاظ کو بھی جائز سمجھتا ہوں کیونکہ یہ عام استعمال کے الفاظ ہیں اور جیل میں یہی الفاظ سنائی دیتے ہیں۔

اس اصول میں ایک خوبی تو یہ ہے کہ انداز بیان میں تنوع کے بڑے امکان پیدا ہو جاتے ہیں

اور دوسری یہ کہ جدید زندگی، اس کی شیطنت اور آدمیت دونوں اپنے سارے لوازمات کے ساتھ سامنے آتی ہیں جو حقیقت نگاری کے لیے ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری شاعری میں گل، بلبل، شمع، پروانہ، دریا، ساحل، کشتی، رہبر، رہزن، منزل، جادو، مینا، ساغر، تنج و تنگ، ہی نہیں ملتے بلکہ روٹی، چاول، دھان، گیہوں، نمک، ریل، مشین، مزدور، رانخل، نینک، بمبار، چولہا، چٹیلی اور اسی قسم کے دوسرے عام الفاظ کی بھی بہتات ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بعض حضرات کو یہ الفاظ غیر شاعرانہ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ الفاظ بجائے خود شاعرانہ یا غیر شاعرانہ نہیں ہوتے۔ یہ تو شاعر کی اپنی صلاحیت پر منحصر ہے کہ وہ لفظوں کو کیسے استعمال کرتا ہے اس لیے میں ہر لفظ کو استعمال کرنے پر آمادہ رہتا ہوں۔ اپنی اس کوشش میں مجھے بعض اوقات ناکامی بھی ہوتی ہے اور مصرعے بھونڈے اور بھدے ہو گئے ہیں لیکن جہاں کہیں میں کامیاب ہو گیا ہوں مجھے اپنی ناکامی کا صلہ مل گیا ہے۔ میں جو کچھ کہتا ہوں اگر اسے محض روایتی تشبیہوں اور استعاروں میں کہوں تو یہ محسوس ہوگا جیسے کوئی شخص جامہ دار کی پتلون اور چکن کا کوٹ پہنے چلا آ رہا ہے جس سے کانفرنس کی گولیوں کی بو آ رہی ہے۔ اسے میں جامہ دار اور چکن کا غلط استعمال سمجھتا ہوں۔ دوسری طرف میں ملل کا انگرکھا اور دوپٹی ٹوپی پہن کر بھی میدان کارزار میں اترنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

اس مجموعہ میں، میرے دوسرے مجموعوں کی طرح، پابند شاعری بھی ملے گی اور آزاد شاعری بھی۔ کیونکہ شاعری ہمیشہ ردیف اور قافیہ کی محتاج نہیں رہتی۔ ترکی کے شاعر اعظم ناظم حکمت کے الفاظ میں جس طرح ردیف اور قافیہ پر اصرار کرنا ایک طرح کی ہیئت پرستی ہے، اسی طرح محض آزاد شاعری پر اصرار کرنا بھی ایک طرح کی ہیئت پرستی ہے۔ اصل کوشش تو یہ ہونی چاہیے کہ موضوع کو بہتر سے بہتر ہیئت کا لباس عطا کیا جائے اور یہ کہنا غلط ہوگا کہ کوئی ایک مخصوص ہیئت ہی سب سے زیادہ حسین ہے۔ اس لیے میں پابند اور آزاد دونوں قسم کی شاعری کا قائل ہوں۔

لیکن دونوں کے طریقوں میں ذرا سا فرق ہے۔ پابند نظم میں زیادہ تر مصرعوں اور شعروں کو تعمیر پر زور دیا جاتا ہے لیکن میں اس کے برعکس آزاد نظم میں بندوں کی تعمیر کو انفرادی مصرعوں کی تعمیر سے زیادہ اہم سمجھتا ہوں، چونکہ آزاد نظم میں ردیف اور قافیوں کی جھکنا نہیں ہوتی اس لیے اس میں داخلی ترنم کا جادو بہت ضروری ہے۔ یہ ترنم خارجی بھی ہوتا ہے اور داخلی بھی، اس لیے انتخاب الفاظ کے علاوہ مصرعوں کے باہمی ربط سے بھی پیدا ہوتا ہے جو اپنی جگہ معنوی تسلسل کا محتاج ہوتا ہے۔ اس لیے ہر بند کو ایک مکمل تصویر ہونا چاہیے تاکہ مکمل نظم ایک بہت بڑی تصویر کی طرح ہو جسے تمام چھوٹی چھوٹی تصویریں مل کر بناتی ہوں۔ (اس کے بغیر آزاد نظم کے مصرعے الگ الگ ایک دوسرے کی طرف سے منہ پھیرتے ہوئے

کھڑے نظر آئیں گے) مثال کے لیے یہ بند ملاحظہ کیجئے۔

یہ مجاہد، یہ بہادر، یہ دیالے، یہ کسان

برق و باراں کے حریف

جن کے چروں پہ ہے دھرتی کا سکون اور وقار

اور آتھیلی میں لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں

کیا ریاں بولتے تھے اشکوں کی، لہو کا نٹے تھے

آج ہر دشت میں، ہر کھیت میں، ہر میداں میں

سرخ سینوں سے چھڑکتے ہیں لہو کی بوندیں

بجلیاں پھلتی ہیں، گل کھلتے ہیں، بم اُگتے ہیں (تلنگانہ)

یہ تو باغی کسانوں کی تصویر تھی۔ اب رات کا سراپا دیکھیے۔

نیلگوں جواں سینہ

نیلگوں جواں باہیں

کھکشاں کی پیشانی

نیم چاند کا جوڑا

مٹلی اندھیرے کا

پیرہن لرزتا ہے

وقت کی یہ زلفیں

خامشی کے شانوں پر

خم بہ خم مہکتی ہیں

اور زمیں کے ہونٹوں پر

نرم شبنمی بو سے

موتیوں کے دانٹوں سے

کھل کھلا کے ہستے ہیں

(نیند)

آزاد نظم کے بندوں کی یہ تعمیر پابند نظم کے مصرعوں کی تعمیر سے بہت مختلف ہے جس کی مثال

اس بند میں ملے گی۔

وہ لائیں اپنے سہ ارادے، ہم اپنے دل کی امنگ لائیں
ہم اپنے لوح و قلم نکالیں، وہ اپنے تیغ و تفنگ لائیں
ہم اپنے ربط کے تار چھیریں، وہ شورش رعد جنگ لائیں
ہم اپنے زخموں کے گل کھلائیں، وہ خون ناحق کا رنگ لائیں
لہو میں بہہ جائیں گے وہ سب جو لہو کا بیو پار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

(یلغار)

پابند نظم میں ہر مصرعے پر الگ الگ داد لی جاسکتی ہے آزاد نظم میں یہ ممکن نہیں۔ وہاں خیال یا تصویر کی تکمیل پورے بند کی تکمیل کے ساتھ ہوتی ہے۔

چونکہ میں شاعری کو بنیادی طور سے گانے یا بلند آواز سے پڑھ کر سنانے کی چیز اور اس سے شعور کو بیدار کرنے اور جذبات کو ابھارنے کا کام لینا چاہتا ہوں اس لیے میں نے اپنی آزاد نظموں میں بھی یہ کوشش کی ہے کہ وہ محض کاغذ پر پڑھنے کی چیز بن کر نہ رہ جائے۔ میں اکثر مشاعروں میں اپنی آزاد نظمیں پڑھتا ہوں اور مجھے اس تجربے میں کامیابی ہوئی ہے۔ پہلے مخدوم بھی اپنی نظم 'اندھرا' اور 'استالن کی آواز' کے ذریعے سے یہ کامیابی حاصل کر کے یہ خیال غلط ثابت کر چکا ہے کہ ہمارے ملک اور زبان میں آزاد شاعری کو قبول عام نہیں مل سکتی۔

یہ خیال بھی غلط ہے کہ آزاد نظم ردیف اور قافیہ ہی سے نہیں بلکہ بحر اور ترنم سے بھی عاری ہوتی ہے۔ یوں تو نثر میں بھی شاعری کی جاسکتی ہے اور بعض لوگ کرتے ہیں لیکن اردو کے زیادہ تر شعراء آزاد نظم میں بحر کے مقررہ ارکان کی تعداد تبدیل کر کے انھیں استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح بحر کی وہ مانوس شکل تو باقی نہیں رہتی جو اساتذہ کے یہاں نظر آتی ہے لیکن بحر باقی رہتی ہے اور ترنم بھی۔ بعض نظموں میں بحر کی مانوس شکل بھی باقی رہتی ہے۔ صرف ردیف اور قافیہ نہیں ہوتے جیسے 'پتھر کی دیواریا' 'نیند'۔ کبھی کبھی ان نظموں کے کسی بند میں خود بخود قافیہ بھی آ جاتے ہیں۔ جو خیال کی روانی میں حائل نہیں ہوتے اور اس لیے ناگوار نہیں گزرتے مثلاً۔

انقلاب سامان ہے
بند کی فضا ساری

نزع کے ہے عالم میں
 یہ نظامِ زرداری
 وقت کے محل میں ہے
 جشنِ نو کی تیاری
 جشنِ عام جمہوری
 اقتدارِ مزدوری
 غرقِ آتش و آہن
 بیکیسی و مجبوری
 مفلسی و ناداری

(پتھر کی دیوار)

یا

اپنی صد سالہ تمناؤں کا حاصل ہے یہی
 موجِ پایاب کا ساحل ہے یہی
 تم نے فردوس کے بدلے میں جہنم لے کر
 کہہ دیا ہم سے گلستاں میں بہار آئی ہے
 چند سکوں کے عوض چند ملوں کی خاطر
 تم نے ناموس شہیدان وطن بیچ دیا
 باغباں بن کے اٹھے اور جن بیچ دیا

(فریب)

اس کے بعد یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ اس قسم کی شاعری کو پرانی کسوٹیوں پر نہیں کسا جاسکتا۔
 پریم چند نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے خطبہٴ صدارت میں کہا تھا کہ 'ہمیں حسن کا معیار
 تبدیل کرنا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ حسن کا معیار بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہے اور بہت کچھ تبدیل ہو رہا ہے اور
 اس لیے ہماری ترقی پسند شاعری میں جمالیات کا ایک نیا تصور کارفرما ہے۔ ہمارا رومانیت کا تصور بھی بدل
 رہا ہے۔ میری طرح شاعری کرنے والے زندگی کی تلخیوں سے بھاگ کر محبوب کی بانہوں یا فطرت میں
 پناہ نہیں لیتے اور نہ اپنے زمانے سے پشیمیاں ہو کر بیتے ہوئے زمانے میں روپوش ہوتے ہیں۔ بلکہ زندگی کو
 بدل دینے کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔ جذبی کے الفاظ میں۔

’عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ خالص مادی نقطہ نظر نہ ہونے کی وجہ سے داخلیت کہیں نہ کہیں راہ پا جاتی ہے۔ یہ لغزش بسا اوقات غیر مارکسی ادیب کا رخ اخلاق اور روحانیت کے قدیم سہارا کی طرف پھیر دیتی ہے اور جہاں یہ سہارے بھی نہیں ہوتے وہاں شاہد و شراب کی رنگینیاں سہارا بن جاتی ہیں۔ مارکسی طریقہ فکر ہمیں اس قسم کے سہارے نہیں دیتا جو انسانی تاریخ میں کبھی بھی ٹیکس انسانوں کے کام نہ آ سکے۔ اس کے بجائے وہ ہمارے سامنے خالص مادی بنیادوں پر حقیقت کو ہی سامنے نہیں لاتا بلکہ ایک ایسے تابندہ مستقبل کا خواب بھی دکھاتا ہے جو دنیا کے ایک بہت بڑے حصے میں حقیقت بن چکا ہے۔‘ (فروزاں کا دیباچہ)

میرا خیال ہے کہ ہم آج کی حقیقت میں مستقبل کے انھیں ٹھوس خوابوں کی آمیزش سے رومان حسن اور وفور پیدا کر سکتے ہیں اس لیے میں نے صرف پھولوں اور ستاروں، محبوب کے رخساروں اور آنکھوں اور چھلکتے ہوئے جاموں اور لرزتے ہوئے پیراہنوں ہی میں حسن نہیں دیکھا ہے۔ بلکہ تیل کے چشموں اور کونسلے کی کانوں اور سوت کے کارخانوں میں بھی حسن نکھرا ہوا پایا ہے۔ اس تصور ہی سے اس طرح کی تصویریں بنتی ہیں۔ جیسے ’سیاہ ہیرا‘ (کوئلہ) ’پچھلے ہوئے ستارے‘ (چشموں کا تیل) ’کپاس کی چاندی‘ (روٹی) یا ’سورج کی رنگین کرنوں کی لچکتی ہوئی انگلیاں‘ (رات کے تار) وغیرہ وغیرہ۔ یہ نئی تصویریں ہیں جنہیں میں نے اپنی نظموں میں استعمال کیا ہے اور اس طرح کے مصرعے کہیں ہیں۔

ہے چمنیوں کا دھواں بھی پرچے کا کھوں کی طرح دل آرا

لیکن چونکہ موجودہ سماج میں انسان مشین پر نہیں بلکہ مشین انسان پر حاوی ہے اور ظلم اور استحصال کی علامت بن کر سامنے آتی ہے اس لیے ایسی تصویریں بھی ملیں گی۔

چمنیاں بھتیوں کی طرح بال کھولے ہوئے

مگر یہی بھتینیاں ہمارے قبضے میں آنے کے بعد شہزادیاں بن جائیں گی اور پھر ہم ’ناچتی چرخوں‘ اور ’گنگناتی ہوئی تلکیوں‘ اور ’کارخانوں میں مشینوں کے دھڑکتے ہوئے دل‘ کے گیت گائیں گے۔

میرے لیے زمین سے زیادہ حسین، انسان سے زیادہ پروقار اور مستقبل سے زیادہ تابناک کوئی چیز نہیں ہے۔ ادب اور آرٹ کی سب سے بڑی جمالیاتی قدریں انھیں سے پیدا ہوتی ہیں۔

طبع ثانی

’پتھر کی دیوار‘ کا دوسرا ایڈیشن اکتالیس سال بعد شائع ہو رہا ہے اس تاخیر کی کوئی وجہ نہیں تھی لیکن تاخیر ہوتی رہی۔

میری ذہنی اور جذباتی تشکیل کا موسم آنچھ اور تھا۔ ہر طرف پھول کھل رہے تھے۔ ہوا میں شراب کی تاثیر تھی۔ طلوع آفتاب سے افق گلزار تھا۔ آج موسم بدل چکا ہے۔ اردو زبان اور شعر و ادب، سب سیاسی اور سماجی حالات کا شکار ہیں۔ ایسی صورت میں کسی کتاب کا زندہ رہنا حیرت ناک بات ہے۔ گزشتہ چالیس سال کے عرصہ میں بار بار مجھے پتھر کی دیوار کی نظموں کی زندگی کا ثبوت ملتا رہا۔

ایک دلچسپ واقعہ پاکستانی اشاعت کا ہے۔ وہاں میری شاعری ممنوع نہیں تھی لیکن میرے داخلے پر پابندی تھی اس لیے عام طور سے پبلشر میری کتابیں شائع کرنے سے گھبراتے تھے۔ پھر بھی پتھر کی دیوار کے نسخے زیر اس کے ذریعہ سے نقل کیے گئے اور خاموشی سے تقسیم ہوتے رہے۔ 1984ء کی بات ہے کہ کراچی کی ایک محفل میں ایک صاحب نے اس کا ایک نسخہ مجھے عنایت کیا جو انھیں ان کی طالب علمی کے زمانے میں کالج سے انعام کے طور پر ملا تھا۔ ایسے خوشگوار واقعات ہندوستان اور ہندوستان کے باہر دوسرے مقامات پر بھی پیش آتے رہے جو اس بات کے اشارے کر رہے تھے کہ اب طبع ثانی میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ پھر بھی تاخیر ہوتی رہی۔ اب شاہد علی خاں صاحب کی عنایت سے یہ کتاب نئے زیور طبع سے آراستہ ہوئی ہے۔

یہ کتاب اس فصل بہار کا ثمر ہے جو اقبالؒ۔ رجوش کے بعد اردو شاعری کا مزاج بدل رہی تھی اور نئی پیکر تراشی کی جلوہ گری سے نئی شعری جمالیات کی تشکیل ہو رہی تھی۔ یہ جمالیات نئے شاعروں کے ہاتھوں میں محفوظ ہے اور نئی جلا حاصل کر رہی ہے۔

پتھر کی دیوار

کیا کہوں بھیا تک ہے
 یا حسین ہے یہ منظر
 خواب ہے کہ بیداری
 کچھ پتا نہیں چلتا
 پھول بھی ہیں سایے بھی
 خاک بھی ہے پانی بھی
 آدمی بھی محنت بھی
 گیت بھی ہیں آنسو بھی
 پھر بھی ایک خاموشی
 روح و دل کی تنہائی
 اک طویل ستارہ
 جیسے سانپ لہرائے
 ماہ و سال آتے ہیں
 اور دن نکلتے ہیں
 جیسے دل کی بستی سے
 اجنبی گزر جائے

چینی ہوئی گھنٹیاں
 زخم خوردہ طائر ہیں
 نرم رو سبک لمحے
 نجمہ ستارے ہیں
 ریگلی ہیں تاریخیں
 روز و شب کی راہوں پر
 ڈھونڈتے ہیں چشم و دل
 نقش پا نہیں ملتے
 زندگی کے گلدستے
 ریب طاق نسیاں ہیں
 پتیوں کی پلکوں پر
 اوس جگرگاتی ہے
 المیوں کے پیڑوں پر
 دھوپ پر سکھاتی ہے
 آفتاب ہنستا ہے
 مسکراتے ہیں تارے
 چاند کے کنوڑے سے
 چاندنی جھلکتی ہے
 جیل کی فضاؤں میں
 پھر بھی اک اندھیرا ہے
 جیسے ریت میں گر کر
 دودھ جذب ہو جائے
 روشنی کے گالوں پر
 تیرگی کے ناخن کی

یہ وہ خراشیں ہیں

تھروں کی دیواریں

بارکوں کی تعمیریں

اڑدہوں کے پیکر ہیں

جو نئے ایہ وہ کو

رات دن تھکتے ہیں

ان کے پیٹ کی دوزخ

کوئی بھر نہیں سکتا

چتروں کی دیواریں

بھوک کا بھیا تک روپ

چلپوں کے ہڈے راگ

روٹیوں کے دانٹوں میں

ریت اور انگڑ ہیں

دال کے پیالوں میں

زرد زرد پانی ہے

چاڈلوں کی صورت پر

مفلّسی برست ہے

سبزیوں کے زخموں سے

چپ سی چلتی ہے

چتروں کی دیواریں

درد و غم کے پیروں میں

آنسوؤں کی زنجیریں

بے بسی کی محفل میں
 حسرتوں کی تقریریں
 رشیوں کی گمانوں میں
 بازو ہنس کی گولائی
 نیم جان قدموں میں
 بیڑیوں کی شہنائی
 ہتھکڑی کے حلقوں میں
 ہاتھ کسماتے ہیں
 پھانسیوں کے پھندوں میں
 گردنیں تڑپتی ہیں

پتھروں کی دیواریں

جو کبھی نہیں روتیں
 جو کبھی نہیں ہنستیں

ان کے سخت چہرے پر
 رنگ ہے نہ غازہ ہے
 کھردرے لبوں پر صرف
 بے حسی کی مہریں ہیں

پتھروں کی دیواریں

پتھروں کے فرش اور چھت

پتھروں کی محرابیں

پتھروں کی پیشانی

پتھروں کی آنکھیں ہیں

پتھروں کے دروازے

پتھروں کی انگڑائی
پتھروں کے پتھروں میں
آہنی سلاخیں ہیں

اور ان سلاخوں میں
سہیلیں تمنائیں
آرزوئیں، امیدیں
خواب اور تعبیریں
اشک پھول اور شبنم
چاند کی جواں نظریں
دھوپ کی سنہری زلف
بادلوں کی پرچھائیں
صبح و شام کی پریاں
موسموں کی لیلیاں
سولیوں پہ چڑھتی ہیں

اور اس اندھیرے میں
سولیوں کے سایے میں
انقلاب پلتا ہے
تیرگی کے کانٹوں پر
آفتاب چلتا ہے
پتھروں کے سینے سے
سرخ ہاتھ اُگتے ہیں
ہاتھ ہیں کہ تلواریں
رات کے اندھیرے میں
جیسے شمع جلتی ہے

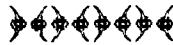
انجمیاں فروزاں ہیں
 بارکوں کے کونوں سے
 سازشیں ہفتی ہیں
 خاموشی کی نبضوں میں
 گھنٹیاں سی بختی ہیں
 جانے کیسے قیدی ہیں
 س جہاں سے آئے ہیں
 ہانپوں میں کیلیں ہیں
 ہڈیاں شکستہ ہیں
 نوجوان بسوں پر
 پیرہن ہیں رنوں کے
 جگمگاتے ہاتھوں پر
 خون کی لکیریں ہیں
 اشک آگ کے قطرے
 سانس تند آندھی ہے
 بات ہے کہ طوفاں ہے
 ابروؤں کی جنبش میں
 عزم مسکراتے ہیں
 اور گندہ کی لرزش میں
 جوصلے مچلتے ہیں
 تیوریوں کی شکنوں میں
 نقش پا بغاوت کے
 جتنا ظلم سہتے ہیں
 اور مسکراتے ہیں

جتنا دکھ اٹھاتے ہیں
 اور گیت گاتے ہیں
 جبر اور بڑھتا ہے
 زہر اور چڑھتا ہے
 ظالموں کی شدت پر
 ظلم چیخ اٹھتا ہے
 ان کے لب نہیں ملتے
 ان کے سر نہیں جھکتے
 دل سے آہ کے بدلے
 اک صدا نکلتی ہے
 'انقلاب' زندہ باؤ

خاک پاک کے بیٹے
 کھیتوں کے رکھوالے
 ہاتھ کار خانوں کے
 انقلاب کے شہپر
 کوہسار کے شاہیں
 پتھروں کی کوروں پر
 آندھیوں کی راہوں پر
 بجلیوں کی بارش میں
 مگلیوں کے طوفاں میں
 سر اٹھائے بیٹھے ہیں

انقلاب ساماں ہے
 ہند کی فضا ساری
 نزع کے ہے عالم میں

یہ نظام زرداری
 وقت کے محل میں ہے
 جشنِ نو کی تیاری
 جشنِ عام جمہوری
 اقتدارِ مزدوری
 غرقِ آتش و آہن
 بے بسی و مجبوری
 مفلسی و ناداری
 تیرگی کے بادل سے
 جگنوؤں کی بارش ہے
 رقص میں شرارے ہیں
 ہر طرف اندھیرا ہے
 اور اس اندھیرے میں
 ہر طرف شرارے ہیں
 کوئی کہہ نہیں سکتا
 کون سا شرارہ کب
 بے قرار ہو جائے
 شعلہ بار ہو جائے
 انقلاب آ جائے



موت

’وارڈر

موت سے جا کے کہہ دو کہ اس وقت فرصت نہیں

پھر کبھی آئے

جیلر کو درخواست دے

کم سے کم پندرہ روز پہلے

تا کہ سی آئی ڈی والے تحقیق کر لیں یہ کون ہے

کس لیے آئی ہے

’موت‘ کچھ اپنی بیوی بہن دوست یا ماں نہیں

اس پہ سی آئی ڈی والوں نے

کوئی پابندی اب تک لگائی نہیں

وہ تو جب چاہے آئے، ملے اور چلی جائے

اس کو ہر طرح کے اختیارات ہیں

اور یہ موت تو خود بڑے حاکموں ہی کے احکام سے آئی ہے

اور کسی میں اس کو روک دینے کی جرأت نہیں

آپ پھانک پہ آجائے

ورنہ وہ خود ہی بارک میں آ جائیگی

اور اک دم سے پھانک کھلا
سائرن بج اٹھا
اونچے ناور پہ خطرے کے جھنڈے نے انگڑائی لی
موت داخل ہوئی
میں نے دیکھا
اور ہم سب نے دیکھا
موت کے میسوں سر تھے اور سیکڑوں ہاتھ تھے
لاٹھیوں کی طرح
رائفل کی طرح
اٹھلیاں لمبی لمبی تھیں، ناخون سنگینوں کے
جسم خاکی تھا

چہرہ گلابی تھا
بارود کی سانس تھی
پاؤں چمڑے کے جوتوں میں
لوہے کی کیلوں سے
پتھر کی راہوں پہ بچتے ہوئے

لفٹ رائٹ کی آواز دیتے ہوئے
جیسے اک دور ماقبل تاریخ کا اژدہا
بھولے بسرے ہوئے جنگلوں سے نکل آیا ہو
لوگ یہ کہتے ہیں موت کی شکل و صورت نہیں
وہ مگر آج ہم سب کی نظروں کے آگے کھڑی تھی
ہیٹ پہنے ہوئے

اپنی موٹی کمر اور چمڑے کی پٹی میں پستول باندھے ہوئے

ظلم کے راج کی جے کہو
 جس میں ہر شخص کے واسطے موت ہے
 قیدیوں کے لیے
 درزیوں کے لیے
 موچیوں کے لیے
 دفنوں کے کھڑکوں، رفیوجی مصیبت زدوں کے لیے
 عورتوں اور بچوں کی معصومیت کے لیے
 موت ہے موت ہے موت ہے
 زندگی بار ہے
 بھوک تکلیف دہ
 مفلسی اور بے روزگاری کا طاعون پھیلا ہوا
 روٹیوں کی جگہ موت لو
 دھوئیوں ساریوں کی جگہ موت لو
 گھر نہیں موت کی گود میں سو رہو
 کام ملتے نہیں اور ملیں بند ہوتی چلی جا رہی ہیں
 فکر کی بات کوئی نہیں
 اپنے جن راج کے منتظم منتری
 رات دن اپنی جتنا کی سیوا میں مصروف ہیں
 موت کے کارخانے بنانے میں مشغول ہیں
 موت کے کارخانے میں چھٹی نہیں
 صرف بھرتی ہی بھرتی ہے بھرتے چلے جاؤ
 اپنی بیوی کو بھی بھیج دو
 اپنے بچوں کو بھی ساتھ لو
 اور بونس میں اک قبر یا اک چتا

جو بھی چاہو گے مل جائے گی

ملک میں اب پولیس راج ہرگز نہیں
 وہ تو انگریز کے وقت تھا
 آج کل موت کا راج ہے
 موت جو سب کی ہمدرد ہے
 سب کی غم خوار ہے
 آج ہم قیدیوں سے ملاقات کے واسطے آئی تھی
 ہم وطن سے بہت دور ہیں
 اپنے احباب کی دوستی
 اور عزیزوں کی الفت سے محروم ہیں
 کوئی ملنے کو آتا نہیں
 مائیں بیمار ہیں
 باپ بوڑھے ہیں اور بیویاں دور ہیں
 بچے کم عمر ہیں
 موت کے بادشاہوں کی غمخواریاں
 ناز برداریاں
 موت ملنے کو شریف لے آئی ہے

ہم مگر سر پھرے، منچلے اور مغرور ہیں
 موت سے ہم کو ملنے کی فرصت نہیں



مقتول مامتا

(ان عورتوں کے نام جو 27 اپریل 1949 کو کلکتہ میں شہید ہوئیں)

میں تم کو اپنی بہن کہوں یا رفیق سمجھوں
مگر وطن کی زمیں ماں کہہ کے یاد کرتی رہے گی تم کو
کہ تم نے خاک وطن کو اپنا لہو دیا ہے
تمہارے چہروں کا نور بنگال کی جبین پر دمک رہا ہے

تم اپنے پیاروں کی بھوک سے بے قرار ہو کر
گھروں سے باہر نکل پڑی تھیں
تم اپنے شہر اپنے دیس اپنے وطن کی سڑکوں پہ چل رہیں تھیں
تم اپنے آکاش کی فضاؤں میں گارہی تھیں
تم اپنے اہل وطن کو انصاف اور صداقت کا نام لے کر
وطن کی خاطر بلا رہی تھیں
تمہارے ہاتھوں میں رائفل تھی
نہ آنچلوں میں بہوں کے گولے
لبوں پہ نعرے گلوں میں آنسو دلوں میں عزم شکستِ زنداں
جوان شانونوں پہ سرخ پرچم چل رہے تھے
پولیس کی لاریوں سے لیکر

تمہارے سینوں پہ آگ کے تیر چل رہے تھے
تمہارے ہاتھوں پہ گرم سیسہ برس رہا تھا

وہ کوکھ زخمی ہے جس میں بچوں کی مسکراہٹ چھپی ہوئی تھی
وہ سینے پھلنی ہیں گولیوں سے
جو نسلِ آدم کے آئینے تھے
وہ جسم اب راکھ ہو چکے ہیں
کہ جن کے اندر

نہ جانے کتنے سڈول جسموں کا رقص پنہاں جھلک رہا تھا
تمہارے بے سدھ جوان ہاتھوں کو پالنے ڈھونڈتے رہیں

مگر میں یہ جانتا ہوں میری شہید بہنو
تمہارا خون رائیگاں نہ ہوگا

یہ خون کے قطرے

یہ سرخ تارے

جو قلبِ بنگال میں

فروزاں ہیں پر چھوٹی پر جوان ہوں گے
انھیں کی گرمی سے انتقام اپنی آگ پیدا کرے گا اک دن
انھیں کی سرفخی سے پھول اپنی بہار لیس گے
انھیں کی بیتابیوں انھیں کی تڑپ سے وہ سوراخاں انھیں گے
جو ظلم کے راج کو جہنم کی پستیوں میں دھکیل دیں گے

وہ سب تمہارے سپوت ہوں گے

اور ان کی نسلوں کے بانگمین میں

تمہاری مقتول مامتا جاوداں رہے گی



بمبئی

سبز و شاداب ساحل
 ریت کے اور پانی کے گیت
 مسکراتے سمندر کا سیال چہرہ
 چاند سورج کے ٹکڑے
 لاکھوں آئینے موجوں میں بکھرے ہوئے
 کشتیاں بادبانوں کے آنچل میں اپنے سروں کو چھپائے ہوئے
 جال نیلے سمندر میں ڈوبے ہوئے
 خاک پر سوکھتی مچھلیاں
 گھانٹیں۔ پتھروں کی وہ ترشی ہوئی مور تیں
 ایلنفلیا کے غاروں سے جو رقص کرتی نکل آئی ہیں

راتیں آنکھوں میں جادو کا کاجل لگائے ہوئے
 شا میں نیلی ہوا کی نمی میں نہائی ہوئی
 صبحیں شبنم کے باریک ملبوس پہنے ہوئے
 خواب آلود کہسار کے سلسلے
 جنگلوں کے گھنے سایے

مٹی کی خوشبو
مہکتی ہوئی کوئیلیں

پتھروں کی چٹائیں
اپنی باہوں میں نعر عرب کو سینے ہوئے

وہ چٹانوں پر رکھے ہوئے اونچے اونچے محل
چکنی دیواروں پر
قتل، غارتگری، بزدلی، نفع خوری کی پرچھائیاں
ریشی ساریاں
مخملیں جسم، زہریلے ناخنوں کی بلایاں
خون کی پیاس کھا دی کے پیراہنوں میں

جھگڑاتے ہوئے قفقے، پارک بانغات اور میوزیم
سنگ مرمر کے بت، دھات کے آدمی
سر دو سنگین عظمت کے پیکر
آنکھیں بے نور، لب بے صدا، ہاتھ بے جان
ہند کی بے بسی اور محکومی کی یادگاریں
سیکڑوں سال کے گرم آتش کدے
زر و صندل کی آگ
عود و عنبر کے شعلے

’چالیں‘ افلاس کی گرد، تاریکیاں
گندگی اور عفونت
گھورے سزتے ہوئے
رہلواروں پہ سوتے ہوئے آدمی

ٹاٹ پر، اور کاغذ کے ٹکڑوں پہ پھیلے ہوئے جسم، سوکھے ہوئے ہاتھ
 زخم کی آستینوں سے نکلی ہوئی ہڈیاں
 کوزھیوں کے ہجوم
 'کھولیاں' جیسے اندھے کنویں
 گرم سینوں، محبت کی گودوں سے محروم بچے
 بکریوں کی طرح رسیوں سے بندھے
 ان کی مائیں ابھی کارخانوں سے واپس نہیں آئی ہیں

چھینیاں بھتہنیوں کی طرح بال کھولے ہوئے
 کارخانے گر جتے ہوئے
 خون کی اور پسینے کی بو میں شرابور
 خون سرمایہ داری کے تالوں میں بہتا ہوا
 بھینسوں میں ابلتا ہوا
 سرد سکنوں کی صورت میں جمتا ہوا
 سونے چاندی میں تبدیل ہوتا ہوا
 بنک کی کھڑکیوں میں چرائیاں
 سڑکیں دن رات چلتی ہوئی
 سانس لیتی ہوئی
 آدمی خواہشوں کے اندھیرے نشیبوں میں سیلاب کی طرح بہتے ہوئے
 چور بازار، ستھ، جواری
 ریس کے گھوڑے، سرکار کے منتری
 سنیما، لڑکیاں، ایکٹر، مسخرے
 ایک اک چیز بکتی ہوئی
 گاجریں، مولیاں، لکڑیاں
 جسم اور ذہن اور شاعری

علم، حکمت، سیاست
 آنکھریوں اور ہونٹوں کے نیلام گھر
 عارضوں کی دکانیں
 بازوؤں اور سینوں کے بازار
 پنڈلیوں اور رانوں کے گودام
 دلشہنگی کے دلال کھادی کے یو پاری
 عقل، انصاف، پاکیزگی، اور صداقت کے تاجر

یہ ہے ہندوستان کی عروس البلاد
 سرزمینِ دکن کی دلہنِ بمبئی
 ایک جنتِ جہنم کی آغوش میں
 یا اسے یوں کہوں
 ایک دوزخ ہے فردوس کی گود میں

یہ مرا شہر ہے
 گو میرا جسم اس خاکداں سے نہیں
 میری مٹی یہاں سے بہت دور لنگا کے پانی سے گوندھی گئی ہے
 میرے دل میں ہمالہ کے پھولوں کی خوشبو بسی ہے
 پھر بھی اسے بمبئی تو مرا شہر ہے
 تیرے باغات میں میری یادوں کے کتنے ہی رم خوردہ آہو
 میں نے تیرے پہاڑوں کی ٹھنڈی ہوا کھائی ہے
 تیری شفاف جھیلوں کا پانی پیا ہے
 تیرے ساحل کی ہنستی ہوئی سپیاں مجھ کو پچانتی ہیں
 ناریل کے درختوں کی لمبی قطاریں
 تیرے نیلے سمندر کے طوفان اور تہقے

تیرے دلش مضافات کے سبزہ زاروں کی خاموشیاں
 رقتیں، ناچتیں، سب مجھے جانتی ہیں
 اس جگہ میرے خوابوں کو آنکھیں ملیں
 اور میری محبت کے بوسوں نے اپنے حسیں ہونٹ حاصل کیے

بہی

تیرے سینے میں سرمایہ کار ہر بھی
 انقلاب اور بغاوت کا تریاق بھی
 تیرے پہلو میں فولاد کا قلب ہے
 تیری نبضوں میں مزدور و ملاح کا خون ہے
 تیری آغوش میں کارخانوں کی دنیا بسی ہے
 سیوری، لال باغ اور پرل
 اور یہاں تیرے بیٹے تری بیٹیاں
 ان کی دکھتی ہوئی انگلیاں
 سوت کے ایک اک تار سے
 ملک کے قاتلوں کا کفن بن رہی ہیں



دکن کی شہزادی

بمبئی اسے دکن کی شہزادی
 نیلگوں سندری اجتا کی
 اپنی اونچی چٹان سے نیچے
 اپنے بالوں کو دھونے آئی ہے
 پنڈلیاں مچھلیاں ہیں چاندی کی
 پاؤں ڈوبے ہوئے سمندر میں
 انگلیاں کھیلتی ہیں پانی سے
 جلتے بیروں کی لاکھوں آنکھوں سے
 پچھلے نیلم کے نیلے ہونٹوں سے
 میرے خوابوں میں مسکراتی ہے
 دل کے طوفان خیز ساحل پر
 موجیں مگاتی ہیں رقص کرتی ہیں
 جھاگ کے آنچلوں کو لہراتی
 چاندنی کی انگوٹھیاں پہنے
 بھیکے تاروں کے پھول برساتی

تیری قوس قزح کی گردن میں
 موج بحرِ عرب کی باہیں میں
 تیرے ماتھے کو پیار کرتی میں
 ترجمی پر چھائیاں جہازوں کی
 خوں کی گردش میں ہے مشین کا راگ
 ناچتی انگلیوں میں سوت کے تار
 جسم پر سیپوں کی نرم چمک
 اور نظروں میں موتیوں کا غرور
 میں ہمالہ کے دیس کا باسی
 تو سمندر کی گود کی پالی
 کیا کہوں کیسے یاد آتی ہے
 ذہن کے ملجھی اجالے میں
 تیری تصویر جھلسلاتی ہے
 چاندنی رات میں گلاب کا پھول

(سنٹرل جیل ناسک)



اودھ کی خاک حسین

گزرتی برسات آتے جائزوں کے نرم لمے
 ہواؤں میں تیلیوں کی مانند اڑ رہے ہیں
 میں اپنے سینے میں دل کی آواز سن رہا ہوں
 رگوں کے اندر لہو کی بوندیں مچل رہی ہیں
 مرے تصور کے زخم خوردہ
 افق سے یادوں کے کارواں یوں گزر رہے ہیں
 کہ جیسے تاریک شب کے تاریک آسمان سے
 چمکتے تاروں کے مسکراتے ہجوم گزریں

میں قید خانے میں عشق پیچاں کی سبز بیلوں کو ڈھونڈتا ہوں
 جو پھیل جاتی ہیں اپنے پھولوں کے ننھے ننھے چراغ لے کر
 کہاں ہیں وہ دنوازا بائیں
 وہ شاخ مند ل

کہ جس پر انگڑائیوں نے اپنے حسیں نشین بنا لیے ہیں
 میں اپنی ماں کے سفید آنچل کی چھاؤں کو یاد کر رہا ہوں
 میری بہن نے مجھے لکھا ہے

ندی کے پانی میں بید کی جھازیاں ابھی تک نہا رہی ہیں
 پیسے رخصت نہیں ہوئے ہیں
 ابھی وہ اپنی سریلی آواز سے دلوں کو لبھارہے ہیں

میں رات کے وقت اپنے خوابوں میں چونک پڑتا ہوں جیسے مجھ کو
 اودھ کی مٹی بلارہی ہے
 حسین جھیلیں کنول کے پھولوں کی چادروں میں ڈھکی ہوئی ہیں
 فضاؤں میں میگھ دوت¹ پرواز کر رہے ہیں
 نہ جانے کتنی محبتوں کے پیام لے کر
 گھٹاؤں کی اپسرا میں اپنی
 گھنیری زلفوں میں آخری بار مسکرا کر
 ظبیج بنگال اور بحر عرب کے موتی پروری ہیں
 ہرے پروں اور نیلے پھولوں کے مورخوش ہو کے تاپتے ہیں
 قدیم گنگا کا پاک پانی زمیں کے دامن کو دھورہا ہے
 وہ کھیتیاں دھان سے بھری ہیں
 جہاں ہوائیں ازل کے دن سے ستار اپنے بجا رہی ہیں
 ہمالیہ کی بلندیاں برف سے ڈھکی ہیں
 ان آسمان بوس چوٹیوں کو
 سحر کے سورج نے سات رنگوں کی کلفیوں سے سجادیا ہے
 شفق کی سرخی میں میری بہنوں کی مسکراہٹ گھٹی ہوئی ہے

مرے تصور میں ساقیوں کا خرام رنکس نہ جام وینا کی گردشیں ہیں
 نہ میکدے ہیں نہ شورشیں ہیں
 میں چھوٹے چھوٹے گھروں کی چھوٹی سی زندگی میں گھرا ہوا ہوں

1. 'میگھ دوت' بہ معنی بادل۔ اس نام کی مشہور نظم کالی داس نے لکھی تھی جس میں بادل محبت کا پیامی ہے۔

اندھیرے رقصوں کو یاد کر کے تڑپ رہا ہوں
 وہ جن کی گلیوں میں میرے بچپن کی یادیں اب تک بھٹک رہی ہیں
 جہاں کے بچے پرانے کپڑوں کی میلی گڑیوں سے کھیلتے ہیں
 وہ گاؤں جو سیکڑوں برس سے بے ہوئے ہیں
 کسانوں کے جھونپڑوں پہ ترکاریوں کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں
 پرانے پمپل کی جڑ میں پتھر کے دیوتا بے خبر پڑے ہیں
 قدیم برگد کے بیڑ اپنی جسامیں کھولے ہوئے کھڑے ہیں

یہ سیدھے سادے غریب انسان نیکیوں کے مجسمے ہیں
 یہ محنتوں کے خدایہ تخلیق کے پیہمیر
 جو اپنے ہاتھوں کے کھر درے پن سے زندگی کو سنوارتے ہیں
 لہار کے گھن کے نیچے لوہے کی شکل تبدیل ہو رہی ہے
 کمہار کا چاک چل رہا ہے
 صراحیوں رقص کر رہی ہیں
 سفید آنا سیاہ چکی سے راگ بن کر نکل رہا ہے
 سنہرے چولہوں میں آگ کے پھول کھل رہے ہیں
 پتیلیاں گنتا رہی ہیں
 دھوئیں سے کالے تو بے بھی چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنس رہے ہیں
 دوپٹے آنگن میں ڈوریوں پر ٹنگے ہوئے ہیں
 اور ان کے آنچل سے دھانی بوندیں چک رہی ہیں
 سنہری گھنٹہ یوں کے دل پر
 سیاہ بنگلوں کی سرخ گونٹیں بھل رہی ہیں

یہ سادگی کس قدر حسین ہے
 میں جیل میں بیٹھے بیٹھے اکثر یہ سوچتا ہوں

جو ہو سکے تو اودھ کی پیاری زمین کو گود میں اٹھا لوں
اور اس کی شاداب لہلہاتی ہوئی جبین کو
ہزاروں بوسوں سے جگمگا دوں

میں اپنے بچپن کے ساتھیوں کی گرجتی آواز سن رہا ہوں
وہ کارخانوں کے سامنے انقلاب بن کر کھڑے ہوئے ہیں
وہ کھیتوں میں بہار بن کر رواں دواں ہیں
اندھیری کانوں کی تیرگی میں
وہ نور بن کر اتر رہے ہیں
زمین کے سینے پہ کاشتکاروں کی لائیں کے
ہزاروں جنگل اگے ہوئے ہیں
کدالیں کھیتوں کی پاسباں ہیں
درائیاں جگمگا رہی ہیں
زمین کے غاصبوں کے چہرے کا رنگ کافور ہو رہا ہے
ملوں کے مالک لرز رہے ہیں

غریب سیتا کے گھر پہ کب تک رہے گی راون کی حکمرانی
دروپدی کا لباس اس کے بدن سے کب تک چھٹا کرے گا
شکستہ کتاب تک اندھی تقدیر کے صحنوں میں پھنسی رہے گی
یہ لکھنؤ کی شعلہ کی مقبروں میں کب تک دبی رہے گی
سروں کے اوپر مصیبتوں کے پہاڑ کب تک گرا کریں گے
بلکتی آستوں کو بھوک کب تک ڈسا کرے گی
زمین کے سینے پہ قاتلوں کے گردہ کب تک چلا کریں گے
خباثتیں کب تک انہما کاروپ و حارے پھرا کریں گی

کسان جو اپنی پاک دھرتی پہ جانور کی طرح جھکے ہیں
 وہ جن کی ہڈیوں پہ بھارتی اینٹیں لدی ہوئی ہیں
 جو کچے چمڑے کے سخت جوتوں سے پٹ رہے ہیں
 یہ جسم جو کارخانے کاروں کی بھٹیوں میں ابل رہے ہیں
 یہ ہاتھ لوہے کے دانت جن کو چبا رہے ہیں
 یہ خون جو نفع خور بیوں کی تھیلیوں میں کھنک رہا ہے
 یہ عورتیں جن کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہیں
 جو اونچے بیڑوں پہ اپنے بالوں کی پھانسیوں میں لٹک رہی ہیں
 یہ کانپتی مفلسی جو آئی ہے چھاتیوں کا لگان لے کر
 یہ ننھے بچے جو مالکوں کے مویشیوں کو تھرا رہے ہیں
 جو کھیت مزدور بھوکے رہ کر زمیں سے گیسوں اگا رہے ہیں
 یہ اپنے سینے کی آگ کب تک دبا سکیں گے
 یہ اپنی نفرت کا زہر کب تک چھپا سکیں گے
 یہ زخم کب تک ہر سد ہیں گے

اودھ کی خاک حسیں کے ذرے گو لے بن کر چل رہے ہیں
 اب آنسوؤں کی پرانی جھیلوں سے سرخ شعلے ابل رہے ہیں
 غموں کی بھاری سلیس دلوں سے سرک رہی ہیں
 شجاعتیں گو پھنوں کو لے کر نکل رہی ہیں
 جھکے ہوئے سر اُبھرتے سورج کی شان و شوکت سے اٹھ رہے ہیں
 یہ سوز ماؤں کی سرزمین ہے

یہ آسمان فحوش طوفان برق و باراں کا آسمان ہے
 یہ مسکراتی ہوئی فضا سرخ آمدھیوں سے بھری ہوئی ہے
 یہاں کا ایک ایک چپ لاٹھوں بناوتوں سے بسا ہوا ہے
 بناوتیں جو ہر اک شہنشاہیت کی چولیس ہلا چکی ہیں

بغاوتیں سامراج کو جو بلند یوں سے گرا چکی ہیں
 بغاوتیں جو فرنگیوں کے دلوں پر ہیبت بٹھا چکی ہیں
 یہی پرانی بغاوتیں پھر نئے سرے سے جواں ہوئی ہیں

مرے وطن کی زمیں کو ناپاک کرنے والو
 میں ان پرانی نئی عوامی بغاوتوں ہی کا ترجمان ہوں
 میں اپنے اہل وطن کے احساس اور جذبات کی زباں ہوں
 میں خاک سے کہہ رہا ہوں اپنے اناج کو کوکھ میں چھپالے
 لٹیرے کھیتوں میں پھر رہے ہیں
 میں لاکھوں مزدور نو جوانوں کے ساتھ میدان میں آ رہا ہوں
 غدر کے مقتول سوراخوں کو مرقدوں سے اٹھارہا ہوں
 میں بخوری بخوراکے سوئے شیروں کو گیت گا کر جگا رہا ہوں
 چمن کے پھولوں چمن میں اک آگ سی لگا دو
 چلتی شاخوں فضا میں زنجیر بن کے پھیلو
 زمیں کی دھاتو ہوا میں جوالا لکھی اچھا لو
 ملو کے پہتو بغاوتوں کے ترانے گاؤ
 کہاں ہواے نیکیوں کی فوج
 بدی کے اونچے محل گرا دو
 صداقتو آؤ جھوٹ کے سانپ کو کچل دو
 حیات کی تیز و تند موجوں کے خاشاک کو بہا دو
 سحر کی کرنوں اندھیری راتوں کے سر پہ برسو
 عوام کے دشمنوں کا نام و نشان مٹا دو
 اودھ کی خاک حسیں کے ذرہ
 جو سیکڑوں میل دور سے اڑ کے میرے خوابوں میں آ گئے ہو
 مرے وطن کی زمیں سے میرا سلام کہنا

اسے بتانا

کہ میرے ہونٹوں پہ سنگ و آہن کی سرد مہریں لگی ہوئی ہیں
 وہ کالا قانون ایک دیوار بن کے رستے میں آگیا ہے
 جسے انسا کا نام لے کر پجاریوں نے کھڑا کیا ہے
 مگر یہ دیوار روک سکتی نہیں ہے مجھ کو
 اہلتے جوالا کھسی کو کوئی دبا سکا ہے؟
 میں آج مجبور ہوں تو کیا ہے
 وطن سے کچھ دور ہوں تو کیا ہے
 مگر میں اس کے مجاہدوں کی صفوں سے باہر نہیں گیا ہوں



میرے خواب

اے مرے حسین خوابو
 تم کہاں سے آئے ہو
 کس افق سے ابھرے ہو
 کس شفق سے نکھرے ہو
 کن گلوں کی صحبت میں
 تم نے تربیت پائی
 کس جہاں سے لائے ہو
 یہ جمال و رعنائی

جیل تو بھیا تک ہے
 اس ذلیل دنیا میں
 حسن کا گزر کیسا
 رنگ ہے نہ کہت ہے
 نور ہے نہ جلوہ ہے
 جبر کی حکومت ہے
 تم کہاں سے آئے ہو
 اے مرے حسین خوابو

میں نے تم کو دیکھا ہے
 یاد اب نہیں آتا
 شاید ایک لڑکی کی
 تھر تھراتی پلکوں میں
 جگمگاتی آنکھوں میں
 یا کسی تبسم میں
 جو نہا کے نکلا ہو
 آنسوؤں کی شبنم سے

اک ہسکتے بچے کی
 مٹھیوں کے پھولوں پر
 تتلیوں کی یورش سی
 اور ماں کی نظروں میں
 سیکڑوں امیدوں کے
 شوخ رنگ مگدھتے
 میں نے تم کو دیکھا ہے
 ننھی ننھی گڑبڑوں میں
 ناچتے کھلونوں میں
 یا ربر کی گیندوں میں
 میں نے تم کو دیکھا ہے
 گھنٹیوں چلے ہو تم
 توتلی زبانوں سے
 تم نے دودھ مانگا ہے

'ایک شاہزادہ تھا
 'ایک شاہزادی تھی
 اس دسویں کہانی پر
 جانے کتنے بچوں نے
 اپنے سر اٹھائے ہیں
 جانے کتنی آنکھوں میں
 پھول مسکرائے ہیں
 اور میں سمجھتا ہوں
 تم اسی کہانی کی
 سر زمیں سے آئے ہو

کچھ کسان کنیائیں
 سبز و سرخ شیشوں کی
 چوڑیاں کلائی میں
 اور گلے کی چاندی کی
 بنسلوں سے گردن میں
 نیم چاند کے حلقے
 چولیوں پہ لہنگوں پر
 زرد زرد منی کے
 زرد بیل بوئے سے
 میلے میلے آٹھل پر
 بالیوں کے بوسے ہیں
 ان کے ہاتھ میں بنیے

گیت گانے لگتے ہیں
 جھوم جھوم کر پودے
 اپنا سر جھکاتے ہیں
 نوجوان لٹھیرے
 کھیت کی منڈیوں پر
 پریم گیت گاتے ہیں
 اے مرے حسین خوابو
 تم انھیں بہاروں کی
 کونپلوں سے پھوٹے ہو
 ایک کار خانے میں
 چند نوجوانوں نے
 انجمن بنائی ہے
 اور اس میں لینن کی
 اک کتاب پڑھتے ہیں
 سن رہی ہیں دیواریں
 ہنس رہی ہے تاریکی
 نوجوان بیٹھے ہیں
 اور کتاب پڑھتے ہیں
 ایک ایک جملے پر
 چونک چونک پڑتے ہیں
 ایک ایک فقرے پر
 اپنا سر ہلاتے ہیں
 گاہ آہ بھرتے ہیں

گاہ مسکراتے ہیں
 میں نے ان کے سینوں میں
 اے مرے حسیں خوابو
 تم کو ناپتے دیکھا
 میں نے تم کو دیکھا ہے
 جب سیاہ محرابیں
 آسمان پہ بنتی ہیں
 جب سکوت کی پریاں
 کہکشاں پہ چلتی ہیں
 گیسوؤں کی کیمت سے
 جب ہوا مہکتی ہے
 جب فضا چمکتی ہے
 میرے گرم ہونٹوں پر
 پیار تھر تھراتے ہیں
 اور میری محبوبہ
 اپنے رنگ عارض سے
 بجلیاں بناتی ہے
 اور میری نظروں میں
 اک جہان بنتا ہے
 اک جہان بنتا ہے
 اک زمین بنتی ہے
 اک زمین آتی ہے

میں اسیر ہوں لیکن
 تم کو کوئی بھی قانون
 قید کر نہیں سکتا
 سر بلند اور آزاد
 یوں ہی مسکرائے جاؤ
 میرے دل کی دنیا میں
 یوں ہی جھگڑائے جاؤ
 قید و بند کے جلاؤ
 تم کو پا نہیں سکتے
 لے لے ظالم ہاتھ
 تم کو چھو نہیں سکتے
 اے مرے حسیں خوابو



شادی کا دن

سفید بادل
 نزلتے آچل
 بلند و بالا حسین نیلا بنوں کے سر سے ڈھلک گئے تھے
 فضا کے چہرے پہ مست ہو کر
 ہزاروں کرنیں بکھر گئی تھیں
 ہرے پھرے چٹ
 روشنی

روشنی کے جھولے

ہوا کی پتلیں
 شریزنجوں کی طرح سے چنبوں کی معصوم کھلکھلاہٹ
 زمین کو نرم گھاس کی ننھی انگلیاں گدگداری تھیں
 یہ دن بہت ہی حسین دن تھا
 جسے تمہارے حسین اقرار عشق نے اور خوبصورت بنا دیا تھا
 یہ دن اسی طرح جج کے پھر آج آگیا ہے
 سفید ہاتھوں سے کوٹھری کی سیہ سلاخوں کو چھو رہا ہے
 وہی تنہم، وہی تمہارا سا شوخ اندازِ دلربائی
 مگر نگاہوں میں وہ پرانی چمک نہیں ہے
 کہ اس کی آنکھوں میں ہلکے ہلکے
 سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں

سنٹرل جیل، ناسک

30 جنوری 1950



جیل کی رات

پہاڑی رات
 اداس تارے، تھکے مسافر
 گھٹانا اندھیرا، سیاہ جنگل
 جہاں سلاخیں اُگی ہوئی ہیں
 اذیتوں کے پرانے عفریت قیدیوں کو نگل رہے ہیں
 نموشی سہی ہوئی کھڑی ہے
 سیاحی اپنے سیاہ دانتوں سے روشنی کو چبا رہی ہے
 اچاٹ نیندوں کے ناگ آنکھوں کو ڈس رہے ہیں
 میں چمد رہا ہوں ہزار کانٹوں سے اپنی بے چین کردلوں میں
 یہ رات بھی کل کی رات کی طرح اپنی سفاکیوں کو لے کر
 افق کے اس پار جا چھپے گی
 مگر مجھے ڈس نہیں سکے گی
 مری نگاہوں میں میری محبوب تیری صورت رچی ہوئی ہے
 یہ چاند میری حسین یادوں کے آسمان پر کھلا ہوا ہے
 ترے تصور سے میرے سینے میں چاندنی ہے

جنوری 1950



تمھاری آنکھیں

تمھاری آنکھیں
 حسین، شفاف، مسکراتی، جوان آنکھیں
 لرزتی پلکوں کی چمنوں میں
 شہابی چہرے پر ابروؤں کی کماں کے نیچے
 تمھاری آنکھیں
 وہ جن کے نظروں کے ٹھنڈے سایے میں میری اُلفت
 مری جوانی کی رات پروان چڑھ رہی تھی
 تمھاری آنکھیں
 اندھیری راتوں میں جوستاروں کی روشنی سے
 فضائے زنداں میں جھانکتی ہیں

میں لکھ رہا ہوں
 تمھاری آنکھیں سفید کاغذ پہ اپنی پلکوں سے چل رہی ہیں
 میں پڑھ رہا ہوں
 تمھاری آنکھیں ہر اک سطر کی بھوؤں کے نیچے لرز رہی ہیں
 میں سو رہا ہوں

تمھاری آنکھیں تمھاری پلکیں کہانیاں ہی سنار ہی ہیں
 میں دوستوں اور ساتھیوں میں گھرا ہوا ہوں
 مسرتوں کے گلاب ہر سمت کھل رہے ہیں
 تمھاری آنکھوں کے پھول گویا مہک رہے ہیں

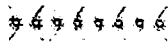
مجھے گرفتار کر کے جب جیل لا رہے تھے پولیس والے
 تم اپنے بستر سے اپنے دل کے
 ادھر رے خوابوں کو لے کے بیدار ہو گئی تھیں
 تمھاری پلکوں سے نیند اب بھی فک رہی تھی
 مگر بچا ہوں میں نفرتوں کے عظیم شعلے بھڑک اٹھے تھے
 تمھاری آنکھیں حقارتوں کے جھنموں کو جگا رہی تھیں
 نظام ظلم و ستم پہ بجلی گر رہی تھیں

مری محبت نے اپنی جنت کا حسن دیکھا
 تمھاری آنکھوں پہ میری نظروں کے پیار بر سے
 مری امیدوں مری تمناؤں نے صدا دی
 یہ نفرتوں کی عظیم مشعل جلائے رکھنا
 کہ یہ محبت کے دل کا شعلہ ہے جس کی رگتیں روشنی میں
 ہمارے خوابوں کے راستے جگمگا رہے ہیں
 تمھاری آنکھیں

جو میرے سینے میں تیرتی ہیں
 کنول کی کلیاں جو میرے دل میں کھلی ہوئی ہیں

انھیں سے دو اور آنکھیں بیدار ہو گئی ہیں
 وہ ننھے ننھے چمکتے ہیروں کی ننھی کنیاں
 جو میری آنکھوں کا نور لے کر تمھارے آنچل سے جھانکتی ہیں
 پھر اور آنکھیں، پھر اور آنکھیں، پھر اور آنکھیں
 یہ سلسلہ تابدار ہے گا
 زمانے کی گود میں ستاروں کے حسن کی ندیاں بہیں گی
 وہ سب تمھاری
 وہ سب ہماری ہی آنکھیں ہوں گی
 ہماری آنکھیں کہ جن سے شعلے برس رہے ہیں
 مگر وہ کل کا حسین دن دیکھو کتنا نزدیک آ گیا ہے
 ہماری آنکھوں سے جب بہاویں چھلک پڑیں گی

جنوری 1950



تجدید وفا

پھول تھے سرخ بہاریں تھیں جواں
وہ مہکتی ہوئی باتیں وہ مہکتے ہوئے ہونٹ
وہ تہسم کہ شفق شرمائے
تقیبے، رانی جس طرح فضا میں ابرائے
جسم پاکیزہ و شاداب و جواں
چاندنی جیسے مجسم ہو جائے

ایسے ہی حسن سے یونان کے فنکاروں نے
اپنی ونس کے تصور کو تراشا ہوگا
ایسے ہی حسن کے چہرے سے تصور لے کر
عہد پارینہ کے نقاشوں نے
اپنے خوابوں کے اچھٹا کو سنوارا ہوگا

وہ سمندر کا کنارہ وہ چمکتی ہوئی ریت
موچیں، پچھلے ہوئے نلیم کی طلسمی پریاں
رقص کرتی ہوئی آتی تھیں ترسے قدموں میں

اور پھر ریت میں کھو جاتی تھیں
 ذہنی شام کے سورج کی سنہری کرنیں
 تیرے کاکل ہرے درخشاں پہ سو جاتی تھیں
 اور ہوائیں ترے آنچل کو ترے شانوں کو
 شق سے چوم کے دیوانی سی ہو جاتی تھیں
 اور میں اپنے رقیبوں پہ ہنسا کرتا تھا

اپنی وارثگی شوق کا عالم ہے وہی
 دل بیتاب وہی دیدہ پر خم ہے وہی

سنٹرل جیل ناسک

جنوری 1950



نیند

(اپنے بچے کی پہلی سالگرہ پر)

رات خوبصورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی

دن کی خشکیں نظریں
کھو گئیں سیاتی میں
آہنی کڑوں کا شور
ہیز یوں کی جھنکاریں
قیدیوں کی سانسوں کی
تند و تیز آوازیں
جیلروں کی بدکاری
گالیوں کی بوچھاریں
بے بسی کی خاموشی
خاموشی کی فریادیں
تہہ نقییں اندھیرے میں
شب کی شوخ دوشیزا

خار دار تاروں کو
 آہنی دھاروں کو
 پار کر کے آئی ہے
 بھر کے اپنے آئیل میں
 جنگوں کی خوشبوئیں
 ٹھنڈکیں پہاڑوں کی
 میرے پاس لائی ہے

نیلگوں جواں سینہ
 نیلگوں جواں بانہیں
 کہکشاں کی پیشانی
 نیم چاند کا جوڑا
 محلیں اندھیرے کا
 پیرہن لرزتا ہے
 وقت کی یہ زلفیں
 خامشی کے شانوں پر
 غم بہ غم مہکتی ہیں
 اور زمیں کے ہونٹوں پر

نرم شبنمی بو سے
 موتیوں کے دانتوں سے

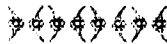
کھلکھلا کے بٹتے ہیں
رات خوابصورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی

رات پیگ لیتی ہے
چاندنی کے جھولے میں
آسمان پر تارے
نخے نخے ہاتھوں سے
بُن رہے ہیں جادو سا
جھینگڑوں کی آوازیں
کہہ رہی ہیں افسانہ
دور جیل کے باہر
بج رہی ہے شہنائی
ریل اپنے پہیوں سے
لوریاں سناتی ہے
رات خوابصورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی
روز رات کو یونہی
نیند میری آنکھوں سے

بیوفائی کرتی ہے
 مجھ کو چھوڑ کر تنہا
 جیل سے نکلتی ہے
 بستی کی بستی میں
 میرے گھر کا دروازہ
 جا کے کھٹکھٹاتی ہے
 ایک ننھے بچے کی
 آنکھوں کے بچپن میں
 میٹھے میٹھے خوابوں کا
 شہد گھول دیتی ہے
 اک حسیں پری بن کر
 لوریاں سناتی ہے
 پانا ہلاتی ہے

سنٹرل جیل تاسک

اپریل 1950



ایک سال

قید کیا چیز ہے، زنداں کی حقیقت کیا ہے؟
 قبر کی گود میں سوئے ہوئے سال
 تیری مسمی ہوئی ٹھنھری ہوئی پرچھائیں پر
 جیل کے بھونکتے کتوں کی صدا روتی ہے
 میں حقارت سے نظر ڈال کے ہنس دیتا ہوں

زہر آلودہ وہ بیٹے ہوئے لمحات کے ڈنک
 خوں میں ڈوبی ہوئی وہ صبح کی تلوار کی دھار
 شام کی آنکھ میں بارود کے کاجل کی لکیر
 اور ہفتوں کے سپاہی وہ مہینوں کے سوار
 جو مرے جوش بغاوت کو کچلنے کے لیے
 فوج در فوج کیا کرتے تھے یلغار اپنی
 میں انھیں بھی ترے پہلو میں سلا آیا ہوں
 پہرہ داروں کی نگاہوں سے ٹپکتا ہے لہو
 رائل کر تی ہے فولاد کے ہونٹوں سے کلام
 گولیاں کرتی ہیں سیسے کی زباں سے باتیں

اور قانون وہ سرمائے کی زنجیر گراں
 علاقے علاقے میں لیے اپنی اینٹا کا فریب
 اپنے دامن کو بڑھاتا ہی چلا جاتا ہے
 نیچل سانپ کی ہر سال بدل جاتی ہے
 مدلل و انصاف مداری کے پتارے جن میں
 تاگ بیٹھے ہیں تو انیس کے پھن پھیلائے
 اور آئین کا بین

اپنی ابروؤں میں پھیلا لیتا ہے
 تلخی زہر میں ڈوبی ہوئی پھنکاروں کو

پھر بھی قربانی و ایثار کا دل زندہ ہے
 جہد و پیکار کی نبضوں کی دھمک جا رہی ہے
 وقت و تاریخ کی راہوں سے گزرتے ہیں جلوس

(2)

چین میں کتنی جواں سال امتوں کا لہو
 ہو گیا صرف نئی صبح کے غارے کے لیے
 اور یونان کی آزاد سیناؤں نے
 کتنے دل فصل بہاراں کے لیے بوئے ہیں
 چشم ابھین سے راتوں کے برستے آنسو
 مضطرب گوہر و شبنم میں بدلنے کے لیے
 ویت نام اور ملایا کے شہیدوں کا لہو
 شفق سرخ کے جلتے ہوئے آئینے میں
 ایک تصویر حسیں بن کے جھلک آیا ہے

خاک برمانے اگائے ہیں وہ شعلے جن میں
 مسکرا نے کے لیے ہیں بیتاب
 چاند سورج کے کنول، فصل بہاراں کے گلاب
 اور تلنگانے کی نظروں سے برستی ہوئی آگ
 دوڑتی ہے خس و خاشاک ناعامی کے لیے
 روج بنگال کے زخموں کو ملی ہیں آنکھیں
 در دو فریاد نے نعروں کی زباں پائی ہے
 گوشتے گوشتے سے اہلتے ہوئے سیلاب کا جوش
 ذرے ذرے سے نکلتے ہوئے انوار کا قص
 موت کا کرب ناعامی کا بھیا تک چہرہ
 جاگتے اور ابھرتے ہوئے انساں کا جلال
 قید کیا چیز ہے زنداں کی حقیقت کیا ہے؟

(3)

روز و شب کیا ہیں
 فقط سببِ نشاںِ راہوں کے
 ماہ اور سال، بجز گردِ سفرِ کچھ بھی نہیں
 جیل ہر گام پہ آتی ہے گزر جاتی ہے
 وادیاں ملتی ہیں غفلت کی، مصیبت کے پہاڑ
 بھوک اور پیاس کے صحراؤں میں دل جلتے ہیں
 خون کے کھولتے دریا میں اہلتی ہے حیات
 گرم سنگینوں کے پر خار بیابانوں میں
 نقشِ پاسرخ لکیروں میں بدل جاتے ہیں
 کارواں منزلِ مقصود کی جانب ہے رواں

نظریں پلکوں سے اٹھاتی ہیں مناظر کے نقاب
خواب جاگ اٹھتے ہیں پہلوں کے گلستاں لے کر

(4)

مجھ کو تنہائی کا احساس نہیں ہے کہ یہاں
کتنی نوخیز ایشیں ہیں مرے ساتھ اسیر
کتنے کہسار کی آغوش کے پالے ہوئے لال
کتنے کھیتوں کے سپوت
کتنے ریلوں کے مشینوں کے چلانے والے
کتنے بوسوں کی مہک، کتنی ہی زلفوں کی شکن
کتنی بہنوں کی امیدوں کے کنول
کتنی ماؤں کی مرادوں کے چراغ
کتنے دریاؤں کے طوفان، ہوا کے جھونکے
کتنی بڑتالوں کے ٹوٹے ہوئے ہاتھ
کتنے احساس بغاوت کے ابھرتے پرچم
جتنے اونچے ہیں مصیبت کے پہاڑ
ہمتیں اتنی ہی بیباک و سرافراز و بلند
حوصلے ہیں کہ ہمالہ کے عقابوں کی اڑان
جن کے شہپر کی بواہرف کی آندھی بن کر
آسمانوں کی بلندی سے گزر جاتی ہے

اور وہ بوڑھے وہ جہاں دیدہ ریت
جھڑیاں جن کی ہیں تاریخ حوادث کے ورق
ہستی آنکھوں کی چمک، ہر دم ہنسم کی شکن

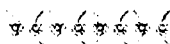
طنز ہے طرز حکومت کی تتم کاری پہ
ان کے بالوں کی سفیدی یہ خبر دیتی ہے
کہ شب تاریک نامی کی حرور نہیں

اور وہ شعلہ نفس شاعر و افسانہ نگار
اپنے نفوس کی حرارت سے گا دیتے ہیں
روح کے بوجھ کو، افکار کی زنجیروں کو
ان کا ہر شعر رجز پڑھتا ہے
برسر کہتی ہے جرأت کی کہانی ہم سے
ان کے ہر لیت سے دل ہلتا ہے دیواروں کا
جیسے بڑھتی ہوئی فوجوں کی دھمک
شعلے آواز کے اس شان سے بوتے ہیں بلند
آگ لگ جاتی ہے زنداں کے یہ خانے ہیں
اور منزل کی جہیں وقت کی محرابوں میں
جگمگا اٹھتی ہے رنگین شعاعوں کی طرح
میرے احساس و تھوڑ کو ہزاروں سورج
لاکھوں چاند اور کروڑوں تارے
رنگ اور نور کی بارش میں بھگو دیتے ہیں

ہم سفر یہ ہوں تو پھر عزم سفر کیا کہنا
رنگ شب یہ ہو تو پھر رنگ سحر کیا کہنا

سنٹرل جیل تاسک

اپریل 1950



زنداں بہ زنداں

(ترکی کے شاعر اعظم ناظم حاکم کے نام)

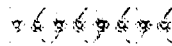
ناظم، اے شاعر آتشِ نفاہ
تو نہیں بیل میں فردوسی و حافظ ہیں اسیر
پابہ زنجیر ہیں ترکی کے عوامی نغمے
بیڑیاں پہنے ہوئے میٹھی ہے زنداں میں بہار

میرے بھائی مرے مشرق کی بہاروں کے سفیر
غم کی گھنگھور گھٹاؤں میں چپکتے ہوئے چاند
صبحِ ترکی کے ابھرتے ہوئے سورج کی کرن
میں نے دس سال ہوئے تیری سی تھی آواز
جو نکال آئی تھی منہ توڑ کے زندانوں سے
آج پھر تیری صدا

حلقہ طوق و سلاسل سے نکل آئی ہے
نرم، جس طرح سے شبنم میں نہائے ہوئے پھول
گرم، ماؤں کی محبت کی طرح
تیز، پھوڑوں میں اترتے ہوئے نشتر کی طرح

تیری آواز گرجتے ہوئے طوفاں کا جال
 تیری آواز کڑکتی ہوئی بجلی کی چمک
 سر بلند اور سر افراز عقاب
 گیہوں اور دھان کے کھیتوں کی طرح سے بھرپور
 ہلکی، اڑتی ہوئی چیز یوں کے پروں کے مانند
 بھاری، توپوں کی طرح
 حشر انگیز نوائی کے جہازوں کی طرح
 پھر بھی پرامن و حسین و شاداب

آج پھر تیری صدا آئی ہے دس سال کے بعد
 انقرہ اور سمرتا کے سید خانوں سے
 اور میں سوچ رہا ہوں اب بھی
 سالہا سال کی تاریکی و تنہائی کے بعد
 تیری للکار کی سطوت ہے وہی
 تیری آواز میں سونے کی کھنک باقی ہے
 ایک بلبل ہے کہ ہے مجھوترنم اب تک
 اس کے سینے میں ہے نغموں کا تالیا طم اب تک



خونیں ہاتھ

یہ وہی ہاتھ ہیں سفاک و دراز
 ہاں وہی ہاتھ ستم پیشہ و چالاک و ذلیل
 میرے پہچانے ہوئے اور ترے پہچانے ہوئے
 وہ جو مغرب کے سید پوش اُفق سے نکلے
 آگ مشرق کی بہاروں میں لگانے کے لیے
 آج بھی میرے حسیں دیں میں بل کھاتے ہیں
 آسچیوں میں چھپا لیتے ہیں ہم ایٹم کے
 خوشے گیہوں کے ہتھیلی پہ بجالاتے ہیں

ہاں وہی ہاتھ کڑکتے ہوئے کوڑوں کی طرح
 زخم ہر پیٹھ پہ ہر جسم پہ برساتے ہوئے
 یا کسی ٹوٹ کے گرتی ہوئی بجلی کی طرح
 باغ پر کھیتوں پہ کھلیانوں پہ لہراتے ہوئے
 ظلم کی طرح نڈر، رات کی مانند طویل
 کوڑھ کی طرح سفید
 خشکیں جیسے جہنم میں دکتی ہوئی آگ

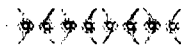
گرم تلواری کے مانند کلجوں پہ رواں
ماؤں کے دودھ بھرے سینوں پہ بیٹھے ہوئے ناگ

کیسے بھولوں کہ وہی ہاتھ وہی سانپ ہیں یہ
ڈس چکے ہیں جو محبت کو تنناؤں کو
جن کی پھنکاروں نے دس گھول دیا پانی میں
جن کی پر چھائیں نے جھلسا دیا صحراؤں کو

ہاں وہی ہاتھ وہی خون میں ڈوبے ہوئے ہاتھ
قتل و غارت کے ارادوں نے جنا ہے جن کو
اسلحہ ساز مشینوں کے تراشے ہوئے ہاتھ
موت کا روپ منافع نے دیا ہے جن کو

آوان ہاتھوں سے میں ہاتھ ملاؤں کیوں کر
اپنی نفرت کو تحارت کو چھپاؤں کیوں کر

تو زرد کاٹ دیا آگ لگا دو ان کو
بن پڑے جیسے بھی گردن سے ہٹا دو ان کو



بھوکی ماں، بھوکا بچہ

میرے ننھے، مرے معصوم، مرے نورِ نظر
 آ کہ ماں اپنے کیجے سے لگا لے تجھ کو
 اپنی آغوشِ محبت میں سلا لے تجھ کو
 تیرے ہونٹوں کا یہ جادو تھا کہ سینے سے مرے
 ندیاں دودھ کی بہہ نکلی تھیں
 چھاتیاں آج مری سو گھٹی ہیں لیکن
 آنکھیں سوکھی نہیں اب تک مرے الال
 درد کا چشمہ پیتا ب رواں ہے ان سے
 میرے اشکوں ہی سے تو پیاس بجھا لے اپنی
 سنتی ہوں بھیتوں میں اب تاج نہیں اُگ سکتا
 کانگریس راج میں سوتا ہی پھلا کرتا ہے
 گائے کے تھن سے نکلتی ہے چمکتی چاندی
 اور تجوری کی درازوں میں سمٹ جاتی ہے

چاند سے دودھ نہیں بہتا ہے
 تارے چاول ہیں نہ گیہوں نہ جوار

ور نہ میں تیرے لیے چاند ستارے لاتی
 مرے ننھے مرے معصوم مرے نورِ نظر
 آ کہ ماں اپنے کیجے سے لگا لے تجھ کو
 اپنی آغوشِ محبت میں سلا لے تجھ کو

سو بھی جا میری محبت کی کلی
 میری جوانی کے گلاب
 میرے افلاس کے ہیرے سو جا
 نیند میں آئیں گی ہنستی ہوئی پر یاں ترے پاس
 بوتلیں دودھ کی شربت کے کُورے لے کر

جانے آواز کی لوری تھی کہ پر یوں کا طلسم
 نیند سی آنے لگی بچے کو
 کھج گئی نیلگوں ہونٹوں پہ خموشی کی لکیر
 منھیاں کھول دیں اور موند لیں آنکھیں اپنی
 یوں ڈھلکنے لگا منکا جیسے
 شام کے غار میں سورج گر جائے

جھک گئی ماں کی جبیں بیٹے کی پیشانی پر
 اب نہ آنسو تھے، نہ سسکی تھی نہ لوری نہ کلام
 ایک سناٹا تھا
 ایک سناٹا تھا تاریک و طویل



آخری رات

کریاں، میز، فانوس، رنگین جاموں کی، لٹش لٹک
بوتلیں

اپنی لمبی سب گردنوں میں چھپائے ہوئے
قیقے، ہچکیاں

اور شرابوں کی رنگت صراحی کے شیشوں پہ بیٹھی ہوئی
سہمی سہمی ہوئی

کور یا کالہو

یا لگی افسردہ کی نگاہوں پہ چھایا ہوا

نوجوانوں کے سینے پلیٹوں میں رکھے ہوئے

ماؤں کی چھاتیاں

تیز کانٹوں کے ناخونوں میں

نخچے، بچوں کے گھر گھر خسار امریکی مٹھریوں کے نیچے

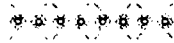
اور سیڑیوں کا دل، جگر

نوک سنگین پر

ہم کے شعلوں میں بھونا ہوا

آنسوؤں کی شراب اور چیخوں کا ٹکیت

آخری رات ہے، آخری دور ہے، آخری جام ہے
 دیکھو کھڑکی کے باہر ذرا جھانک کر
 کوریا کی جواں رات کا جسم بارود کی طرح جلنے لگا
 اور فضاؤں میں سی پول کے چھاپہ ماروں کی آواز
 کی بجلیاں تاج اٹھیں



فیض کے نام

کل تھا جب میں جیل میں تھا
 پتھر کے تابوت کے اندر
 خاموشی کے سر دکن میں
 لیٹے ہوئے تھے نغمے میرے
 کالی سلاخوں کے جنگل میں
 دوستوں کی اور محبوبوں کی
 کھوئی ہوئی تھیں سب آوازیں
 تیرے نغمے ساتھ تھے میرے

اور تیری آواز کی شبنم
 گھانس کے لب تر کر جاتی تھی
 گل کے کنوڑے بھر جاتی تھی
 شام کی رنگت بن کر اکثر
 روئے جہاں پر چھا جاتی تھی
 چاندنی کا لباس پہن کر
 آم اور اٹلی کے پیڑوں پر

تھک کر جیسے سو جاتی تھی
 اور میں تیرے نازک میٹھے
 پیارے گیتوں کا گلدستہ
 اپنے دھڑکتے دل سے لگائے
 خوابوں کی نیلی وادی میں
 آہستہ آہستہ چلتا
 جیل سے باہر آ جاتا تھا
 ظلم کے دل پر چھا جاتا تھا

آج مگر تو قید ہے ساتھی
 کیسی ہے یہ قید کی دنیا؟
 قلب و نظر کی محرومی ہے
 تاریکی اور تنہائی میں
 پتھر کی خاموش ہنسی ہے
 آج ہے جب تو جیل میں تنہا
 میں اپنی آواز کا شعلہ
 اور اپنی لٹکاری بجلی
 گیتوں کے ریشم میں رکھ کر
 تیری خاطر بھیج رہا ہوں
 یہ میری آواز ہے لیکن
 صرف مری آواز نہیں ہے
 جوش، فراق، آئندہ اور بیدی
 عصمت، ساحر، کرشن، اور کیفی
 میری زباں سے بول رہے ہیں
 ہند کے سارے لکھنے والے

تاپنے والے، گانے والے
 اپنی محبت کے کھد سے
 تیری جانب جھنجر ہے ہیں
 جلتی ہوئی یہ شاخ اٹھا لے
 دلچسپ اس میں نیا پھول کھلے ہیں
 شملہ، بجلی، نغمہ بن کر
 کچھڑے سا تھی آن ملے ہیں
 دور ہے گو لاہور کی ہستی
 اونچی زنداں کی دیواریں
 اب جھوٹے آئین کی سرحد
 تہا بنگل، جلتا پریت
 دل اور روح کے سچ میں حائل
 پھر بھی کوئی دیوار نہیں جو
 زخموں کو تقسیم کرے گی

میرے ہاتھ میں ہاتھ ہے تیرا
 تیرے ہاتھ میں ہاتھ ہے میرا
 سانس کا زیرہ ہم ہے یکساں
 ہم آہنگ ہے چپ قدم کی
 ایک ہی جادہ ایک ہی منزل
 ایک ہی لیلیٰ ایک ہی مہمل
 ایک ہی مقصد ایک ہی حاصل
 میٹھا رہے راوی کا پانی
 ٹھنڈی رہیں گنگا کی لہریں
 گائے کے تھن سے دودھ کی دھاریں

ساون بھا دوں بن کر برسیں
 سبز رہیں کھیتوں کے آنچل
 بجتی رہے بادل کی چھاگل
 دل میں ہوک نہ اٹھنے پائے
 پیٹ میں ہوک نہ اٹھنے پائے
 گیہوں کا ہر خوشہ سر پر
 زریں تاج پہن کر آئے
 ماؤں کے سینے دودھ سے چھلکیں
 بنستی رہیں بچوں کی پلکیں
 زلفوں کے گہرے سایے میں
 رنگ برنگے آویزوں کے
 ننھے ننھے جگنو چمکیں
 چولھے دہلیں، روٹیاں مہکیں
 شاخیں لہکیں، چڑیاں چمکیں
 باہیں کھنکیں، چوڑیاں گامیں
 شانوں پہ آنچل ہر امیں
 امن و اماں کا جشن منائیں

اپنا مقصد ایک ہے ساتھی
 اس مقصد کے آگے سارے
 ظالم، دشمن، ذاکو، قاتل
 سب سے ہیں گھبرائے ہوئے ہیں
 بستی بستی، جنگل جنگل
 ظلم کے بادل چھائے ہوئے ہیں
 زنجیروں کے کالے حلقے

ناگ ہیں پھن پھیلانے ہوئے ہیں

ظلم سے لیکن ڈرنا کیسا
 موت سے پہلے مرنا کیسا
 'بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
 بول زباں اب تک تیری ہے'
 بول کہ کس قاتل کا دامن
 خون بہاراں سے رنگیں ہے
 کس کی گردن میں ڈال کے
 سونے کی زنجیر پڑی ہے
 کس نے امریکا کے ہاتھوں
 خاک وطن کو بیچ دیا ہے
 بیٹی اور بہن کے آنچل
 ماں کے کفن کو بیچ دیا ہے
 کون ہے جو جنگی شعلوں میں
 پاکستان کو جھونک رہا ہے
 کون ہے جو اقبال کے دل میں
 ظلم کی کیلیں ٹھونک رہا ہے
 شاعر کی آواز کو کس کا
 خمیں پنچہ گھونٹ رہا ہے
 رشتم کے رومال میں کس کے
 رنگ لہو کا چھوٹ رہا ہے
 جیلوں کی دیوار میں یہ کون
 انسانوں کے دل خٹکتا ہے
 کون ہے جو قانون سے اپنے

مکڑی کا جالا بنتا ہے
 کون اجالے سے خائف ہے
 کون انسانوں سے ڈرتا ہے
 سورج کی کرنوں سے ہراساں
 جتنا کی نظروں سے پریشاں
 کس نے عدالت کا دروازہ
 سنگینوں سے روک دیا ہے
 یہ کس نے انصاف کے منہ میں
 ظلم کا کپڑا ٹھونس دیا ہے

'بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
 بول زباں اب تک تیری ہے
 تیرا ستواں جسم ہے تیرا
 بول کہ جاں اب تک تیری ہے'

اپریل 1951

}}{}}{

سجاد ظہیر کے نام

مجھے یقین ہے کہ زنداں میں بھی ایوں پہ تیرے
وہ موج نور وہ ہلکا سا اک تبسم ہے
تری حیات سہی نفرتوں کے گھیرے میں
تری نظر میں محبت بھرا تکلم ہے

مجھے یقین ہے کہ زنداں میں بھی خیال ترا
بنا رہا ہے نئے آدمی کی تصویریں
نیا سماج، نئی زندگی، نئی تہذیب
پہنائی جاتی ہیں جس کو ہزار زنجیریں

کھڑی ہوئی ہے ترے سر پہ موت یوں آکر
کہ تو حیات کے پیغمبروں کا رہبر ہے
خزاں کو تیرے گلستانِ زندگی کی تلاش
کہ تیرے سینے میں دل، دل میں اک گل تر ہے

اندھیرا تجھ سے فغا ہے کہ اس کے سینے پر
تجھے چراغِ جلا نے کی آرزو کیوں ہے
بگڑ گئے ہیں لبو کے تمام بیوپاری
کہ تجھ کو امن و محبت کی جستجو کیوں ہے

ہیں قصر چیں بہ جبیں دانت پیٹے ہیں محل
 کہ تیرے خواب ہیں بد حال جمو نہڑوں کے لیے
 ہیں جنگ باز ترے گرم خون کے پیاسے
 کہ تو سکون کا پیغام ہے دلوں کے لیے

یزید و شمر کو قتلِ حسینؑ کی ہے فکر
 وہ ارضِ پاک کو بھی کر بلا بنا دیں گے
 ترا یہ عہد کہ انسانیت کی محفل سے
 شگروں کا رواج ستم اٹھا دیں گے

انہیں یہ فکر کہ ماؤں کی تھڑیاں بک جائیں
 تجھے یہ فکر کہ بہنوں کے سر پہ چادر ہو
 انہیں یہ فکر کہ زخموں سے چور چور ہوں دل
 تجھے یہ فکر کہ دنیا گلوں کا منظر ہو

انہیں یہ فکر کہ تیغ و تفنگ کا ہو عروج
 تجھے یہ فکر کہ ہو خجروں کی رسوائی
 انہیں یہ فکر کہ بارود کا اندھیرا چھائے
 تجھے یہ فکر کہ پھیلے شفق کی رعنائی

انہیں یہ فکر کہ راتیں طویل ہو جائیں
 تجھے یہ فکر کہ رجب سحر نکھر آئے
 انہیں یہ فکر کہ ٹھہر جائے گردشِ ایام
 تجھے یہ فکر کہ سیلابِ غم گزر جائے

جلاڑ سکی نہ ارادوں کو تیرے جب زنجیر
تو قاتلان کہن آگئے رن لے کر
ترے لیے ہی نہیں ارض پاک کے بھی لیے
وہ آج پلٹے ہیں امریکہ سے کفن لے کر

مگر زمانے کے تیور کچھ اور ہیں، یہ رن
کہیں انھیں کے گلوں کی رن نہ بن جائے
وہ عصر نو کے لیے لے کے آئے تو ہیں کفن
یہ قاتلوں کا خود اپنا کفن نہ بن جائے

تری بلندی فکر و نظر کا کیا کہنا
وہ دیکھ پست ہوئی جا رہی ہیں دیواریں
ہم اپنے دل کی محبت سے ڈھانپ لیں گے تجھے
ستم کے ہاتھ سے ہم چھین لیں گے تلواریں

میں پڑھ رہا ہوں کلعابہ جبین وقت پہ کیا
زمانہ تجھ سے ہی انسان کے انتظار میں ہے
ہے تیرے دل میں بہاراں کی آرزو لیکن
تو آرزو کی طرح خود دل بہار میں ہے

مئی 1951



یلغار

(پرتھوی راج کپور کے نام)

ہم آج یلغار کر رہے ہیں

تمام جنگوں کے مورچوں پہ حیات کا وار کر رہے ہیں

ہم آج یلغار کر رہے ہیں

ہماری عید آگئی ہے، عالم میں جشن امن و اماں منائیں

پیاس کو قتل کر دیں، صدیوں کی بھوک کو قبر میں سلائیں

برہنگی کے پرانے لاشے کو آؤ مل کر کفن پہنائیں

سنوار دیں مانگ زندگی کی، زمیں کو اپنی، دلہن بنائیں

چلو کہ دنیا کے منپلوں کی برات تیار کر رہے ہیں

ہم آج یلغار کر رہے ہیں

اب آؤ دنیا سے زرگری کا نظام ظلم و ستم منادیں

جوار تقا میں ہماری حائل ہیں توپ خانے انہیں ہٹا دیں

نگاہ کی بجلیوں سے بارود کے خزانوں کا دل جلا دیں

بجھا دیں خوں کے چراغ، محفل سے جام زہر اب غم اٹھا دیں

ہمیں ہے جیون سے پیار، مرنے سے صاف انکار کر رہے ہیں

ہم آج یلغار کر رہے ہیں

فضائیں مسموم ہو گئیں کر تو جنبشِ بال و پر نہ ہوگی
 زمانہ تلخی زہر پی لے تو زیست شیر و شکر نہ ہوگی
 لہو کی بوندوں کی مسکراہٹ میں آب و تاب گہر نہ ہوگی
 سیاہ بارود کے اندھیرے سے زندگی کی سحر نہ ہوگی
 سپاہیوں اور تباہیوں کی صفوں سے پیکار کر رہے ہیں
 ہم آج یلغار کر رہے ہیں

قریب ہے منزل تمنا تو پاؤں اپنے بہک رہے ہیں
 رگوں کے اندر خوشی سے بیتاب خوں کے قطرے چمک رہے ہیں
 سنہرے چہرے دک رہے ہیں سفید ماتھے دک رہے ہیں
 ہزار ہا سال کے دبے زخم آج پھر سے بہک رہے ہیں
 ہم اپنے سینوں کو اپنے دل کے لہو سے گلزار کر رہے ہیں
 ہم آج یلغار کر رہے ہیں

کہاں ہیں لاؤ ہماری نازک مزاج سارنگیاں کہاں ہیں
 سرود اور دلربا کی آواز کی حسیں تتلیاں کہاں ہیں
 ستار کے تار میں لرزتی ہوئی جواں بجلیاں کہاں ہیں
 ہمارے طلبوں کے بول کی دلنواز سرمستیاں کہاں ہیں
 ہم اپنی تہذیب کی حفاظت کا دل سے اقرار کر رہے ہیں
 ہم آج یلغار کر رہے ہیں

مکان، محلات، قصر، ایوان، قطار اندر قطار آئیں
 کہو سفید اور سرخ پتھر کی صورتوں سے کہ مسکرائیں
 کہو چراغوں سے اور چہروں کے آفتابوں سے جگمگائیں
 لڑائی کی آندھیوں کی زد پر حیات کی شمع نو جلائیں
 ہم آج ہر رنگ، ہر صدا، ہر ادا کو، ہشیار کر رہے ہیں
 ہم آج یلغار کر رہے ہیں

یہی تو ہے وقت اپنے سینے کی ساری بیتابیاں جگا دو
 جو خواب راحت میں ہیں اجنتا کی نیلی شہزادیاں جگا دو
 پرانے ہندوستان کی دلفریب رنگینیاں جگا دو
 جگا دو تہذیب اور تمدن کی ساری آبادیاں جگا دو
 یہی تو ہے وقت رقص و نغمہ پہ ہم جو اصرار کر رہے ہیں
 ہم آج یلغار کر رہے ہیں
 زمیں سے سنگیت کی اٹھو گنگنا تے گاتے رباب لے کر
 تخیل و شاعری کے عرش بریں سے اتر و کتاب لے کر
 نگار خانے سے حسن کے آؤ رقص کرتا شباب لے کر
 نکل پڑو عارضوں کی سرخی، نگاہ کی آب و تاب لے کر
 نزاکتوں اور لطافتوں کا غرور بیدار کر رہے ہیں
 ہم آج یلغار کر رہے ہیں
 بہار کی فصل ہے نہال مراد بے برگ و بار کیوں ہو؟
 قرار ممکن ہے جب زمانے میں پھر کوئی بیقرار کیوں ہو؟
 اگر ہو آباد اپنا پہلو تو شکوہ جو ریا کیوں ہو؟
 بھرے ہوئے میکدے میں کوئی ستم کش انتظار کیوں ہو؟
 چڑھائے سان اپنی پیاس کو ہم بھی آج تلوار کر رہے ہیں
 ہم آج یلغار کر رہے ہیں
 زمیں کے دل میں ہماری تشنہ لبی کے شعلے دے ہوئے ہیں
 چمن چمن اپنی خوں شدہ آرزو کے غنچے کٹے ہوئے ہیں
 اداس راہوں پہ بے کفن حسرتوں کے لاشے پڑے ہوئے ہیں
 قدم قدم پر ہماری ناکامیوں کے لشکر کھڑے ہوئے ہیں
 ہم اپنے لشکر کو لے کے دشمن پر آخری وار کر رہے ہیں
 ہم آج یلغار کر رہے ہیں

وہ لائیں اپنے سید ارادے ہم اپنے دل کی اسنگ لائیں
 ہم اپنے لوح و قلم نکالیں، وہ اپنے تیغ و تفنگ لائیں
 ہم اپنے بربط کے تار چھیڑیں وہ شورشِ رعد جنگ لائیں
 ہم اپنے زخموں کے گل کھلائیں، وہ خونِ ناحق کا رنگ لائیں
 لہو میں بہہ جائیں گے وہ سب جولوہ کا بیو پار کر رہے ہیں
 ہم آج یلغار کر رہے ہیں

ہمارے گیتوں کی لے نے دنیا میں کارِ شمشیر بھی کیا ہے
 ہمارے لفظوں کے شہد و شہنشاہ نے آتشیں جام بھی پیا ہے
 ہماری نظروں نے زندگانی کا چاکِ قلب و جگر سیا ہے
 ہماری ٹھوکرنے آسمان و زمیں کا محور بدل دیا ہے
 ہم آج تبدیلی نظام کہن پر اصرار کر رہے ہیں
 ہم آج یلغار کر رہے ہیں

ہماری زد میں ہر ایک شے ہے زمیں سے تاروں کی انجمن تک
 ہماری پروازِ فکر ہے بجلیوں سے کرنوں کے بانگین تک
 ہمارے نقشِ قدم کی گلاکاریاں ہیں ویرانوں سے چمن تک
 ہماری تخلیق کا کرشمہ ہے سوت کے تار سے کفن تک
 کہ یہ بھی اک فن ہے جنگِ بازوں کی قبر تیار کر رہے ہیں
 ہم آج یلغار کر رہے ہیں

نہ ہٹری ہی رہے گی باقی یہاں نہ اب قیصری رہے گی
 فریب کی ساحری نہ اہل ہوس کی جادوگری رہے گی
 نہ جنگ کی زرگری رہے گی نہ ظلم کی قاہری رہے گی
 بس ایک محنت کی داوری اور فن کی پیغمبری رہے گی
 ازل سے ہم تار و دل سے پیدا اب کی جھکار کر رہے ہیں
 ہم آج یلغار کر رہے ہیں

ہمیں نے پکڑا ہے بکلیوں کو ہمیں نے ایٹم کے دل کو چیرا
 ہمارے خونِ جگر کے رنگِ شفق سے تہذیب کا سویرا
 ہمیں نے دھاتوں کی نبض پر کبھی ہمیں نے ذروں کا دل ٹٹولا
 ہمیں نے جنبشِ کاسن دیکھا، ہمیں نے پہیوں کو رقصِ بخشا
 قوائے فطرت کو دامِ حکمت میں ہم گرفتار کر رہے ہیں
 ہم آج یلغار کر رہے ہیں
 زمیں کی گردش سے آسمانوں کی گردشوں نے بھی ہار مانی
 شکار کر لی ہے دور بینوں نے ماہ و مریخ کی جوانی
 تڑپتے ہاتھوں کی کار سازی میں جیسے دریاؤں کی روانی
 بشر کے ذہنِ رسا میں تخلیقِ حسن کا سوزِ جاودانی
 ہماری عظمت کا آج ارض و سما بھی اقرار کر رہے ہیں
 ہم آج یلغار کر رہے ہیں
 کسی نے جادو سا کر دیا ہے بدل گیا اس طرح نظارا
 سے نے لی اک نئی جو کر وٹ تو زندگی ہو گئی گوارا
 پکھل کے فولاد اور توپوں نے کارخانوں کا روپ دھارا
 ہے چنیوں کا دھواں بھی پر بیج کا کلوں کی طرح دل آرا
 یہ معجزے ہیں ہمارے ہاتھوں کے ہم جنھیں پیار کر رہے ہیں
 ہم آج یلغار کر رہے ہیں
 جو برف زاروں میں ندیاں سورہی تھیں اپنا جمال لے کر
 وہ ریگزاروں کی ست آتی ہیں آرزوئے وصال لے کر
 وہ کھیتیاں ہنس رہی ہیں گودی میں حاصل ماہ و سال لے کر
 میں آ گیا ہوں خراجِ تحسین و شاعرانہ خیال لے کر
 کھلا کے لاکھوں چین زمیں پر فضا کو گزار کر رہے ہیں
 ہم آج یلغار کر رہے ہیں

رگوں سے انہور کی چٹکتا ہے سرخ افشردہ جوانی
سیاہ آنکھیں گلابی ڈوروں سے بن گئیں جامِ ارغوانی
دہن کے لعل و گہر غزانوں پہ اک جسم کی پاسبانی
دلوں کی آزاد مملکت پر فقط نگاہوں کی حکمرانی
کہ شیطنت کی حکومتوں سے دلوں کو بزار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

وہ قدمِ زوں وہ جسمِ رحمتا کشیدہ قامتِ ستار جیسے
لرزتے پیراہنوں میں رنگِ بدن چمن میں بہار جیسے
بسی ہوئی بستیاں حسینوں سے دل میں تصویرِ یار جیسے
ہجومِ سڑکوں پہ گا رہے ہیں پہاڑ پر آبشار جیسے
قدیم ویرانوں میں نئی بستیوں کو بیدار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

نسیمِ شیراز زلفِ بنگال کی گھٹاؤں سے کھیلتی ہے
ہوا بخارا کی ہے جو کشمیر کی ہواؤں سے کھیلتی ہے
نگاہِ دہلی نگارِ جیس کی حسیں اداؤں سے کھیلتی ہے
صدائے پٹنن¹ نوائے حافظِ مری نواؤں سے کھیلتی ہے
اسیر اب تک تھیں جن میں قومیں وہ سرحدیں پار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

ہمارے عطرِ حنا کی خوشبو سے ارضِ پیرس بسی ہوئی ہے
ہمارے دامن میں چین کے چادلوں کی چاندی بھری ہوئی ہے
ترنہ پتی راوی کی موج سے آج موجِ گنگا ملی ہوئی ہے
نوائے اقبال مصر و ایران کی شاخِ گل پر جھکی ہوئی ہے
فضائیںِ خونبار تھیں جہاں کی ہم ان کو گلبار کر رہے ہیں
ہم آج یلغار کر رہے ہیں

فضاؤں میں میٹھ دوت¹ اڑتے ہیں ہلکی دل کا پیام لے کر
 ہماری ٹھنڈی ہوائیں جاتی ہیں ہندوؤں کا سلام لے کر
 کتابیں محو سفر ہیں نیگور و بھارتی کا کلام لے کر
 ہم آج اٹھے ہیں دل کے پیالے اور محبت کے جام لے کر
 پلا کے تہذیب و امن کی سڑک جہاں کو سرشار کر رہے ہیں
 ہم آج یلغار کر رہے ہیں

XXXXX

میٹھ دوت سے مراد بادل ہیں اور یہ کالی داس کی مشہور نظم کا نام ہے۔

متفرقات

اب آگیا ہے جہاں میں تو مسکراتا جا
چن کے پھول، دلوں کے کنول کھلاتا جا

عدم حیات سے پہلے عدم حیات کے بعد
یہ ایک بل ہے اسے جاوداں بناتا جا

بھٹک رہی ہے اندھیرے میں زندگی کی برات
کوئی چراغ سر رہ گزر جلاتا جا

گزر چن سے مثال نسیم صبح بہار
گلوں کو چھیڑ کے کانوں کو گدگداتا جا

رہ دراز ہے اور دور شوق کی منزل
گراں ہے مرحلہ عمر گیت گاتا جا

بلا سے بزم میں گر ذوقِ نفسی کم ہے
نوائے تلخ کو کچھ تلخ تر بناتا جا

جو ہو سکے تو بدل زندگی کو خود درند
 نژادِ نو کو طریقِ جنوں سکھاتا جا
 دکھا کے جلوۂ فردا بنا دے دیوانہ
 نئے زمانے کے رُخ سے نقاب اٹھاتا جا
 بہت دنوں سے دل و جاں کی محفلیں ہیں اداس
 کوئی ترانہ کوئی داستان سنا تا جا

☆☆☆

کم نکاہوں کو میں اعزازِ نظر دیتا ہوں
 بے سحر رات کو بھی رنگِ سحر دیتا ہوں
 بدگماں مجھ سے خزاں ہے تو خدا دیرانے
 آمدِ فصلِ بہاراں کی خبر دیتا ہوں

☆☆☆

اک جوئے دردِ دل سے جگر تک رواں ہے آج
 پگھلا ہوا رگوں میں اک آتشِ فشاں ہے آج
 سینے میں ایک فعلۂ ہوالہ کی لپک
 آنکھوں میں شامِ مرگ جواں کا دھواں ہے آج
 لبِ سی دیے ہیں تا نہ شکایت کرے کوئی
 لیکن ہر ایک زخم کے منہ میں زباں ہے آج
 تاریکیوں نے گھیر لیا ہے حیات کو
 لیکن کسی کا روئے حسیں درمیاں ہے آج

جینے کا وقت ہے یہی مرنے کا وقت ہے
 دل اپنی زندگی سے بہت شادماں ہے آج
 منزل کو چوم لیتی ہے اٹھ کر نگاہ شوق
 کیا تیز کام جہش عمر رواں ہے آج
 ہنگام سرکشی ہے بغاوت کا وقت ہے
 ہر لمحہ حیات بشر جاوداں ہے آج
 ہر پائے سر فردش مری سجدہ گاہ ہے
 ہر نقش خون سرخ مرا آستان ہے آج
 ہو جاتا ہوں شہید ہر اہل وفا کے ساتھ
 ہر داستان شوق مری داستان ہے آج
 آئے ہیں کس نکلا سے ہم قتل گاہ میں
 زخموں سے دل ہے چور نظر کلفشاں ہے آج
 زندانیوں نے توڑ دیا قلم کا غرور
 وہ دہدہ وہ رعب حکومت کہاں ہے آج

سنٹرل جیل ناسک 1949
 سیاسی قیدیوں پر فائرنگ کے بعد



عشق کا نغمہ جنوں کے ساز پر گاتے ہیں ہم
اپنے غم کی آغج سے ہنجر کو پھلاتے ہیں ہم

جاگ اٹھتے ہیں تو سولی پر بھی نیند آتی نہیں
وقت پڑ جائے تو انگاروں پہ سو جاتے ہیں ہم

زندگی کو ہم سے بڑھ کر کون کر سکتا ہے پیار
اور اگر مرنے پہ آجائیں تو مرجاتے ہیں ہم

دُفن ہو کر خاک میں بھی دُفن رو سکتے نہیں
لالہ و گل بن کے ویرانوں پہ چھا جاتے ہیں ہم

ہم کہہ کرتے ہیں چمن میں اہتمامِ رنگ و بو
روئے کیمتی سے نقابِ حسن سرکاتے ہیں ہم

عکس پڑتے ہی سنور جاتے ہیں چہرے کے نقوش
شبلیہ بستی کو یوں آئینہ دکھلاتے ہیں ہم

میکھوں کو مژدہ، صدیوں کے پیاسوں کو نوید
اپنی محفل اپنا ساتی لے کے اب آتے ہیں ہم



تمہارے اعجازِ حسن کی میرے دل پہ لاکھوں عنایتیں ہیں
تمہاری ہی دین میرے؛ وقتی نظر کی ساری لطافتیں ہیں

جواں ہے سورج، جہیں پہ جس کے تمہارے ماتھے کی روشنی ہے
حجرِ حسین ہے کہ اس کے رخ پر تمہارے رخ کی صبا تیں ہیں

میں جن بھاروں کی پرورش کر رہا ہوں زندانِ غم میں ہدم
کسی کے گیسو و چشم و رخسار و لب کی رنگیں حکایتیں ہیں

نہ جانے چھلکائے جام کتنے، نہ جانے کتنے سیوا چھالے
مگر مری تفتش کہ اب بھی تری نظر سے شکایتیں ہیں

میں اپنی آنکھوں میں سیلِ اشک رواں نہیں بجلیاں لیے ہوں
جو سر بلند اور غیور ہیں اہلِ غم یہ ان کی روایتیں ہیں

میں رات کی گود میں ستارے نہیں شرارے بکھیرتا ہوں
بحر کے دلی میں جواپنے اشکوں سے پور ہا ہوں بغاوتیں ہیں

یہ شاعری عصرِ نو کی جغیری، زمانے کی داوری ہے
لیوں پہ میرے صحیفۂ انقلاب کی سرخ آیتیں ہیں





آندھیاں چلتی رہیں افلاک تھراتے رہے
اپنا پرچم ہم بھی طوفانوں میں لہراتے رہے

کاٹ کر راتوں کے پریت مصر نو کے تیشہ زن
جوئے شیر و چشمہ نور سحر لاتے رہے

کاروانِ ہمتِ جمہور بڑھتا ہی گیا
شہریار و حکمران آتے رہے جاتے رہے

رہبروں کی بھول تھی یا رہبری کا مدعا
قافلہ کو منزلوں کے پاس بھٹکاتے رہے

جس قدر بڑھتا گیا ظالم ہواؤں کا خروش
اس کے کاگل اور بھی عارض پہ لہراتے رہے

پھانسیاں اُگتی رہیں زنداں ابھرتے ہی رہے
چند دیوانے جنوں کے زمرے گاتے رہے





محبت اک تڑپ ہے آرزو اک کیفیت دل کی
تری آنکھوں میں آکر جاوداں معلوم ہوتی ہے

قدم رکستے نہیں ہیں جاوہ راو حمتا میں
کہ ناکامی بھی اک سبک نشاں معلوم ہوتی ہے

کہیں بجلی گرے وہ اپنا گلشن ہو کہ اوروں کا
مجھے اپنی ہی شاخ آشیاں معلوم ہوتی ہے

جہاں کل میرے خون دل کی بوندوں کی تراوش تھی
وہی خاک آج رکب گلستاں معلوم ہوتی ہے

حکایت دل کی کیا دارو رسن کی اک کہانی ہے
قدو گیسو کی لیکن داستاں معلوم ہوتی ہے





وطن سے دور یارانِ وطن کی یاد آتی ہے
 قفس میں ہم نولیاں چمن کی یاد آتی ہے

یہ کیسا ظلم ہے پھر سایہ دیوارِ زنداں میں
 وطن کے سایہ سر و سخن کی یاد آتی ہے

ملاقاتوں سے پہلے اور ملاقاتوں کے بعد اکثر
 کسی کے رنگ و بوئے پیرہن کی یاد آتی ہے

تصور جس سے رنگیں چے تخیل جس سے رقباں ہے
 غزال ہند و آہوئے سخن کی یاد آتی ہے

کبھی لیلیٰ و شیریں، گاہ ہیر و سہنی بن کر
 زالے یار کی، بایکے چمن کی یاد آتی ہے

کہاں کا خوفِ زنداں، دہشتِ دار و رن کیسی
 قدِ معشوق و زلفِ پُر شکن کی یاد آتی ہے





مستی زندانہ ہم۔ سیرابی میخانہ ہم
گردش تقدیر سے ہیں گردش پیمانہ ہم

خونِ دل سے چشمِ تر تک، چشمِ تر سے تاجِ خاک
کر گئے آخر گل و گلزار ہر ویرانہ ہم

کیا بلا جبر اسیری ہے کہ آزادی میں بھی
دوش پر اپنے لیے پھرتے ہیں زنداں خانہ ہم

راہ میں فوجوں کے پہرے سر پہ تلواروں کی چھاؤں
آئے ہیں زنداں میں بھی با شوکت شاہانہ ہم

مٹنے مٹنے دے گئے ہم زندگی کو رنگ و نور
رفتہ رفتہ بن گئے اس عہد کا افسانہ ہم

یا چکا دیتے ہیں ہاتھوں کے دلوں میں سیکدے
یا بنا لیتے ہیں مہر و ماہ کو پیمانہ ہم

قید ہو کر اور بھی زنداں میں اڑتا ہے خیال
قص زنجیروں میں بھی کرتے ہیں آزادانہ ہم





فوہ شوق کی رنگیں حکایتیں مت پوچھ
 لیوں کا پیار، نگہ کی شکایتیں مت پوچھ
 کسی نگاہ کی نس نس میں تیرے نشتر
 وہ ابتدائے محبت کی راحتیں مت پوچھ
 وہ نیم شب، وہ جواں حسن، وہ فوہ نیاز
 نگاہ و دل نے جو کی ہیں عبادتیں مت پوچھ
 جھوم غم میں بھی جینا سکھا دیا ہم کو
 غم جہاں کی ہیں کیا کیا عادتیں مت پوچھ
 یہ صرف ایک قیامت ہے چین کی کروٹ
 دہلی ہیں دل میں ہزاروں قیامتیں مت پوچھ
 بس ایک حرف بغاوت زباں سے نکلا تھا
 شہید ہو گئیں کتنی روایتیں مت پوچھ
 اب آج قصہ دارا و جم کا کیا ہو گا
 ہمارے پاس ہیں اپنی حکایتیں مت پوچھ
 نشانِ بظری و قیصری نہیں ملتا
 جو عبرتوں نے لکھی ہیں عبارتیں مت پوچھ
 نشانِ زیت فقط اہل غم کی ہے میراث
 ملیں گی اور ابھی کتنی دو تیس مت پوچھ



دل کی آگ جوانی کے رخساروں کو دہکائے ہے
بچے پسینہ کھڑے پر یا سورج پگھلا جائے ہے

من اک نہا سا بالک ہے ہمک ہمک رہ جائے ہے
دور سے گلہ کا چاند دکھا کر کون اسے لپکائے ہے

سے ہے تیری آنکھوں میں اور مجھ پہ نشہ ساطاری ہے
نہند ہے تیری پلکوں میں اور خواب مجھے دکھلائے ہے

تیرے قامت کی لرزش سے موج سے میں لرزش ہے
تیری نگہ کی مستی ہی پیانوں کو پھلاکائے ہے

تیرا درد سلامت ہے تو مرنے کی امید نہیں
لاکھ دکھی ہو، یہ دنیا رہنے کی جگہ بن جائے ہے





زمیں کے سینے میں جذب ہو کر رہا نہ خونِ وفا شعاراں
 کھلے جو غنچے ہنسی جو کلیاں تو مسکرائے رخ نگاراں
 فضا کے پہلو میں کھل کے انگڑائی لی شفق رنگ پر چوں نے
 صدائیں آئیں کہ ہو رہی ہے سحر شب تیرہ روزگاراں
 دعائیں دیتی ہے چین کی فوج کو شکستہ دلوں کی دھڑکن
 یہ لشکرِ انقلاب پرچم ہے لشکرِ ابرمن شکاراں
 یہ کس نگارِ بہار پیکر نے اپنا دامن جھٹک دیا ہے
 مہک رہے ہیں چمن ہزاروں، چمن چمن رنگِ نو بہاراں



عطرِ فردوسِ جواں میں یہ بسائے ہوئے ہونٹ
 خونِ گہرنگِ بہاراں میں نہائے ہوئے ہونٹ
 خود بخود آہ لرزتے ہوئے بوسوں کی طرح
 میرے ہونٹوں کی لہافت کو جگائے ہوئے ہونٹ
 دستِ فطرت کے تراشے ہوئے دو برگِ گلاب
 دل کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو بنائے ہوئے ہونٹ
 ظلم اور جبر کے احکام سے خاموش مگر
 مہرِ پیانِ محبت کی لگائے ہوئے ہونٹ





وہ مری دوست وہ ہمدرد وہ غمخوار آنکھیں
 ایک مضموم محبت کی گنہگار آنکھیں
 شوخ، شاداب وحسیں، سادہ و پرکار آنکھیں
 مست، سرشار، جوان بیخود و ہشیار آنکھیں
 ترجمہ نظروں میں وہ ابھی ہوئی سورج کی کرن
 اپنے ذریعہ اشاروں میں گرفتار آنکھیں
 جہشِ ابرو، مٹکالے خنک سائے میں
 آتش افروز، دنوں نیز، شر بار آنکھیں
 کیفیہ دل کی سناتی ہوئی ایک ایک نگاہ
 بے زباں ہو گئے ہی وہ مائل گفتار آنکھیں
 موسم گل میں وہ اڑتے ہوئے بھنوروں کی طرح
 خنجرِ دل پہ وہ کرتی مٹی یلغار آنکھیں
 کبھی چٹکی ہوئی تیرے کٹورے کی طرح
 اور کبھی زہر میں ڈوبی ہوئی تموار آنکھیں
 کبھی ٹھہری ہوئی رخِ بستہ نمود کی جھیلیں
 کبھی سہا ہوا، مٹا ہوا اک پیار آنکھیں

کبھی جھٹکتے ہوئے بادل کبھی گرتی بجلی
کبھی اٹھتی ہوئی آمادہ پیکار آنکھیں

نوکِ ابد میں کبھی تلخی انکار لیے
کبھی گھولے ہوئے شیرینی اقرار آنکھیں

آج میں اپنی جوانی کی سلتی چٹون
ہنیمِ اشک میں دھوئی ہوئی گلزار آنکھیں

حسن کے چاند سے کھڑے پہ چمکتے تارے
بائے آنکھیں وہ حریفِ لب و رخسار آنکھیں

عشوہ و غمزہ و انداز و ادا پر نازاں
اپنے پندارِ جوانی کی پرستار آنکھیں

روح کو روگِ محبت کا لگا دیتی ہیں
صحبتِ دل جو عطا کرتی ہیں بیمار آنکھیں

صحنِ زنداں میں ہے پھر رات کے تاروں کا جہوم
شمع کی طرح فروزاں سرِ دیوار آنکھیں



☆☆☆

اردو

ہماری پیاری زبان اردو
 ہماری نغموں کی جان اردو
 حسین، دلکش جوان اردو
 زبان وہ دھل کے، جس کو گدگا کے جل سے پاکیزگی ملی ہے
 اودھ کی ٹھنڈی ہوا کے جھوٹوں سے جس کے دل کی کلی کھلی ہے
 جو شعر و نغمہ کے خلد زاروں میں آج کوئی سی کوکتی ہے

اسی زباں میں ہمارے بچپن نے ماؤں سے لوریاں سنی ہیں
 جوان ہو کر اسی زباں میں کہانیاں عشق نے کہی ہیں
 اسی زباں کے چمکتے بیروں سے علم کی جھولیاں بھری ہیں

اسی زباں سے وطن کے ہونٹوں نے نعرۂ انقلاب¹ پایا
 اسی سے انگریز حکمرانوں نے خود سری کا جواب پایا
 اسی سے میری جواں تمنا نے شاعری کا رباب پایا

یہ اپنے نغمات پر اثر سے دلوں کو بیدار کر چکی ہے
 یہ اپنے نعروں کی فوج سے، شمنوں پہ یلغار کر چکی ہے
 شتمگروں کی شتمگری پر ہزار بارہا کر چکی ہے

1 انقلاب زندہ باد تحریک آزادی کا سب سے مشہور نعرہ اردو زبان ہی کی دین ہے۔

کوئی بتاؤ وہ کون سا موز ہے جہاں ہم جھبک گئے ہیں
وہ کون سی رزم گاہ ہے جس میں اہل اردو دوبک گئے ہیں
وہ ہم نہیں ہیں جو بڑھ کے میدان میں آئے ہوں اور ٹھٹھک گئے ہیں

یہ وہ زباں ہے کہ جس نے زنداں¹ کی تیرگی میں دیے جاۓ
یہ وہ زباں ہے کہ جس کے شعلوں سے جل گئے پھانسیوں کے سایے
فراز دار و رسن سے بھی ہم نے سرفروشی² کے گیت گائے۔

کہا ہے کس نے ہم اپنے پیارے وطن میں بھی بے وطن رہیں گے
زبان چھین جائے گی ہمارے دہن سے ہم بے سخن رہیں گے
ہم آج بھی کل کی طرح دل کے ستار پر نغمہ زن رہیں گے

یہ کیسی یاد بہار ہے جس میں شاخِ اردو نہ پھل سکے گی
وہ کیسا روئے نگار ہوگا نہ زلف جس پر چل سکے گی
ہمیں وہ آزادی چاہیے جس میں دل کی مینا اُبل سکے گی

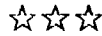
ہمیں یہ حق ہے ہم اپنی خاک وطن میں اپنا چمن سجائیں
ہماری ہے شاخ گل تو پھر کیوں نہ اس پہ ہم آشیاں بنائیں
ہم اپنے انداز اور اپنی زباں میں اپنے گیت گائیں

کہاں ہو متوالو آؤ بزم وطن میں ہے امتحاں ہمارا
زبان کی زندگی سے وابستہ آج سو دو زبیاں ہمارا
ہماری اردو رہے گی باقی اُترے بے ہند تال ہمارا

1۔ اردو کے درجنوں ادیب اور شاعر قیدِ فرٹ میں رہ چکے ہیں۔

2۔ سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے۔
• یکٹنا ہے زور کٹنا بازو ے قاتل میں ہے۔

چلے ہیں گنگ، بسن کی واہی میں ہم: ہوائے بہار بن کر
 ، عالیہ سے اتر رہے ہیں ترانہ آہشار بن کر
 رواں ہیں ہند: تال کی رگ رگ میں خون کی سرخ دھار بن کر
 : ہماری پیاری زبان اردو
 : ہماری نغموں کی جان اردو
 : زمین، دُش جو ان اردو



غزل

(ہند پاک مشاعرے کے موقع پر کہی گئی)

پھر شمیم گل نوید جانفزا لائی ہے آج
مرے گلشن میں بہار رفتہ پھر آئی ہے آج
پھر اٹھا ہے وادیِ گنگا سے ابرِ نو بہار
سمتِ راوی سے ہوائے مہریاں آئی ہے آج
آج پھر ہے اتحادِ شیشہ و ساغر کا دور
مخملِ رنداں میں جسنِ بادہ پتائی ہے آج
چشمِ ساقی تجھ میں سارا میکدہ آباد ہے
قلمتِ رعنا میں موجِ مے کی انگڑائی ہے آج
کھل گئے ہیں اشتیاقِ دید میں آنکھوں کے در
دوستوں کی خانہ دل میں پذیرائی ہے آج
'آٹے ہیں سینہ چاکاں چمن سے سینہ چاک'
شور ہے محفل میں دیوانوں کی بن آئی ہے آج
پھر وہی گلیاں وہی اگلا طواف کوئے دوست
عشق کو مژدہ کہ پھر سامانِ رسوائی ہے آج
کون ہے جس سے سنبھالا جائے گامیرا جنون
خود ہی پائے شوق کو زنجیر پہنائی ہے آج
دُورِ بابوں جانِ ورن کو پھونک ڈالے گی یہ آگ
میرے سینے میں جو ضبطِ غم نے بھڑکائی ہے آج

آج جیہا کی میں ہے اہل خرد کی مسلمات
 مرفروشی ہی میں اہل دل کی دانتی ہے آج
 'سکرائے زخمِ دل، جسے گئے سینے کے داغ
 روح استبداد کیسی کبھی شرمائی ہے آج
 خونِ ناحق لالہ و گل بن کے پھوٹا خاک سے
 تیرہ زن کے خوںِ سحر کی زیبائی ہے آج
 لہر دو صیادوں سے گلِ چینوں کو کر دہو شیار
 فصلِ گل نے دور تک زنجیر پھیلائی ہے آج
 ہاں یہی ہے روزِ محشر، ہاں یہی روزِ حساب
 تیری رسوائی ہے اب یا میری رسوائی ہے آج
 پھر ہے میناروں پہ ریشہ، پھر ہیں گنبد سرنگوں
 پھر نوا شاعر کی ایوانوں سے نکرائی ہے آج
 آج پھر قدموں پہ آکر جھک رہی ہے کائنات
 اپنے قبضے ہیں جہانِ نو کی دارائی ہے آج
 خاک پر جھکتی نہیں افلاک پر رکتی نہیں
 جو نگہ تقدیرِ عالم کی تماشائی ہے آج
 ایک ساحل ہے کہ ابھرا ہے مہنور کی گود سے
 ایک کشتی ہے کہ طوفانوں سے نکرائی ہے آج
 رنگِ بے حسن نگاراں، جشنِ گل، فصلِ بہار
 ہند کی روحِ جوان شعروں میں کھنچ آئی ہے آج
 جل اٹھانے میں خوںِ موئن ہوئے دل میں چراغ
 شاعرِ آتش نوا نے آگِ بر سائی ہے آج

اناج

میری عاشق ہیں کسانوں کی حسیں کنیاں
 جن کے آنچل نے محبت سے اٹھایا مجھ کو
 کھیت کو صاف کیا، نرم کیا مٹی کو
 اور پھر کوکھ میں دھرتی کی سلایا مجھ کو
 خاک در خاک ہر اک تہہ میں ٹولا لیکن
 موت کے ڈھونڈتے ہاتھوں نے نہ پایا مجھ کو
 خاک سے لے کے اٹھا مجھ کو مرا ذوقِ نمو
 سبز کو نیل نے بتیلی میں چھپایا مجھ کو
 موت سے دور مگر موت کی اک نیند کے بعد
 جہشِ بادِ بہاری نے جگایا مجھ کو
 بالیاں پھولیں تو کھیتوں پہ جوانی آئی!
 ان پر ز ادوں نے بالوں میں سچایا مجھ کو
 میرے سینے میں بھرا سرخ کرن نے سوتا
 اپنے جھولے میں ہواؤں نے جھلایا مجھ کو
 میں رکابی میں، پیالوں میں مہک سکتا ہوں
 چاہیے بس لب و رخسار کا سایہ مجھ کو

میری عاشق ہیں کسانوں کی حسین کنیا نسیں
 گودے ان کی کوئی چھین کے لایا مجھ کو
 ہوئی زرنے مجھے آگ میں پھونکا ہے کبھی
 کبھی بازار میں نیلام چڑھایا مجھ کو
 قید رکھا کبھی لوہے میں کبھی پتھر میں
 کبھی گوداموں کی قبروں میں دبایا مجھ کو
 سی کے یوروں میں مجھے پھینکا ہے تہ خانوں میں
 چور بازار کبھی راس نہ آیا مجھ کو
 وہ ترستے ہیں مجھے اور میں ترستا ہوں انھیں
 جن کے ہاتھوں کی حرارت نے اُگایا مجھ کو

کیا ہوئے آج مرے ناز اٹھانے والے
 ہیں کہاں قید غلامی سے چھڑانے والے

☆☆☆

غزل

گرم ہے اب کی بہت گرم ہوائے کشمیر
 دہکی دہکی نظر آتی ہے فضاے کشمیر
 جانے کس پر یہ نگاہ غلط انداز پڑے
 بھکی بھکی سی ہے کچھ دن سے ادائے کشمیر
 چند سکوں میں کئی تھی یہ کبھی کبھی بہار
 چند سکے ہی ہیں کیا اب بھی بہائے کشمیر
 ظلم عریاں تو نہیں سازش پنہاں ہے مگر
 آہ کیا اب بھی فریگی ہے خدائے کشمیر
 ورق گل کو مسل ڈالا ہے کس ظالم نے
 پارہ پارہ ہوئی جاتی ہے روائے کشمیر
 کوئی بتلائے کہ یہ بھوک یہ افلاس ہے کیوں
 شیر و شہد و شمر و گل ہے عطائے کشمیر
 جانے فریاد جگر دوز بنے گی کب تک
 تلاء زیرِ لبی تک ہے نوائے کشمیر
 اس طرف سے بھی گزر قافلہ صبح بہار
 راس آتی ہے بہاروں کو ہوائے کشمیر

تہنیت

اے سرزمین کا شمر شاعر کی فردوسِ نظر
جنت کی تصویر حسین آباد روئے خاک پر
ہر شاخ شاخ گل ہے یاں ہر شاخ گل شاخ شمر
اے سرزمین کا شمر

نیلیم کے کہساروں کے دامن میں زمر کی زمیں
موتی کی جھار سے حسیں، موجِ رواں کی آستیں
بہتے ہوئے دریاؤں میں پگھلے ہوئے شمس و قمر
اے سرزمین کا شمر

سونا اگلتی ہے زمیں چاندی لٹاتی ہے فضا
لی کر شرابِ لالہ گوں دادی میں آتی ہے ہوا
گویا شرابِ ارغواں کے جام ہیں گلہائے تر
اے سرزمین کا شمر

یاں ڈرے ڈرے کے لیے فطرت کی دولت عام ہے
ہر سنگ کو انعام ہے ہر خشت کو اکرام ہے
انساں کی قسمت میں مگر، دردِ دل و داغِ جگر
اے سرزمین کا شمر

پتھر کے ٹیلوں کو ہوا ملبوس بر فانی عطا
 بے جاں مناظر کے لیے بھی سبزہ و گل کی قبا
 عریاں بدن لیکن ترے نورِ نظر، لختِ جگر
 اے سرزمین کا شمر

دولت کے سایے میں مگر مجبور و معذور و فقیر
 آزاد و خود مختار لیکن دامِ سازش میں اسیر
 قومِ شریف و چہب دست و تر دماغ و باہنر
 اے سرزمین کا شمر

دُھندلی نظر آتی ہیں کچھ رنگین و روشن وادیاں
 پڑتی ہیں شاید دور سے نیو یارک کی پرچھائیاں
 پوشیدہ زیر شاخِ گل تیر و سناں، تنج و تیر
 اے سرزمین کا شمر

ہاں بک نہ جائے دیکھنا تیرے شہیدوں کا لہو
 ہاں لٹ نہ جائے کشتِ گل، ہاں اڑ نہ جائے رنگِ دبو
 ہاں ٹل نہ جائے ڈالروں کے ڈھیر میں شاخِ شمر
 اے سرزمین کا شمر

بدلی نظر آتی ہے کچھ مشرق کے باغوں کی ہوا
 ہے بھیرویں کی تان سے گونجی ہوئی ساری فضا
 چٹکیں گے تیرے باغ میں کب نغمہ سناں سحر
 اے سرزمین کا شمر

پہلو میں ارض سوویت، انسانیت کی پاسباں
 اور سر کے اوپر انقلاب جیسے کا دست مہرباں
 ہیں منتظر کب سے تری یلغار کے فتح و ظفر
 اے سرزمین کا شمر

گنگ و جمن کی تہنیت لایا ہوں تیرے واسطے
 جمہوریت کی راہ میں ملتے ہیں سارے راستے
 ہر کاروان شوق کی ہے ایک منزل اک ڈگر
 اے سرزمین کا شمر



حسن کشمیر

آباد ہے خوابوں کی طرح وادی کشمیر
 قانون میں تاروں کے تو پھولوں کے چراغاں
 دامن میں پہاڑوں کے لہکتی ہیں بہاریں
 پتھر کی ہتھیلی پہ مہکتا ہے گلستاں
 'مستور' ¹ بجاتی ہوئی پھرتی ہیں ہوائیں
 ہر باغ میں آوارہ و سرمست و غزلخواں
 اڑتی ہوئی آتی ہیں پرستانِ افق سے
 لمبوس شفق پہنے ہوئے صبح کی پریاں
 ہر وادی شاداب ہے محبوبہ گلغام
 معشوقہٴ نونیز ہے ہر جوئے کہستاں
 جھیلیں ہیں کہ نیلم کے تراشے ہوئے پیالے
 فوارے ہیں یا گوہر و الماس ہیں رقصاں
 'شالی' ² کے ہیں یہ کھیت کہ سبزے کے سمندر
 سایے ہیں چناروں کے کہ جنت کے شبستاں

1 'مستور' کشمیر کا قومی ساز ہے

2 'شالی' کشمیری زبان میں دھان کو 'شالی' کہتے ہیں۔

دوشیزہ کہسار، پہاڑوں کی غزالہ
 بہت مہ و خورشید ہے ہر دفتر دہقاں
 جو چھین لے دل وہ ہنر دست ہنر مند
 اصول مگر جنس کے بازار ہیں ارزاں
 اخلاص و محبت کی وہ گوندھی ہوئی مٹی
 اخلاق و مروت کے وہ ذہالے ہوئے انسان
 بخشا ہے انھیں جہد مسلسل کے عمل نے
 وہ ذوق لطافت کہ ہے پروردہ طوقاں
 شاعر کو یقین ہے کہ نگر آئے گا اک روز
 وہ حسن جو افلاس کی چادر میں ہے پنہاں

☆☆☆

جہلم کا ترانہ

مانند جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں
ہردم رواں، ہردم دواں، ہردم جواں رہتا ہوں میں

وادی میں لہراتا ہوا
سبزے سے اٹھلاتا ہوا
سو سچ و خم کھاتا ہوا
ہنستا ہوا گاتا ہوا

ہردم رواں، ہردم دواں، ہردم جواں رہتا ہوں میں
مانند جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں

موجوں کی زلفیں کھولتے
قطروں کے موتی روتے
معتوقہ کشمیر کے
پہلو میں اتراتا ہوا

ہردم رواں، ہردم دواں، ہردم جواں رہتا ہوں میں
مانند جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں
الماس پاش، انجم فشاں

پیران آب رواں
دیشیرۂ مہتاب کو
آئینہ دکھلاتا ہوا

ہردم رواں، ہردم دواں، ہردم جواں رہتا ہوں میں
مانند جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں

کھیتوں کے کھن میں یہاں
باغوں کے سایے میں وہاں
اپنی شراب ناب کے
ساغر کو چمکاتا ہوا

ہردم رواں، ہردم دواں، ہردم جواں رہتا ہوں میں
مانند جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں

جو ذرہ ہے سیراب ہے
جو خاک ہے شاداب ہے
خون بہاؤ چاوداں
رگ رگ میں دوڑاتا ہوا

ہردم رواں، ہردم دواں، ہردم جواں رہتا ہوں میں
مانند جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں

مثل بتان سیم تن
وادی بہ وادی گا مزن
موج نسیم صبح کی
جنبش کو شرماتا ہوا

ہردم رواں، ہردم دواں، ہردم جواں رہتا ہوں میں
مانند جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں

فطرت مری وارفتگی
 آزادگی و سرکشی
 طوقاں سے ملتا ہوں گلے
 ساحل سے ٹکراتا ہوا

ہردم رواں، ہردم دواں، ہردم جواں رہتا ہوں میں
 مانند جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں

آسودگی جسم و جاں
 آغوش بحر بیکراں
 شوریدگی کو عشق کے
 آداب سکھلاتا ہوا

ہردم رواں، ہردم دواں، ہردم جواں رہتا ہوں میں
 مانند جوئے زندگی شام و سحر بہتا ہوں میں

☆☆☆

رائفل کی گولیوں کا نغمہ اور نئے شعری پیکر کی تخلیق

(ایک خط سلطانہ کے نام)

(سینٹرل جیل ناسک سے لکھے ہوئے اس خط پر کوئی تاریخ نہیں ہے۔ یہ جن حالات میں لکھا گیا تھا ان میں تاریخ کا خیال نہ رہ جانا معمولی بات ہے۔ یہ خط کئی ہفتے بعد کسی قیدی کے ہاتھ پہنچا گیا تھا۔ جیل کی ڈاک سے اس کا جانا ممکن نہیں تھا۔ یہ واقعہ وسط 1949ء کا ہے جب انقلابی قیدیوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ ایک جیل سے دوسری جیل میں ٹرانسفر Transfer ہونے سے انکار کریں گے۔ یہ بھی خاموش احتجاج کا ایک طریقہ تھا۔)

مقل کو کس نشاط سے جاتے ہیں ہم کہ ہے

پُر گل خیالِ رُخِ سے دامنِ نگاہ کا

کل شام کو سیاسی قیدیوں پر فائرنگ ہوئی۔ ہماری پشت پر بارک کی پتھریلی دیوار تھی اور دس گز کے فاصلے پر سامنے مسلح پولیس کی رائفلیں۔ تم نے اخبار میں خبر پڑھ لی ہوگی۔ سرکاری بیان شائع ہوا ہوگا۔ کل تیسرے پہر پولیس کی دو سیاہ رنگ گاڑیاں ہماری بارک کے سامنے آکر رکیں۔ عام طور سے قیدی جیل کے گیٹ پر اتارے جاتے ہیں لیکن ان قیدیوں نے اترنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ سب سیاسی قید۔ ہمنہ، دھوکہ دے کر بہنئ سے ناسک لایا گیا ہے۔ ان کے لیڈر مرانجی زبان کے مشہور اور مقبول گانے والے اور عوامی سارے۔ کے دوسرے ساتھی امر شیخ ہمارے ساتھ قید ہیں۔ انھوں نے نیچے اتر کر ڈانگے سے بات کی۔ ان کے لہجہ میں ہندی اور تیزی تھی انھوں نے صرف ایک سوال کیا۔ 'آپ لوگ ہمارا ساتھ دیں گے یا جیل ادھیکاریوں کا۔' ظاہر ہے جیل ادھیکاریوں کا ساتھ دینے کا سوال میں نہیں ہے۔ ہاتھا۔ ڈانگے نے ہم سب کی طرف سے جیل کو اپنی میٹھم دے دیا کہ اگر آپ ان سب قیدیوں کو بہنئ واپس نہیں لے جائیں گے تو ہم اپنی بارک کے اندر واپس نہیں جائیں گے۔ ہمارے پاس احتجاج کا یہی طریقہ تھا کہ رات کے وقت لاک اپ Lock-up سے انکار کر دیں۔ جیل نے نہایت متانت سے کہا کہ جیل کی ڈسپلن نہیں توڑی جاسکتی۔ آپ بارک میں بند ہونے سے انکار کریں گے تو کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ ان معصوم (بے ضرر) لفظوں کا مطلب ہم کو معلوم تھا کیونکہ اطلاع مل چکی تھی

کہ گیت پر مسلح پولیس آئی ہے۔ ڈانگے مسکرا دیے۔ یہ ہم سب کی طرف سے جواب تھا۔ ہم دو ڈھائی سو قیدی پارک کی چہار دیواری سے باہر نکل آئے اور دیوار کے پاس کھڑے ہو گئے۔ باقی کام سنوں میں پورا ہو گیا۔ پولیس کی سیاہ گاڑیاں (جن میں بسبئی سے لائے ہوئے قیدی تھے) ہمارے سامنے سے ہٹا لی گئیں اور ان کی جگہ مسلح پولیس آ کر کھڑی ہو گئی۔ انھیں دیکھ کر قیدیوں کو جلال آ گیا۔ بہت سے قیدی ایک ساتھ پولیس کی طرف جھپٹے اور پولیس نے گولی چلا دی۔ ہمیں اب تک علم نہیں کہ وہاں کوئی مجسٹریٹ تھا یا نہیں۔ گولی چلانے کا حکم کس نے دیا۔ ایک قیدی جان سے مارا گیا اور کئی قیدی زخمی ہو گئے۔ اس کے بعد ہم بارک میں واپس آ گئے۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ بجلی غائب تھی۔

اب اس واقعے کو چوبیس گھنٹے ہو چکے ہیں۔ جیل کا کوئی انصراب تک ہمارے پاس نہیں آیا ہے۔ صرف یہ خبر ہے کہ پولیس کی گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے قیدیوں کو بڑے بڑے ربڑ کے پائپوں Pipes سے پانی کی دھار مار کر چوبیسوں کی طرح باہر نکالا گیا ہے اور کسی بارک میں بند کر دیا گیا ہے۔ رات بھر اس شخ اپنی خوبصورت اور طاقتور آواز میں مراٹھی کے انقلابی گیت گاتا رہا۔ میں نے ڈانگے کو غالب کے دو شعر لکھ کر دیے۔

عشرتِ قلِ مہرہ اہلِ تمنّا مت پوچھ

عیدِ نگارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

قد و کیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے

جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

ہم لوگ صبح سے آپس میں باتیں کر رہے ہیں کہ قارئین کے وقت کس کی کیا کیفیت تھی۔ مجھے اپنا حال صرف اتنا معلوم ہے کہ بارک سے نکلنے وقت ایک عجیب قسم کا جوش تھا لیکن جب میں دیوار سے چپہ لگا کر کھڑا ہو گیا اور سامنے مسلح پولیس اور اس کی رائفلیں دکھائی دیں تو میں نے اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز سنی۔ چند لمحوں میں یہ آواز گولی چلنے کی کڑخت آوازوں میں ڈوب گئی۔ بس یہ معلوم ہوا جیسے میرا دل سینے سے نکل کر نیچے گر گیا ہے۔ اس کے بعد دل پھر واپس آ گیا اور دھڑکنے لگا۔ اس لمحے میں مجھے کوئی خیال نہیں آیا۔ موت کا لفظ گولی چلنے کے بعد یاد آیا۔

اب سکون ہے اور سناٹا۔ نئے نئے شعری پیکر ڈھل رہے ہیں جن سے ہماری شعری روایت

بالکل بیگانہ ہے۔ ع

شام کی آنکھ میں بارہ دے کا جل کی لکیر

رائفل کرتی ہے فولاد کے ہونٹوں سے کلام

گولیاں کرتی ہیں سیسے کی زباں سے باتیں

بارود کا کاجل، فولاد کے ہونٹ، سیسے کی زباں۔ اردو زبان کی نازک مزاجی اس انداز بیان کو

کیسے برداشت کر سکے گی۔ یہ خم شمشیر، تیرنگہ اور پیکان یار سے کس قدر مختلف ہے۔

اردو والوں کو میری شاعری سے مانوس ہونے میں وقت لگے گا، بگھنؤ والوں نے تو اب تک

اقبال کو بھی قبول نہیں کیا ہے، جس کی ساری شعری روایت کلاسیکی ہے۔ دراصل ہمیں قبول عام کی سند کی

زیادہ فکر نہیں کرنی چاہیے۔ دل پر جو گزرتی ہے اس کے لیے دل ہی زبان تلاش کرتا ہے اور دل سے جو

بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔

بہر حال میرے خط سے تمہیں اطمینان ہو جائے گا کہ تاکہ جیل میں سب خیریت ہے۔ ہم

زندگی کے ایک خوفناک مکر دلچسپ تجربے سے گزر رہے ہیں۔

راہ میں فوجوں کا پہرا، سر پہ ٹکواروں کی چھاؤں

آئے ہیں زنداں میں بھی باشوکتِ شاہانہ ہم

جاتے جاتے دے گئے ہم زندگی کو رنگ و نور

رفتہ رفتہ بن گئے اس عہد کا افسانہ ہم

☆☆☆

ایک خواب اور

1964

سلطانہ کے نام
 کہ گل بدست تو از شاخ تازہ ترماندہ

حرف اوّل

خواب اور کھلت خواب اس دور کا مقدر ہے۔ اور نئے خواب دیکھنا انسان کا ایک ایسا حق جس سے کوئی طاقت، کوئی اقتدار اسے محروم نہیں کر سکتا۔ اور شاید یہی انسان اور انسانیت کے مستقبل کی ضمانت ہے۔

ہزاراں سال با فطرت نشتم
 بہ او پچھتم و از خود ٹھستم
 ولیکن داستانم این دو حرف است
 تراشیدم، پرستیدم، ہلکستم

سردار جعفری

فروری 1965

ایک خواب اور

خواب اب حسن تصور کے افق سے ہیں پرے
 دل کے اک جذبہ معصوم نے دیکھے تھے جو خواب
 اور تعبیروں کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
 تھگی آبلہ پا، شعلہ بکف موج سراب
 یہ تو ممکن نہیں بچپن کا کوئی دن مل جائے
 یا پلٹ آئے کوئی سامعِ نایاب شباب
 پھوٹ نکلے کسی افسردہ تبسم سے کرن
 یا دمک اٹھے کسی دستِ بڑیدہ میں گلاب
 آہ پتھر کی لکیریں ہیں کہ یادوں کے نقوش
 کون لکھ سکتا ہے پھر عمر گزشتہ کی کتاب
 بیتے لمحات کے سوئے ہوئے طوفانوں میں
 تیرتے بھرتے ہیں پھوٹی ہوئی آنکھوں کے حباب
 تابشِ رنگِ شفق، آتشِ روئے خورشید
 مل کے چہرے پہ سحر آئی ہے خونِ احباب
 جانے کس موڑ پہ کس راہ میں کیا جیتی ہے
 کس سے ممکن ہے حتماؤں کے زخموں کا حساب

آستیں کو پکاریں گے کہاں تک آنسو
 اب تو دامن کو پکڑتے ہیں لبو کے گرداب
 دیکھتی پھرتی ہے ایک ایک کا منہ خاموشی
 جانے کیا بات ہے شرمندہ ہے اندازِ خطاب
 در بدر ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال
 اور مجرم کی طرح ان سے گریزاں ہے جواب
 سرکشی، پھر میں تجھے آج صدا دیتا ہوں
 میں ترا شاعرِ آوارہ و بے باک و خراب
 پھینک پھر جذبہ بے تاب کی عالم پہ کند
 ایک خواب اور بھی اے ہنس دشوار پسند



ہاتھوں کا ترانہ

ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

ان ہاتھوں کی تکریم کرو

دنیا کے چلانے والے ہیں

ان ہاتھوں کو تسلیم کرو

تاریخ کے اور مشینوں کے پہنیوں کی روانی ان سے ہے
تہذیب کی اور تمدن کی بھرپور جوانی ان سے ہے
دنیا کا فسانہ ان سے ہے، انساں کی کہانی ان سے ہے
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

صدیوں سے گذر کر آئے ہیں، یہ نیک اور بد کو جانتے ہیں
یہ دوست ہیں سارے عالم کے، پر دشمن کو پہچانتے ہیں
خود بخشتی کا اوتار ہیں، یہ کب غیر کی عکس مانتے ہیں
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

ہیں زخم ہمارے ہاتھوں کے، یہ پھول جو ہیں گلدانوں میں
سوکھے ہوئے پیاسے چلو تھے، جو جام ہیں اب میٹانوں میں
نوٹی ہوئی و انگڑائیوں کی محرابیں ہیں ایوانوں میں
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

راہوں کی سنبری روشنیاں، بجلی کے جو پھیلے دامن میں
 فانوس حسیں ایوانوں کے، جو رنگ و نور کے خرمن ہیں
 یہ ہاتھ ہمارے جلتے ہیں، یہ ہاتھ ہمارے روشن ہیں
 ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

خاموش ہیں یہ خاموشی سے، سویرہ و چمک بناتے ہیں
 تاروں میں راگ سلاتے ہیں، طلبوں میں بول چھپاتے ہیں
 جب ساز میں جنبش ہوتی ہے، تب ہاتھ ہمارے گاتے ہیں
 ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

اعجاز ہے یہ ان ہاتھوں کا، ریشم کو چھوئیں تو آنچل ہے
 پتھر کو چھوئیں تو بت کر دیں، کالکھ کو چھوئیں تو کاجل ہے
 مٹی کو چھوئیں تو سوتا ہے، چاندی کو چھوئیں تو پایل ہے
 ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

بہتی ہوئی بجلی کی لہریں، سٹے ہوئے گزکا کے دھارے
 دھرتی کے مقدر کے مالک، محنت کے افق کے سیارے
 بے چارہ گران درد جہاں، صدیوں سے مگر خود بے چارے
 ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

تخلیق یہ سوز محنت کی، اور فطرت کے شبکار بھی ہیں
 میدانِ عمل میں لیکن خود، یہ خالق بھی معمار بھی ہیں
 پھولوں سے بھری یہ شاخ بھی ہیں اور چلتی ہوئی تلوار بھی ہیں
 ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

یہ ہاتھ نہ ہوں تو مہمل سب، تحریریں اور تقریریں ہیں
 یہ ہاتھ نہ ہوں تو بے معنی، انسانوں کی تقدیریں ہیں
 سب حکمت و دانش علم و ہنر، ان ہاتھوں کی تفسیریں ہیں
 ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

یہ کتنے سبک اور نازک ہیں، یہ کتنے سڈول اور اچھے ہیں
 چالاکی میں استاد ہیں یہ اور بھولے پن میں بچے ہیں
 اس جھوٹ کی گندی دنیا میں بس ہاتھ ہمارے بچے ہیں
 ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

یہ سرحد سرحد جڑتے ہیں اور ملکوں ملکوں جاتے ہیں
 بانہوں میں بانہیں ڈالتے ہیں اور دل سے دل کو ملاتے ہیں
 پھر ظلم و ستم کے پیروں کی زنجیر گراں بن جاتے ہیں
 ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

تعمیر توان کی فطرت ہے، اک اور نئی تعمیر سہی
 اک اور نئی تدبیر سہی، اک اور نئی تقدیر سہی
 اک شوخ و حسین خواب اور سہی اک شوخ و حسین تعبیر سہی
 ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

ان ہاتھوں کی تکریم کرو
 دنیا کو چلانے والے ہیں
 ان ہاتھوں کو تسلیم کرو



زندگی

(1)

کس نے کہا کہ حاصل وہم و گماں ہے زندگی
 کس نے کہا کہ دہر کا سر نہاں ہے زندگی
 جتنی نہاں ہے زندگی اتنی عیاں ہے زندگی
 کتنی حسین، کتنی شوخ، کتنی جواں ہے زندگی
 صبح سے لے کے تا بہ شام، مست خرام و تیز گام
 کرتی نہیں کہیں قیام، کرتی نہیں کہیں مقام
 جذبہ شوق ہے تمام، منزل شوق نام تمام
 دامن شش جہات میں سیل رواں ہے زندگی
 سرد ہے پتھروں کا دل، برف کی جیسے ایک سل
 خاک حقیر و پست و خوار، ست و ذلیل و مضحل
 عرصہ کائنات میں اُف رے سکوت آب و گل
 قلب سکوت میں مگر زحمرہ خواں ہے زندگی
 اس کے لیے حسین ہون، اس کے لیے جواں ہدات
 مثلِ تغیرات دہر، صرف اسی کو ہے ثبات
 یہ ہے نگارِ بزمِ گل، یہ ہے عروبہ کائنات
 جانِ جہان و شہدِ کون و مکاں ہے زندگی

(2)

عرصہ گہ حیات میں، جنگ و جنوں ہیں طعراں
 خون سے سرخ ہے زمیں، خون سے سرخ آسمان
 بکھری ہوئی ہیں ہڈیاں، اجڑی ہوئی ہیں بستیاں
 نالہ و فحہ و بکا، آہ و فغاں ہے زندگی
 بھوک کا خار زار ہے، پیاس کا ریگ زار ہے
 عمر رواں کی پشت پر، عمر رواں کا بار ہے
 کل بھی وہ بے قرار تھی، آج بھی بے قرار ہے
 قلب بشر میں درد کی جوئے رواں ہے زندگی
 قہر کی سرخ آگ ہے، زہر کا زرد جام ہے
 دوزخِ غم کی مچ ہے، دوزخِ غم کی شام ہے
 یہ وہ بہشت ہے جہاں عیش و سکون حرام ہے
 حق و سناں ہے زندگی، تیر و کماں ہے زندگی
 آپ ہی بت سکن بھی ہے، آپ ہی بت تراش بھی
 مرہمِ زخمِ دل بھی ہے، دل کی مگر خراش بھی
 آپ کو گم کیے ہوئے، اپنی مگر تلاش بھی
 اپنے تضاد کو لیے، گرم عیاں ہے زندگی
 گردِشِ رقص ہے کہیں، جہشِ گام ہے کہیں
 قد و نبات ہے کہیں، تلخیِ جام ہے کہیں
 تابشِ صبح ہے کہیں، آتشِ شام ہے کہیں
 اپنے ہزار رنگ میں رقص کنائے زندگی

مالکِ خُشک و تر بھی ہے، فاتحِ بحر و بر بھی ہے
 صاحبِ تاج و زریں بھی ہے، خالقِ خیر و شر بھی ہے
 اشک بھی ہے گہر بھی ہے، سنگ بھی ہے شرر بھی ہے
 شاہِ شہاں ہے زندگی، میرِ جہاں ہے زندگی
 گاہِ غرورِ تاجدار، گاہِ شکستِ شہریار
 گاہِ سرورِ اہلِ دل، گاہِ شعورِ دستکار
 گاہِ طلسمِ رنگ و بو، گاہِ فریبِ حشمِ یار
 گاہِ فروغِ جلوہٴ ماہ و شاں ہے زندگی
 تند مزاج و شعلہٴ خو، برق و شرار کی طرح
 جلوہٴ طراز و دلِ نواز، روئے نگار کی طرح
 آتشِ گل کی پاساں، بادِ بہار کی طرح
 موت کے باغ کے لیے، بادِ خزاں ہے زندگی
 اپنی نگاہِ گرم سے سنگ کے دل کو توڑتی
 انجم و مہر و ماہ سے، نور کا خوں نہجڑتی
 سینہٴ کائنات پر نقشِ دوام چھوڑتی
 صبحِ ازل سے تا ابد، گرم نکال ہے زندگی
 کارکشا و کارساز، اس کا جوان ہات ہے
 اس کی نگاہ سے حسیں، عالمِ ممکنات ہے
 بزمِ تقیرات میں، جانِ تقیرات ہے
 بیدارِ انتساب پر زمزمہ خواں ہے زندگی

سیر طور

(آسماں پروا. دلوں کے نام)

’کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی‘
غالب

دل کو بے تاب رکھتی ہے اک آرزو
کم ہے یہ وسعتِ عالمِ رنگ و بو
لے چلی ہے کدھر پھر نئی جستجو
تابہ حدِ نظر اُڑ کے جاتے ہیں ہم
وہ جو حائل تھے راہوں میں شمس و قمر
ہم سفر ان کو اپنا مانتے ہیں ہم

ہے زمیں پردہٴ لالہ و نسترن
آسماں پردہٴ کھکشاں ہے ابھی
رازِ فطرت ہوا لاکھ ہم پر عیاں
رازِ فطرت نہاں کا نہاں ہے ابھی
جس کی صدیوں ادھر ہم نے کی ابتدا
نامتتام اپنی وہ داستاں ہے ابھی
منزلیں اڑ گئیں بن کے گردِ سفر
رہگزاروں ہی میں کا رواں ہے ابھی

بی کے ناکامیوں کی شراب کہن
اپنا ذوقِ تجسس جواں ہے ابھی

ہاتھ کاٹے گئے جرأتِ شوق پر
خوں چکاں ہو کے وہ گلِ فشاں ہو گئے
حیرتوں نے لگائی جو مہرِ سکوت
لبِ خموشی میں جادو بیاں ہو گئے
راستے میں جو کہسار آئے تو ہم
ایسے تڑپے کہ سیلِ رواں ہو گئے
ہیں ازل سے زمیں کے گرے پر اسیر
ہو کے محدود ہم بیکراں ہو گئے
ذوقِ پرواز بھی دل کی اک جست ہے
خاک سے زینتِ آسماں ہو گئے

عقلِ چالاک نے دی ہے آکر خبر
اک شبستاں ہے ایوانِ مہتاب میں
منتظر ہیں نگارانِ آتشِ بدن
جگمگاتی فضاؤں کی محراب میں
کتنے دل کش حسین خواب بیدار ہیں
ماہ و مزخ کی چشم بے خواب میں
کھینچ پھر زلفِ معشوقہ نیلگوں
لے لے شعلے کو پھر دستِ بیتاب میں

مژدہ ہو مہ جینانِ افلاک کو
بزمِ کیمتی کا صاحبِ نظر آ گیا
تہنیتِ حسن کو بے نقابی کی دو
دیدہ در آ گیا، پر وہ در آ گیا

آسماں سے گرا تھا جو کل ٹوٹ کر
وہ ستارہ بدوشِ قمر آ گیا
لے کے پیاتہ دروِ دل ہاتھ میں
مل کے چہرے پہ خونِ جگر آ گیا
بزمِ سیارگانِ فلک سیر میں
اک ہنر مند سیارہ گر آ گیا

شوق کی حد مگر چاند تک تو نہیں
ہے ابھی رفعتِ آسماں اور بھی
ہے ثریا کے پیچھے ثریا رواں
کھکشاں سے پرے، کھکشاں اور بھی
جھانکتی ہیں فضاؤں کے چچاک سے
رنگ اور نور کی وادیاں اور بھی
اور بھی منزلیں، اور بھی مشکلیں
ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی

آج دستِ جنوں پر ہے شمعِ خرد
دو جہاں جس کے شعلے سے معمور ہیں
لے کے آئیں پیامِ طلوعِ سحر
جتنے سورجِ خلاؤں میں مستور ہیں
کہہ دو برقی تجلی سے ہو جلوہ گر
آج موئی نہیں ہم سرطور ہیں

ذوقِ طلب

ہم اس دنیائے رنگ و بو کے طوفانوں سے گزر رہے ہیں
 صنم خانوں سے اٹھے ہیں، پری خانوں سے گزر رہے ہیں
 بڑھا کر تھگی سے لذتِ ذوقِ طلب اپنی
 بھری مینا کو ٹھکرایا ہے، پیانوں سے گزر رہے ہیں
 گھڑی بھر شاخِ گل کی چھاؤں پر ٹھہرے تو کیا ٹھہرے
 جھٹک کر دامنِ دل کو گلستانوں سے گزر رہے ہیں
 غزلِ دل کی سنا کر اٹھ گئے ہیں بزمِ یاراں سے
 بجاتے اپنی زنجیروں کو زندانوں سے گزر رہے ہیں
 برنگِ بوئے گل پیراہن و کاکل سے اڑائے
 شبتانوں کے عاشق اور شبتانوں سے گزر رہے ہیں
 ہوئی زنجیر پائے شوق، جب بھی آرزوِ دل کی
 تمناؤں کو چھوڑا اور ارمانوں سے گزر رہے ہیں
 چراغِ لالہ و گل کر کے روشن اپنے قدموں سے
 نسیمِ جانفرا کی طرح دیرانوں سے گزر رہے ہیں
 اٹھایا تازِ موجوں کا نہ احساں ہم نے ساحل کا
 کوئی منزل ہو، آگے بڑھ گیا ہے کارواںِ دل کا

قدم اب کھینچ کر اُس دشت اُس وادی میں لائے ہیں
 جہاں پر حوصلوں نے اپنے بازو آزمائے ہیں
 نہ جانے کیا کشش ہے بھیٹی تیرے شبستاں میں
 کہ ہم شام اودھ صبح بنارس چھوڑ آئے ہیں
 پیپے بولتے ہیں، کوکئی ہیں کوئلیں جن میں
 ہمارے دل پہ اُن گاتے ہوئے باغوں کے سائے ہیں
 بجاتی ہیں ہوائیں شب کو خوابوں میں ستار اپنا
 نشین شاخِ دل پر سبزہ زاروں نے بنائے ہیں
 ہمارے جسم کندن ہو گئے ہیں تیری کرنوں سے
 ترے چشموں کی چاندی نے ہمارے منہ دھلائے ہیں
 ترے زنداں کی تاریکی میں راتیں ہم نے کاٹی ہیں
 تری سڑکوں پہ سوئے، تیری بارش میں نہائے ہیں
 کبھی اشکوں کے تارے یاس کی پلکوں سے ٹوٹے ہیں
 کبھی امید کے دامن میں موتی جھمگائے ہیں
 کبھی نکلی ہیں آہیں لے کے مشعلِ ظلمتِ شب میں
 کبھی نعروں نے پرچم آسمانوں تک اڑائے ہیں
 ادائے سرکشی دی ہے غرورِ سرِ فردش کو
 تری سفاکیوں نے کتنے خنجر آزمائے ہیں
 مگر پھر بھی ہمارا عالمِ مہر و وفا یہ ہے
 کہ تجھ کو لکھنؤ کی طرح سینے سے لگائے ہیں
 اتاری جارہی ہے چشم و دل سے آرتی تیری
 چراغِ شوق گیتوں کی ہتھیلی پر سجائے ہیں
 مبارک ہم رکابِ گردشِ شام و سحر ہونا
 مبارک ہم سے آزادوں کا تجھ کو ہم سفر ہونا

ہم نے دیکھا ہے

بجومِ یاس میں ذوقِ فراواں ہم نے دیکھا ہے
 کفِ صحرا پہ بھی رقصِ گلستاں ہم نے دیکھا ہے
 رواں پایا ہے نبضِ خار میں خونِ بہاراں کو
 دلِ ہر ذرہ میں خورشیدِ رخشاں ہم نے دیکھا ہے
 بہاروں نے قدم چومے ہیں ہم وہ آبلہ پا ہیں
 خزاں کو اپنی راہوں سے گریزاں ہم نے دیکھا ہے
 یہ روشن کس کا رخ ہے کاکلِ امروز و فردا میں
 لباسِ نور میں جلوں کو عریاں ہم نے دیکھا ہے
 جگر کا خون ہو، دل کا لہو، یا اشک آنکھوں کے
 انھیں کو گوہر و الماس و مرجاں ہم نے دیکھا ہے
 رباب و بربط و طاووسِ خوابیدہ کے سینے میں
 و فورِ نغمہ سے تاروں کو لرزاں ہم نے دیکھا ہے
 تہوں میں خاک کی جب کوٹلیں کروٹ بدلتی ہیں
 زمیں کے دل میں معشوقوں کو رقصاں ہم نے دیکھا ہے

غزل

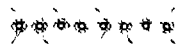
شکستہ شوق کو تحلیل آرزو کیے
 جو تپش ہو تو پیا نہ د سبو کیے
 خیال یار کو دیجئے وصال یار کا نام
 شب فراق کو گیسوئے مشک بو کیے
 چراغ انجمن حیرت نظارہ تھے
 وہ لالہ رو جنھیں اب داغ آرزو کیے
 مہک رہی ہے غزل ذکر زلف خوباں سے
 نسیم صبح کی مانند کو بہ کو کیے
 شکایتیں بھی بہت ہیں، حکایتیں بھی بہت
 مزا تو جب ہے کہ یاروں کے روبرو کیے
 یہ حکم، کیجئے پھر خجروں کی دلداری
 دہان زخم سے افسانہ گلو کیے
 زبان تنق سے کرتے ہیں پرسش احوال
 اور اس کے بعد یہ کہتے ہیں آرزو کیے
 ق

ہے زخم زخم مگر کیوں نہ جانے اسے پھول
 لہو لہو ہے، مگر کیوں اسے لہو کیے

کچھ قاصدِ یارانِ کج ادا کی قبا
 حنائے پائے نگارانِ تند خو کہیے
 جہاں جہاں بھی خزاں ہے وہیں وہیں ہے بہار
 چمن چمن یہی افسانہ نمونہ کہیے
 زمیں کو دیجے دلی مدعا طلب کا پیام
 فضا کو وسعتِ دامنِ آرزو کہیے
 سنواریے غزل اپنی بیانِ غالب سے
 زبانِ میر میں بھی ہاں ہاں کبھو کبھو کہیے
 مگر وہ حرف دھڑکنے لگے جو دل کی طرح
 مگر وہ بات جسے اپنی گفتگو کہیے

ق

وہ جس کے فیض سے غالب ہوا تھا نغمہ سرا
 زبان ہے جسے دلی کی آبرو کہیے
 روانی ایسی کہ گنج کی کھائیے قسمیں
 جوانی ایسی کہ جنت کی آجیو کہیے
 رہے تو معجزہ نطق کی دعا دیجے
 مئے تو آکھ سے ٹپکا ہوا لہو کہیے
 جزا حوتوں کی سیاست ہے جن کا فن سردار
 اب ان سے کہیے تو کیا حاجتِ رفو کہیے



مشرق و مغرب

زندگی ایک، زمیں ایک، انسان بھی ایک
 فکر کا بحر بھی، جذبات کا طوفان بھی ایک
 وہی سورج ہے، وہی چاند ہے، تارے ہیں وہی
 نیلے آکاش کے گھرنگ کنارے ہیں وہی
 شرق سے غرب تک وقت کی پرواز ہے ایک
 دل جو سینوں میں دھڑکتے ہیں تو آواز ہے ایک
 ہیر مغموں ہے پنجاب کے میدانوں میں
 جو لیت روتی ہے انگلینڈ کے افسانوں میں
 عشق کو بخش دیا ذوق تماشا، ہم نے
 حرفِ دل شعلہٴ عارض سے تراشا، ہم نے
 باغِ مشرق ہو کہ مغرب ہو، ہوا ایک سی ہے
 سردیا گرم، بہر حال فضا ایک سی ہے
 ایشیا والے سے یورپ کی زمیں کھینچ کے نہ مل
 میری سوغات بھی دل ہے تری سوغات بھی دل
 جس نے لوٹا ہے ہمیں، جس نے تسم ڈھایا ہے
 ارضِ مغرب نہیں مغرب کا وہ سر ملایا ہے

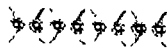
اور سر مایہ نہ ہندی ہے نہ برطانی ہے
یہ مرے اور ترے خون کی ارزانی ہے
تیرا قاتل بھی وہی ہے مرا قاتل بھی وہی
زیست کی جہد بھی اور جہد کا حاصل بھی وہی
میس¹ اور سین² تھیں جنا کی سی بے تاب ہے
موج وینوب³ میں گنگا کی سی بے خوابی ہے
ایسا کچھ فرق نہیں دونوں گھستانوں میں
آہورم خوردہ ہیں تیرے بھی بیابانوں میں
چشمے مغرب کے ہیں مشرق کے غزالہ کی طرح
نیلگوں سلسلہ کوہ ہمالہ کی طرح
جنگلوں میں وہی آوارہ ہوا گاتی ہے
کسی بھٹکے ہوئے رہرو کی صدا آتی ہے
کلیاں کھلتی ہیں سنورتے ہوئے گیسو کے لیے
تتلیاں اڑتی ہیں نکھری ہوئی خوشبو کے لیے
پریاں موسم کی ہواؤں میں چل جاتی ہیں
رت بدلتے ہی قبائیں بھی بدل جاتی ہیں
کشتیاں خوش ہیں سمندر کی گزرگاہوں سے
تیرے ساحل بھی جواں رہتے ہیں ملاحوں سے
تیری محرابیں بھی تہذیب کی انگریزی ہیں
تیری آغوش میں بھی دلی و ششکھائی ہیں
ایک جادو کا اثر گردشِ ایام میں ہے
زندگی یاں بھی طلسمِ سحر و شام میں ہے

-
1. انگلینڈ کا دریا جس کے کنارے لندن آباد ہے
 2. فرانس کا دریا جس کے دونوں طرف پیرس آباد ہے
 3. یورپ کا مشہور دریا جو کئی ملکوں سے گزرتا ہے۔

شب کو جلتے ہیں نول صبح کو بجتے ہیں چراغ
 مسکراتے ہیں شبنم میں جوانی کے ایوان
 صبح در کھلتے ہیں محبوب کی بانہوں کی طرح
 رہو ملتے ہیں راہوں میں نگاہوں کی طرح
 دن کے نظاروں کو آنکھوں میں چھپا لیتی ہیں
 کھڑکیاں رات میں لپکوں کو جھکا لیتی ہیں
 دودھ مغرب کے بھی سینے میں رواں ہوتا ہے
 ہندو ایراں کی طرح طفلِ جواں ہوتا ہے
 راستے دوڑ کے اسکولوں میں مل جاتے ہیں
 بچے بھولوں کی طرح گھاس میں کھل جاتے ہیں
 یاں بھی جو آنکھ ہے عالم کی تماشائی ہے
 ہر نظر لذت دیدار کی شیدائی ہے
 دل کا آہنگ حسین تیرے بھی نعمات میں ہے
 کیفیتِ روح کی رنگوں کے طلسمات میں ہے
 خیر ہو پیرس و لندن کے ہنر داروں کی
 خیر ہو روم کے، یونان کے بت کاروں کی
 تیرے بازار میں یوسف بھی، زلیخا کس بھی
 تیرے ویرانوں میں مجنوں بھی ہیں لیا کس بھی
 زورِ افلاس کا، دولت کی فراوانی بھی
 یاں قبا پوشی بھی ہے، چاکِ گریبان بھی
 حرفِ حق بھی ہے یہاں اور رن و دار بھی
 لذتِ شوق بھی ہے، جرأتِ کردار بھی
 ہم حقیقت سے کبھی دور جو ہو جاتے ہیں
 کچھ مظاہر کے طلسمات میں کھو جاتے ہیں
 زہرِ سافرت و نخت کا پیا کرتے ہیں

یوں ہی انسانوں کو تقسیم کیا کرتے ہیں
 گیسو کا لے ہیں مرے دلیں کے محبوبوں کے
 اور بادل ہیں سنہری ترے معشوقوں کے
 آنکھیں نیلی ہیں تری شوخ حسیناؤں کی
 جھیلیں کاہل کی مرے آئینہ سیمائوں کی
 مختلف کچھ ہیں تراشیں ترے پیراہن کی
 شکلیں کچھ اور مرے جیب مرے دامن کی
 اصلیت نہایت گل کی نہیں گلدانوں سے
 مے بدلتی نہیں بدلے ہوئے پیانوں سے
 ہوئے گل ایک سی ہے، ہوئے وفا ایک سی ہے
 میرے اور تیرے غزالوں کی ادا ایک سی ہے

دسمبر 1954



تمین شرابی

مگر نہیں یہ فرزانوں کا
قصہ ہے اک دیوانوں کا

ماسک، بیس اور لندن میں
ایسے میں نے تمین شرابی
سرخ تھیں آنکھیں روت گلابی

نورے کا تاج جہیں پر
فکر فلک پر پاؤں زمیں پر
بے خم اپنی افروز پا سے
باخبر اپنے عہد وفا سے
دفتر رز کے در کے بھکاری
اپنے قلاب و نظر کے شکاری
پی لینے کے بعد بھی پیاسے
جام کی صورت چھلکے چھلکے
ابر کی صورت بککے بککے

مستی کی تلوار اٹھائے
فصلِ گل چروں پہ کھلائے
قدم قدم پر بہک رہے تھے
مہک رہے تھے چہک رہے تھے

ایک نے شاید دہسکی پی تھی
دوسرے نے شمعین کی بوتل
تیسرے نے وہ پتیلی چاندی
دودکا کی سیال حسینہ
وہ شے جس کی تائش رخ سے
شیشے کو آ جائے پسینہ

میں نے ان نازک لمحوں میں
روحِ بشر کو عریاں دیکھا
عہدِ خزاں کا رنگِ پریدہ
رنگِ عہدِ بہاراں دیکھا
ظاہر دیکھا پنہاں دیکھا

ذکر نہیں یہ فرزانون کا
قصہ ہے اک دیوانوں کا

رات نے اپنی کالی زباں سے
خونِ شفق کے دل کا چانا
چار طرف خاموشی چھائی
پھیل گیا ہر سو ستانا

ذاتِ پیرس کے پہلو میں
 مین ۱۔ کی موجوں کو نیند آئی
 ذننے لگی مجھ کو تنہائی
 مے خانے میں جاکر میں نے
 آگ سے دل کی پیاس بجھائی

رند بہت تھے لیکن وہ سب
 اپنے نشے میں کھوئے ہوئے تھے
 جاگ رہی تھیں آنکھیں لیکن
 دل تو سب کے سوئے ہوئے تھے
 کوئی نہیں تھا ان میں میرا
 میں یہ بیٹھا سوچ رہا تھا
 کب یہ ظالم رات کٹے گی
 کب واپس آئے گا سویرا

اتنے میں اک قلمتِ رعنا
 قدم قدم پر پھول کھلاتا
 ہونٹوں سے معصوم تبسم
 آنکھوں سے بجلی برساتا
 میخانے میں جھوم کے آیا
 ناز و ادا کے دام بچھاتا
 حش و طرب کی محبوبائیں
 نشے مے کی دوشیزائیں
 رہ گئیں اپنی آنکھیں مل کر

آئی قیامت چال میں ڈھل کر
 سکوں کی جھنکار پہ گاتی
 سونے کی تلوار نچاتی
 اپنے لہو میں آپ نہاتی

اس نازک لمحے میں میں نے
 حرص و ہوس کو رقصاں دیکھا
 زد میں نظامِ زرداری کی
 ریح بشر کو لرزاں دیکھا
 مجبوری کو عریاں دیکھا

ذکر نہیں یہ فرزانوں کا
 قصہ ہے اک دیوانوں کا

گہرے گہرے کی لہروں میں
 سارا لندن ڈوب گیا تھا
 لمحوں کی روشن آنکھوں میں
 شام کا جاہل پھیل چکا تھا
 رات کی نیلی دیوی جاگی
 دن کے دیوتا کو نیند آئی
 ڈسنے لگی مجھ کو تنہائی
 میخانے میں جا کر میں نے
 آگ سے دل کی پیاس بجھائی

اس محفل میں سب ہی سمجھ تھا

ماتی بھی اور چر مٹا بھی
 سہیا کی آغوش کے پالے
 طفلک مستی، رند جواں بھی
 غارہ و رنگ کی معشوقہ
 جن کی لطافت شب بھر کی تھی
 مٹ اور ریشم کی بیٹا
 من کی سہیا لب بھر کی تھی
 آج کا سکھ تھا، کل کا دکھ تھا
 آج کی آشا، کل کی نراشا
 جس جس کر غم دلچہ رہے تھے
 ان جھوٹی خوشیوں کا تماشا
 ٹا اسیدی کے کاندھوں پر
 رکھا تھا اسید کا ایشا
 آج وہ لے لیں، جو مل جائے
 کل کیا ہوگا کون بتائے
 آج دلوں کی شمع جلا لیں
 کل شاید یہ رات نہ آئے
 آج تو مے کی کشتی کھ لیں
 کل یہ سفینہ ڈوب نہ جائے
 آج لیوں کا بوسہ لے لیں
 موت کا بوسہ کل لینا ہے
 آج دلوں کا قرض چکا لیں
 کل تو سب پہنچے وہ دینا ہے

اں نازک لمحے میں میں نے

روح بشر کو دیاں دیکھا
 انہم ہم کے خوف کے آگے
 عقل و خرد کو حیراں دیکھا
 سارے جہاں کو لرزاں دیکھا

ذکر نہیں یہ فرزانون کا
 قصہ ہے اک دیوانوں کا

دوش ہوا پر تاریکی نے
 زلفوں کے خم کھول دیے تھے
 ماسکو کی خاموش فضا میں
 رات کی آنکھوں کے کاہل نے
 کتنے جاوہ گھول دیے تھے
 سرخ و سیاہ غزل کے اوپر
 شام کے سایوں کو نیند آئی
 ڈننے لگی مجھ کو تنہائی
 مے خانے میں جا کر میں نے
 آگ سے دل کی پیاس بجھائی

خوش گھروں کا در پہاراں
 جہوم پڑا تھا مے خانوں پر
 بادہ کشوں کا رنگیں جبرمٹ
 نوٹ پڑا تھا بیٹانوں پر
 ساز کی لے میں تیزی آئی
 نچنے سے کی انحرافی نے

لپٹا حسیں پریم لپٹا
 چپے چپے ذرہ ذرہ
 قلمو قلمو رقص میں آیا
 نقیص کے بے تاب بھید کو
 لب کے ٹکڑے چم رہے تھے
 رقص کے بیل گرہوں میں
 جسم کے ٹکڑے گھوم رہے تھے
 چھل کی روش قدسیں
 ہاتھوں کی طرکس عراہیں
 مانگ نظر کی عاشقی کے
 جھپٹ جھپٹ کی سرہاں
 اس گشت میں حرم و برہم
 سدا کلامِ خس و قمرِ عا
 پکھل گئے تھے پاندھ سوج
 بھل گل میں رقصِ شرِ عا
 مات کی بڑبڑاتی سے جیسے
 تھل تھل کا جھوٹ کیا
 چر ٹک کے ہاتھ سے جیسے
 شلت زبرد چھٹ گیا
 بھرے تپلم لعل ہر موتی
 خاک پہ جیسے ٹکڑے ہیں
 جیسے کسی کے برہم کیو
 ٹکڑے ٹکڑے کر سند رہے ہیں
 تڑے کے سر پہ لہی
 حل و خود کا تاجِ حرا عا

دور سے بیٹھا بیٹھا مجھ کو
 ایک شرابی دیکھ رہا تھا
 اس نے ہوا میں ہاتھ سے اپنے
 تمہا سا اک یسر پھینکا
 اک تلی سی اڑتی آئی
 میرے دل کے پھول کے اوپر
 کچھ کانچی اور کچھ منڈلائی
 بیٹھ گئی پر جھڑ کے دونوں
 چیلہ کے رس کو چوس کے ابھی
 اور مری جانب سے ہوا میں
 یسر بن کر پھر لہرائی
 کچھ شرابی، کچھ اترائی

اور شرابی میر سے اٹھ کر
 رقص کے حلقوں سے نکلتا
 کشمی کی صورت چکراتا
 ہاتھ میں اپنا جام اٹھائے
 میری جانب جھومتا آیا
 خنداں خنداں، نازاں نازاں
 رقصاں رقصاں، بچاں بچاں
 موج ہوا کو چھتا آیا

میری زباں تھی اردو، ہندی
 اس کی زباں تھی روسی لیکن
 ایک زباں تھی ایسی بھی جو

دوتوں زبانوں سے پیاری تھی
 دوتوں جس کو بول رہے تھے
 چند اشارے چند تہنم
 نظروں کا خاموش نظم
 حرف بھی تھے، لفظ بھی تھے
 شہد جو دل میں گھول رہے تھے
 ہند کی مستی، روں کا نشہ
 دوتوں نے اک جام عتیا
 ہور ہوا میں اس کو پتلیا
 ساتھ ہمارے سب رتوں نے
 اپنے دلوں کو ہاتھ میں لے کر
 میرے وطن کا جام اٹھایا

اب جو میں نے نو کر دیکھا
 جشن نہ تھا یہ دیوانوں کا
 گرو ہمارے امن کی دیوی
 گیت کی حوریں ساز کی پریاں
 نئے ہور آواز کی لڑیاں
 جڑ کی بد بخت حیتہ
 ضرور امریکہ کا سپاہی
 لندن کا بدست شربلی
 عیش و طرب کی محبیاں
 نئے سے کی دوہیزائیں
 عازہ و رنگ کی مشفقائیں
 خطر ہور ریشم کی مینائیں

ماہد ہر طالب کی غزلیں
 بکریں ۱ ہر نیمہ کی عیسیں
 کتے ہر کتے کتے ہر کتے
 کتے کتے کتے ہر کتے
 کتے کتے کتے ہر کتے
 کتے کتے کتے ہر کتے
 کتے کتے کتے ہر کتے
 کتے کتے کتے ہر کتے
 کتے کتے کتے ہر کتے

میں نے اس ہرک لے میں
 روح ہر کو ہرک دیکھا
 نہ دیکھ کے چھ دھم میں
 چار کا چار دیکھا
 سب چار کو چار دیکھا

ذکر نہیں یہ فرزانوں کا
 قصہ ہے اک دیکھوں کا

دسمبر 1954 - جنوری 1955

ماہنامہ ہفتی



قطعہ

تجسم لب ساقی چمن کلاہی کیا
نشاط فصل بہاراں دلوں پہ چھای کیا
کہو حکمت کیسویں فسانہ قدیار
شکستہ دار و رسن کا زمانہ آہی کیا

محفل یاراں

برگ گل ہیں کہ کب پائے ٹھہریں ساقی
ہیں حنائی قدم پاؤ بہاراں ساقی
لے کے آئی ہے مباحثہ جہن وصال
ہے جواں نکھوت فردوس کھنکھریں ساقی
ماہ رو ہوں افق ساغر ذمیتا سے طلوع
جنگلاتی رہے یہ محفل یاراں ساقی

پراگ جون 1955

XXXXX

جشن بادہ گساراں

یہ عید وصالِ یاراں ہے
یہ جشنِ بادہ گساراں ہے
ہتے ہوئے کھڑوں پہ کیے خنجر سے چٹکتے گتے ہیں
اللہ نے فروغِ بادہ دے، ٹھہر رہے ہیں گتے ہیں
مہتاب دیکھتے گتے ہیں، خورشید چمکتے گتے ہیں
گردش میں نظامِ جام و سیر یا رقصِ شعلہ خدایاں ہے

یہ عید وصالِ یاراں ہے
ہیں وجد میں دُڑے گیتی کے گردوں کے ستارے گاتے ہیں
نغمات کے گیسو کھلتے ہیں، تل کھاتے ہیں لہراتے ہیں
الفاظ کے چکر میں ڈھل کر، سچی کے حسین اتراتے ہیں
کیا خسی طلم صوت و صدا کیا چلوئے خوش گفتاراں ہے

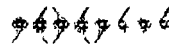
یہ عید وصالِ یاراں ہے
ہینائے شفق لہراتی ہے، یا جام میں سورج ڈھلتا ہے
پتوں اور پیالوں کے آغوش سے چاند نکلتا ہے
ہر قطرہ سے کے سینے سے اک سیل نور اُبلتا ہے
چھائی ہوئی ساری محفل پر ہوئے قرویں کناروں ہے

یہ عید وصالِ یاراں ہے

آنکھوں کو شفق آلودہ خوں، پلکوں کو گل افشاں رکھتے ہیں
 ہم فکر سحر کی شمعوں سے، راتوں کو فروزاں رکھتے ہیں
 ہم چاک گریباں میں اپنے، سو مہر درخشاں رکھتے ہیں
 یاں رقص میں صمیں رہتی ہیں، یہ تھل شب بیداراں ہے

یہ عید وصالِ یاراں ہے
 وہ آئے یہاں جو رکھتا ہو مرنے کی تڑپ بینے کی لگن
 وہ آئے جو بینے پر اپنے زخموں کا کھلا سکتا ہوں چمن
 دنیا کی شہادت گاہ میں ہو جو اپنے لبو سے سرخ کفن
 ہے چاک جگر کی شرط یہاں یہ حلقہ دل انگاراں ہے

یہ عید وصالِ یاراں ہے
 یہ جشنِ بادہ گساراں ہے



مرے عزیز و مرے رفیقو

(سلطانہ نے ایک خط لکھا کہ یہ لوگ تمہاری کیونزم سے خائف ہیں)

مرے عزیز و مرے رفیقو
مری کیونزم سے ہو خائف
مری حمٹا سے ڈر رہے ہو
مگر مجھے کچھ بھلا نہیں ہے
تمہاری روحوں کی سادگی سے
تمہارے دل کی صنم مری سے

مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے
کہ جیسے بیگانہ ہو ابھی تک
تم اپنے امدانہ دلبری سے
کہ جیسے واقف نہیں ابھی تک
شگروں کی شگری سے
فریب نے جن کے آدمی کو
حقیر و بزدل بنا دیا ہے
حقیقتوں کے مقابلے میں
فرار کرتا سکھا دیا ہے

تھیں یہ جس دن پڑ پڑے گا
 حیات سب کا نہیں ہے
 حیات میں تل نہیں ہے
 یہ ایک فحش بک کر
 ایک نیرنگ جام سے ہے
 طلق بھرتی ہے یا حلق
 طلق و افسردہ تنگ
 غم تو غم نے ہے
 تھیں یہ جس دن پڑ پڑے گا
 تھیں کہی کے پڑے
 تھیں میں مل نہیں گے
 یہ تم نے کیسے سمجھ لیا ہے
 کہ مل مارا غم سے ہے غم
 موت نظر حسن سے ہے غم
 قریب آؤ تھیں
 مجھے عیت ہے آتی سے
 مجھے عیت ہے تنگی سے
 مجھے عیت ہے مہینوں
 سے گل رخیں سے کہیں بھول سے
 کہیں سے، وہیں سے، جہاں سے
 سے، پھر وہیں سے، مستعد سے

مری نگہ میں بے ہوئے ہیں
 ہزار اندازِ دلربائی
 میں اپنے سینے کو چاک کر کے
 اگر تھیں اپنا دل دکھاؤں
 تو تم کو ہر زخم کے چمن میں
 ہزار سروِ ہواں ملیں گے
 اداسِ مغومِ وادیوں میں
 ہزار ہا نغمہ خواں ملیں گے
 ہزار عارض، ہزار شمعیں
 ہزار قامت، ہزار نرلیں
 سبکِ خرماں غزال جیسے
 ہزار اسماں ہزار امیدیں
 ملک پہ تاروں کے جال جیسے

مگر کوئی توڑ دے رہا ہے
 لرزتی مرگاہاں کے نشتروں کو
 دلوں کے اندر اتارتا ہے
 کوئی سیاست کے خنجروں کو
 کسی کے زہریلے تیز ناخن
 عقاب کے پنجہ ہاے خونیں
 کی طرح آنکھوں پہ آ رہے ہیں
 گلاب سے تنِ مثال لعل
 زمین پر تھلا رہے ہیں

جو پیاس پانی کی منتظر تھی
 وہ سولیوں پر مٹکی ہوئی ہے
 وہ جھوک روٹی جو ماتحت تھی
 سلیب زر پر چڑھی ہوئی ہے
 یہ ظلم کیا، تم یہ لیا ہے
 میں سوچتا تھا یہ لیا جنوں ہے
 جہاں میں تان جویں کی قیت
 سی کی مصمت، کسی کا نول ہے

تمہیں بتاؤ میرے عزیز،
 میرے رفیقو، تمہیں بتاؤ
 یہ زندگی پارہ پارہ کیوں ہے
 ہماری پیاری حسیں زمیں پر
 یہ قتل گبد کا نظارہ کیوں ہے
 مجھے بتاؤ کہ آج کیسے
 سیاہ بارود کی لکیریں
 کٹیلے کاہل، جیلے سرے
 کے بالکل سے الجھ گئی ہیں
 خزاں کے کانتوں کی انکھیاں کیوں
 ہر اک چمن سے الجھ گئی ہیں
 مجھے بتاؤ لہو نے کیسے
 حنا کے جاود کو دھ دیا ہے
 مہیات کے پیرہن کو انساں

کے آنکھیں نے مجھ کو دیا ہے
 عا کو تو مجھے عا
 کہ عا تو میں نے عا
 عا کو تو مجھے عا
 کہ عا میں چمکے ہیں مجھ کو

مرے مرے مرے مرے
 مری کینم کچھ نہیں ہے
 یہ عید حاضر کی آہ ہے
 مری کینم مری کینم
 جس طے کی آہ ہے
 یہ ایک صمیم جھوٹ ہے
 تمہارے دل میں بھی شاید ایسی
 کئی جوں میں آہ ہے
 کئی دہلی دہلی صراحتی
 کئی جہاں جہاں
 قضا یہ مجھ کو مرے مرے
 مرے مرے قضا یہ میرے
 تمہارے پیچھے میں گیا نہیں ہے
 تمہاری غمگیناں نے جاگ اٹھی گی
 تمہارے قدموں میں جو نہیں ہے
 بس ایک آہی کھی ہے یاد
 کہ تپتی یاد یہ تپتی ہے

تمہاری آنکھوں میں نی ہے سب چم
 تمہاری آنکھوں میں سب جہاں ہے
 تمہاری پللوں ے نیچے مہرتی
 تمہاری پللوں پر آماں ہے
 تمہارے ہاتھوں کی جنبشوں میں
 ہے جوئے رنگ بہار دیکھو
 نہ دیکھو اس ہستون غم کو
 تم اپنے تیشوں کی دھار دیکھو

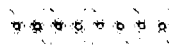
تم اپنے تیشے اٹھا کے لاؤ
 میں لے کے اپنی کدال نکلوں
 ہزار ہا سال کے مصائب
 ہزار ہا سال کے مظالم
 جو روح و دل پر پہاڑ بن کر
 ہزار ہا سال سے دھڑکیں
 ہم اپنے تیشوں کی ضرب کاری
 سے ان کے سینوں کو چھید ڈالیں
 یہ ہے صرف ایک شب کی محنت
 جو عہد کر لیں تو، ہم سحر تک
 حیات نو کے نئے آجیتا
 نئے ایورا تراش ڈالیں

اکتوبر 1956

نذر عقیدت

لیے سینے میں اپنے امنِ عالم کی مُراد آیا
 دیارِ ہند سے ہیں سوئے استالنِ گِراد¹ آیا
 صدا دی والگا کی موج نے ختمِ مسافت پر
 ادب سے پاؤں رکھنا اس زمینِ عزم و ہمت پر
 بچے ہیں خاک کے سینے پہ سینے سوراخوں کے
 یہاں قدموں کے نیچے دل دھڑک اٹھتے ہیں ماؤں کے
 بہاروں کی حفاظت کی ہے جاں دے کر جیالوں نے
 لہو بو کر اگا کی فصلِ گلِ نازک خیالوں نے
 یہاں سے جنگ کا اور موت کا سیل جنوں گزرا
 یہاں سے سیلِ آہن، سیلِ آتش، سیلِ خوں گزرا
 یہاں کی آندھیاں شعلہ بناتی ہیں شراروں کو
 ہوائیں تیز کر دیتی ہیں تلواروں کی دھاروں کو
 ہراک ذرہ یہاں پیکر ہے جرأتِ آزمائی کا
 یہاں ہے امتحاںِ سردار کی آتشِ نوائی کا
 وفورِ اشکِ خوں میں کھو کیا جوشِ خطاب اپنا
 ادب سے رکھ دیا گنجِ شہیداں پر رباب اپنا

جولائی 1955



غزل

میں جہاں م • باتا ہوں • ہاں تک •
 میری نظروں سے گزر لبرل و جاں تک •
 پھر یہ دیکھ لے زمانے کی ہوا سے کتنی
 ساتھ میرے مرے فردوس جواں تک آ •
 وصلہ ہوتا • ارو میرے تصور کی طرح
 میری تخیل سے کلزار جتاں تک •
 تیغ کی طرح چلو پھوڑے آغوش نیام
 تیرے کی طرح سے آغوش کہاں تک آ •
 پھول کے • پھر و بانگ میں مانند نیم
 مثل پرواز کی شمع تپاں تک آ •
 لو وہ صدیوں کے جہنم کی مدیں ختم ہوئیں
 اب ہے فووس ہی فردوس جہاں تک آ •
 تچہ زکروا تم و کہاں حسن یقیں تک پہنچو
 پر یقیں سے بھی کبھی وہم و گماں تک آؤ
 اسی دنیا میں دکھائیں تمہیں جنت کی بہار
 شیخ جی تم بھی ذرا کوئے بتاں تک آؤ

جام محبت

بزمِ احباب ہے چہانہ گزرتک اٹھائیں
شکوہِ جور و جفا غرقِ مئے ناب کریں
بادِ سرخ کے خورشیدِ درخشاں کو جگائیں
آج ہر ساغرِ بلور کو مہتاب کریں
ایک ہی گھونٹ میں چہروں کے کنول نکل جائیں
رات کے سیلِ سیاہ رنگ کو شاداب کریں
پیتاس کے دستِ جگر تاب میں دل جلتا ہے
دوستو آؤ! علانِ دلِ بیتاب کریں
لطف تو جب ہے کہ نئے ہوئے دلِ نوجو جائیں
آج اس طرح سے کچھ خاطرِ احباب کریں
چند جام اور ابھی روح کے تر ہونے تک
چند جام اور شبِ غم کی سحر ہونے تک

سورنگ

اس محفلِ صدرتک میں سورنگ میں میرے
 ہر رنگ میں رقصاں ہوں کھلتاں جہاں میں
 خوشبو کی طرح کا گل چپچاں کی گلی میں
 شعلے کی طرح انجمنِ شعلہ رخاں میں
 شیشہ بکف لشکرِ اعدائے وطن میں
 پیانہ بکف محفلِ پیانہ کشاں میں
 تلوار کی آغوش میں فولاد کے مانند
 تیغ کی طرح کارمہ شیشہ گراں میں
 نشتر کی طرح تیز دل اہل ہوس میں
 مانند شرر گرم رگ سنگِ گراں میں
 کانٹے کی طرح دیدہ اربابِ ستم میں
 سرے کی طرح چشمِ حسینانِ جہاں میں
 خورشید جہاں تاب کا ساگر بھی پکھل جائے
 وہ آتشِ سیال ہے پیانہ جاں میں
 بت خانہ عالم میں ہوں مصروفِ پرستش
 جس طرح برہمن ہو کوئی کوئے بتاں میں

غزل

لغزش گام لیے لغزشِ مستانہ لیے
 آئے ہم بزم میں پھر جرأتِ زندانہ لیے
 عشق پہلو میں ہے پھر جلوہ جاناں لیے
 زلف اک ہاتھ میں، اک ہاتھ میں پیاناں لیے
 یاد کرتا تھا ہمیں ساقی و مینا کا ہجوم
 اٹھ گئے تھے جو کبھی رونقِ میخانہ لیے
 وصل کی صبحِ شبِ ہجر کے بعد آئی ہے
 آفتابِ رخِ محبوب کا نذرانہ لیے
 عصرِ حاضر کو مبارک ہو نیا دورِ عوام
 اپنی ٹھوکر میں سرِ شوکتِ شاہانہ لیے

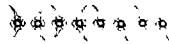
}}}}}}

غزل

تخلیق پہ فطرت کی نثر رتا ہے مہاں اور
 اس آدمِ خاکی نے بنایا ہے جہاں اور
 یہ صبح ہے سورج کی سیاہی سے اندھیری
 آئے گی ابھی ایب سحر مہر چکاں اور
 بڑھتی ہے ابھی اور ابھی مظلوم کی طاقت
 مٹھنی ہے ابھی ظلم کی پچھ تاب و تواں اور
 تر ہو گی زمیں اور ابھی خونِ بٹہ سے
 روئے گا ابھی دیدہ خونا بہ فشاں اور
 بڑھنے دو ذرا اور ابھی پچھ دستِ طلب کو
 بڑھ جائے گی وہ چار شکن زلفِ بتاں اور
 کرتا ہے ابھی خونِ جگر صرف بہاراں
 پچھ دیر اٹھاتا ہے ابھی نازِ خزاں اور
 ہم ہیں وہ بلا کش کہ مصائب سے جہاں کے
 ہو جاتے ہیں شائستہ غم ہائے جہاں اور

غزل

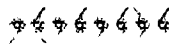
کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا
 راستے بند ہیں سب کو چہ قاتل کے سوا
 باعث رشک ہے تہاروی رہرو شوق
 ہم سفر کوئی نہیں دوری منزل کے سوا
 ہم نے دنیا کی ہر اک شے سے اٹھایا دل کو
 لیکن اس شوخ کے ہنگامہ محفل کے سوا
 تیغ منصف ہو جہاں، دارورن ہوں شاہد
 بے گنہ کون ہے، اس شہر میں قاتل کے سوا
 جانے کس رنگ سے آئی ہے گلستاں میں بہار
 کوئی نغمہ ہی نہیں شورِ سلاسل کے سوا



غزل

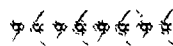
کھلے ہیں مشرق و مغرب کی گود میں گلزار
 مگر خزاں کو میسر نہیں یقین بہار
 خبر نہیں ہے ہموں کے بنانے والوں کو
 تمیز ہو تو مہ و مہ، کھکشاں میں شکار
 اسی سے تیغ نگہ آب دار ہوتی ہے
 تجھے بتاؤں بڑی شے ہے جرأت انکار
 کیے ہیں شوق نے پیدا ہزار ویران
 اک آرزو نے بسائے ہیں اکھ شہر دیار
 نشاط صبح بہاراں تجھے نصیب نہیں
 ترے نگہ میں ہے جیتی ہوئی شبیوں کا خمار
 فروخت ہوتی ہے انسانیت سی جنس گراں
 جہاں کو پھونک نہ دے گی یہ گرمی بازار
 یہی ہے زمخت و آرائش عروسِ خن
 مگر فریب بھی دیتی ہے شوخی گفتار

1954



غزل

ظلم کی کچھ میعاد نہیں ہے
 داد نہیں فریاد نہیں ہے
 قتل ہوئے ہیں اب تک کتنے
 کوئے ستم کو یاد نہیں ہے
 آخر روئیں کس کو کس کو
 کون ہے جو برباد نہیں ہے
 قید، چمن بھی بن جاتا ہے
 مرغ چمن آزاد نہیں ہے
 لطف ہی کیا گر اپنے مقابل
 سطوت برق و باد نہیں ہے
 سب ہوں شاداں سب ہوں خنداں
 تنہا کوئی شاد نہیں ہے
 دعوتِ رنگ و نکہت ہے یہ
 خندہ گل برباد نہیں ہے



غزل

ہم جو محفل میں تری سینہ فگار آتے ہیں
 رنگ بر دوش ، گلستاں بہ کنار آتے ہیں
 چاک دل ، چاک جگر چاک گریباں والے
 مثل گل آتے ہیں، مانند بہار آتے ہیں
 کوئی معشوق سزاوار غزل ہے شاید
 ہم غزل لے کے سوئے شہر نگار آتے ہیں
 کیا وہاں کوئی دل و جاں کا طلبگار نہیں
 جا کے ہم کو چہ قاتل میں پکار آتے ہیں
 قافلے شوق کے رکستے نہیں دیواروں سے
 سینکڑوں محسوس زنداں کے دیار آتے ہیں
 منزلیں دوڑ کے رہرو کے قدم لیتی ہیں
 بوسہ پاکے لیے راہ گزار آتے ہیں
 خود کبھی موج و تلاطم سے نہ نکلے باہر
 پار جو سارے زمانے کو اتار آتے ہیں
 کم ہو کیوں ابروئے قاتل کی کمانوں کا کھنچاؤ
 جب سر تیر ستم آپ شکار آتے ہیں

غزل

کتنی آشاؤں کی لاشیں سوھیں دل کے آگن میں
 کتنے سورج ڈوب گئے ہیں چروں کے پیلے پن میں
 بچوں کے بیٹھے ہونوں پر پیاس کی سوکھی ریت جی
 دودھ کی دھاریں گائے کے تھن سے گر گئیں ناگوں کے پھن میں
 ریگستانوں میں جلتے ہیں پڑے ہوئے سو نقش قدم پر
 آج خراماں کوئی نہیں ہے امیدوں کے گلشن میں
 چکناچور ہوا خوابوں کا دلکش، دلچسپ آئینہ
 میزی ترچھی تصویریں ہیں ٹوٹے پھوٹے درپن میں
 پائے جنوں میں پڑی ہوئی ہیں حرص و ہوا کی زنجیریں
 قید ہے اب تک ہاتھ سحر کا تاریکی کے کٹن میں
 آنکھوں کی کچھ نورس کلیاں نیم شگفتہ غنچہ لب
 کیسے کیسے پھول بھرے ہیں گلچنبوں کے دامن میں
 دستِ غیب کی طرح چھپا ہے ظلم کا ہاتھ ستم کا دار
 خشک لہو کی بارش دیکھی ہم نے کوچہ و برزن میں

غزل

یاد آئے ہیں مہرِ جنوں سے لھوئے دیوے ، سردارِ بہت
 ان سے دور بسائی ہستی ، جن سے ہمیں تھا پیار بہت
 ایک اک لڑکے اٹھتی تھیں ، کلیاں ایک اک سرے چول گئے
 ایک اک کر کے ہم سے بچھڑے باغِ جہاں میں یار بہت
 حسن سے جلوے مام ہیں لیکن ذوقِ تنظارہ مام نہیں
 عشق بہت مشکل ہے لیکن عشق بے دلوے دار بہت
 رزم ہو یا اٹھتی کلیاں ، ہاتھ گمراہ گلدستہ ہے
 باغِ وفا سے ہم نے چنے ہیں پھول بہت اور خار بہت
 جو بھی ملا ہے لے آئے ہیں داغِ دل یا داغِ جگر
 وادی وادی منزل منزل بھٹکے ہیں سردار بہت

لمحوں کے چراغ

وہ نیند کی طرح نرم سبزہ
 خوابوں کی طرح رمیدہ شبنم
 پھولوں کی طرح ٹگفتہ چہرے —
 خوشبو کی طرح لطیف باتیں
 کرنوں کی طرح جواں تبسم
 شعلے کی طرح دہکتی خوابش
 تاروں کی طرح چمکتی آغوش
 سانہ کی طرح پھسلکتے سینے
 سب قافلہٴ عدم کے راہی
 وادیٔ عدم میں چل رہے ہیں
 تاریکیوں کے کھلے ہیں پرچم
 لمحوں کے چراغ جل رہے ہیں
 ہر لمحہ حسیں اور جواں ہے
 ہر لمحہ فروغ جسم و جاں ہے
 ہر لمحہ عظیم و جاوداں ہے



یہ زندگی ہے

یہ زندی ہے طویل کتنی
 یہ زندی کتنی مختصر ہے
 کبھی شبِ جبر ہے کبھی یہ
 وصالِ محبوب کی سحر ہے
 کبھی خزاں کی طویلِ غریبوں
 میں انتظارِ بہار جیسے
 کبھی سرت کے ایک لمحے
 میں جہشِ چشمِ یار جسے
 بھی روش ہے چمن کی لیلین
 کبھی یہ سحرا کی رہنمائی ہے
 یہ زندی ہے طویل کتنی
 یہ زندی کتنی مختصر ہے

حسین تر

تل ایک تو ہوئے اور اک میں
کوئی رقیب رفیق صورت
کوئی رفیق رقیب سماں
مرے ترے درمیاں نہ ہوگا

ہماری عمر رواں کی شبنم
تری سیہ کاکلوں کی راتوں
میں تار چاندی کے گوندھ دے
ترے حسین عارضوں کے رئیس
گلاب نیلے کے پھول ہوں گے
شوق کا ہر رنگ غرق ہو گا
لطیف • پر کیف چاندنی میں
تری کتابِ ربخ جواں پر
کہ جو غزل کی کتاب ہے اب
زمانہ اچھے مٹا اک کہانی
اور ان گنت جھڑیوں کے اندر
مری محبت کے سارے بوسے
نثار لب بن کے فہم پڑیں کے

میرا سفر

’ہمچو ہنرہ بار بار ونید ایم‘

(رومی)

پھر اک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیئے بجھ جائیں گے
ہاتھوں کے کنول کھلایں گے
اور برگ زباں سے نطق و صدا
کی ہر تتلی اڑ جائے گی
اک کالے مندھ کی تہہ میں
کلیوں کی طرح سے کھلتی ہوئی
پھولوں کی طرح سے ہنستی ہوئی
ساری شکلیں کھو جائیں گی
خوں کی گردش، دل کی دھڑکن
سب راگنیاں سو جائیں گی
اور نیلی فضا کی مٹل پر
ہنستی ہوئی ہیرے کی یہ کئی
یہ میری جنت میری زمیں
اس کی صہیں اس کی شامیں
بے جانے ہوئے بے سمجھے ہوئے

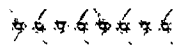
اک محبتِ غبارِ انسان پر
 تبسم کی طرح رو جائیں گی
 ہر چیز بھلا دی جائے گی
 یادوں کے حسیں بت خانے سے
 ہر چیز اٹھا دی جائے گی
 پھر کوئی نہیں یہ پوچھے گا
 سردار کہاں ہے محفل میں

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
 بچوں کے دہن سے بولوں گا
 چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
 جب سچ نہیں گے دھرتی میں
 اور کونٹیں اپنی انگلی سے
 مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
 میں پتی پتی، ٹلی ٹلی
 اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا
 سر سبز ہتھیلی پر لے کر
 شبسم کے قطرے تولوں گا
 میں رنگِ حنا، آہنگِ غزل
 اندازِ سخن بن جاؤں گا
 رخسارِ عروں نو کی طرح
 ہر آنکھ سے چھن جاؤں گا
 جائزوں کی ہوائیں دامن میں
 جب فصلِ خزاں کو لائیں گی
 رہرو کے جواں قدموں کے تیلے

سوکھے ہوئے پتوں سے میرے
 بننے کی صدائیں آئیں گی
 دھرتی کی سنہری سب ندیاں
 آکاش کی نیلی سب جھیلیں
 بستی سے مری بھر جائیں گی
 اور سارا زمانہ دیکھے گا
 ہر قصہ مرا افسانہ ہے
 ہر عاشق ہے سردار یہاں
 ہر معشوقہ سلطانہ ہے

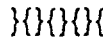
میں ایک ٹریریاں لمحہ ہوں
 ایام کے افسوں خانے میں
 میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
 مصروف سفر جو رہتا ہے
 ماضی کی صراحی کے دل سے
 مستقبل کے پیمانے میں
 میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں
 اور جاگ کے پھر سو جاتا ہوں
 صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں
 میں مر کے امر ہو جاتا ہوں

1956



کوچہ چاک گریباں

دل وحشی کو دیا دستِ جنوں نے مژدہ
 کوچہ چاک گریباں میں بہار آئی ہے
 آج دیوانوں کو ہر چیز مینر ہو گی
 درد کی شمع، تھوڑ کا پری خانہ بھی
 اور تمناؤں کی گل چہرہ کنیزوں کا ہجوم
 زخم سر، زخمِ جگر اب بہت ارزاں ہوں گے
 وحشتِ دل کے لیے دشتِ ویلیاں ہوں گے
 راہ میں دار و رسنِ محسوس زنداں ہوں گے
 کوچہ یار میں مر رہنے کے ساماں ہوں گے
 کوچہ چاک گریباں میں بہار آئی ہے



ایک بات

اس پہ بھولے ہو کہ ہر دل کو کچل ڈالا ہے
اس پہ بھولے ہو کہ ہر گل کو مسل ڈالا ہے
اور ہر گوشہ گلزار میں سناٹا ہے

کسی سینے میں مگر ایک فغاں تو ہو گی
آج وہ کچھ نہ سہی کل کو جواں تو ہو گی

وہ جواں ہو کے اگر فحلۂ جوالہ بنی
وہ جواں ہو کے اگر آتش صد سالہ بنی
خود ہی سوچو کہ تسم گاروں پہ کیا گزرے گی

}}}}{

نوالا

ماں ہے ریشم کے کارخانے میں
 باپ مصروف سوتی مل میں ہے
 کوکھ سے ماں کی جب سے نکلا ہے
 بچہ کھولی کے کالے دل میں ہے
 جب یہاں سے نکل کے جائے گا
 کارخانوں کے کام آئے گا
 اپنے مجبور پیٹ کی خاطر
 بھوک سرمائے کی بڑھائے گا
 ہاتھ سونے کے پھول اگلیں گے
 جسم چاندی کا دھن لٹائے گا
 کھڑکیاں ہوں گی بینک کی روشن
 خون اس کا دیئے جلائے گا
 یہ جو ننھا ہے بھولا بھالا ہے
 صرف سرمائے کا نوالا ہے
 پوپھستی ہے یہ اس کی خاموشی
 کوئی مجھ کو بچانے والا ہے

دو چراغ

تیرگی کے سیاہ غاروں سے
شہیروں کی صدائیں آتی ہیں
لے کے جھوکوں کی تیز تلواریں
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں
برف نے جن پہ دھار رکھی ہے

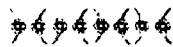
ایک میلی دکان تیرہ و تار
اک چراغ اور ایک دوشیزہ
یہ بھی سی ہے وہ اداس سا ہے
دونوں جاڑوں کی لمبی راتوں میں
تیرگی اور ہوا سے لڑتے ہیں

تیرگی اٹھ رہی ہے میاں سے
فوج در فوج بادلوں کی طرح
اور ہواؤں کے ہاتھ ہیں گستاخ
توڑے لیتے ہیں ننھے شعلے کو
نوپے لیتے ہیں میلے آنچل کو

لڑکی رہ رہ کے جسم ڈھانپتی ہے
 شعلہ رہ رہ کے تھر تھراتا ہے
 ننگی بوڑھی زمین کانپتی ہے

تیرگی اب یہ سمندر ہے
 اور ہوا ہو گئی ہے دیوانی
 یا تو دونوں چراغ گل ہوں گے
 یا کریں گے وہ شعلہ افشانی
 پھونک ڈالیں گے تیرگی کی متاع

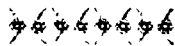
پر مجھے اعتماد ہے ان پر
 گو غریب اور بے زبان سے ہیں
 دونوں ہیں آگ دونوں ہیں شعلہ
 دونوں بجلی کے خاندان سے ہیں



دردِ عشق

(ایک پرانی تصویر دیکھ کر)

نار تیری خموشی کے اے نگارِ جواں
 نگارِ شعلہ طراز و نگارِ نغمہ نواز
 نگاہیں دیکھ رہی ہیں مری طرف اب بھی
 مگر تکلف نہیں غنچہ لب و آواز
 خبر نہیں کہ تجھے بھی ہے کچھ خبر اس کی
 کہ بجتے رہتے ہیں پھر بھی جو ٹوٹ جاتے ہیں ساز
 بھٹکتی رہتی ہے اکثر شکستِ دل کی صدا
 تڑپتی رہتی ہے سینے میں آرزوئے نیاز
 بیمارِ عشقِ جواں مرگِ صورتِ گلِ نو
 مثالِ خارِ مگر عمرِ دردِ عشقِ دراز



اہل درد

کوئی مقام نہیں اہل درد کے قابل
 کوئی بہشت نہیں اہل آرزو کے لیے
 تمام صحن چمن مقتلِ تمنا ہے
 نفن لہو کا ملا ذوقِ جستجو کے لیے
 ہوئے شکارِ کبھی تیغِ دوست کی خاطر
 ہدف بنے ہیں کبھی ناکِ عدو کے لیے
 لیا ہے ہنس کے کبھی سبکِ محبت سر پر
 سپر ہوئے ہیں کبھی ساغرِ دسیو کے لیے
 کبھی مثالِ نسیم بہارِ آوارہ
 کسی خیال کے گیسوئے مشک بو کے لیے
 نشیبِ خاک کبھی شوقِ خاکساری میں
 فرازِ دار کبھی عظمتِ گلو کے لیے
 وفائے عشق سے کوئی خفا نہیں لیکن
 بس ایک تیغ کہ پیاسی ہے جو لہو کے لیے
 اب آج پھرتے ہیں بے آبرو تو غم کیا ہے
 وطن عزیز وطن تیری آبرو کے لیے



دو شعر

ہر منزل اک منزل ہے نئی اور آخری منزل کوئی نہیں
اک سیلی روانِ در و حیات اور درد کا ساحل کوئی نہیں

ہر گام پہ خوں کے طوفاں ہیں، ہر موڑ پہ سکل رقصاں ہیں
ہر لحظہ ہے قتل عام مگر کہتے ہیں کہ قاتل کوئی نہیں



دو شعر

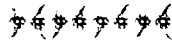
یہ نہ پوچھ تیری جفاؤں کے جو ہوئے شکار کہاں گئے
ترے کوچے ہی میں وہ دفن ہیں وہ وفا شعار کہاں گئے

کبھی دیکھا لکھنؤ دلیس میں، کبھی ڈھونڈا دلی دیار میں
جنہیں کج ادائیاں آتی تھیں وہ ہمارے یار کہاں گئے



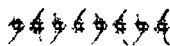
دو شعر

شوق کی راہ میں گل اور کبھی خار ملے
 ہم کو ہر طرح کے ہر رنگ کے دلدار ملے
 دھوم تھی شہر زلیخا کے شبستانوں کی
 کتنے یوسف تھے کہ زسواسر بازار ملے



دو شعر

عشق پابندیِ آداب سے چھوٹا تو سہی
 حاصلِ عمر ہے اک لغزشِ پا اے ساقی
 اس اندھیرے میں کہ ملتی نہیں انسان کو راہ
 صرف تابندہ ہے شاعر کی نوا اے ساقی



غزل

خزاں ہے چار دن کی پھر بہاراں
 چمن، محبوب، جشنِ مے کساراں
 کڑی ہے زندگی کی دھوپ لیکن
 ہری شاخِ نہالِ یادِ یاراں
 مبارک سُرْمۂ مژگانِ خوباں
 سلامت دشنۂ چشمِ نگاراں
 خوشا معشوقی عاشقِ نوازاں
 زہے محبوبی یزداں شکاراں
 وہ شامِ شوخی شعلہ فروشاں
 وہ صبحِ جلوۂ آتشِ عذاراں
 یہ فصلِ نعرہ ہائے انقلابی
 بھی ہے موسمِ صورتِ ہزاراں
 فضا میں دیر سے ہیں امہ آلود
 کہاں ہے کاروانِ برق و باراں



تین شعر

خونِ دل ہے تو رواں رنُبِ بہاراں نہ سہی
 مائے غم ہے جواں، صوتِ ہزاراں نہ سہی

روحِ درد تو ہے رشک و حسد کی صورت
 میری قسمت میں نہیں الفتِ یاراں نہ سہی

دل کی تسکین کے لیے کم نہیں سامانِ نشاط
 شبِ مہتاب سہی، صبحِ بہاراں نہ سہی

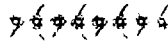


غزل

شبوں کی، زلف کی، روئے سحر کی خیر مناء
 نگار شمسِ عروسِ قمر کی خیر مناء
 سپاہِ دشمنِ انسانیتِ قریب آئی
 دیارِ حسنِ سرِ رہ گزر کی خیر مناء
 ابھی تو اوروں کے دیوار و در پہ یورش تھی
 اب اپنے سایہِ دیوار و در کی خیر مناء
 چلی ہے آتش و آہن کے دل سے بادِ سموم
 چمن کے جلوہ گھبائے تر کی خیر مناء
 گزرنہ جائے کہیں بحر و بر سے خون کی دھار
 فروغِ شبنم و آب و گہر کی خیر مناء
 یہ نفع خوروں کی دانشِ فروشِ دنیا ہے
 متاعِ علم کی، جنسِ بنر کی خیر مناء
 مرے لیے ہے مری مفلسی و ناپاکی
 تم اپنی پاکی قلب و نظر کی خیر مناء

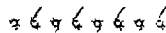
تخلیق کا کرب

ابھی ابھی مری بے خوابیوں نے دیکھی ہے
فضائے شب میں ستاروں کی آخری پرواز
خبر نہیں کہ ادھیرے کے دل کی دھڑکن ہے
کہ آ رہی ہے اجالوں کے پاؤں کی آواز
بتاؤں کیا تھے نغموں کے کرب کا عالم
لہو لہان ہوا جا رہا ہے سینہ ساز



دو شعر

برگ خشک و زرد بھی ہے گلستاں کو سازگار
ہے خزاں آئینہ دار حسن تجدید بہار
ہے ہمیشہ سے یہی افسانہ پست و بلند
حرف باطل زب مہر، حرف حق بالائے دار



دو شعر

تمام رات اندھیرے کا جسم جلتا رہا
تمام رات چنخٹا رہا سیاہ بلور

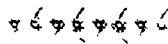
تمام رات ستاروں کی طرح پلکوں پر
لرزتے اشک سناتے رہے حکایت نور



دو شعر

کسی حسیں نہ کسی دُربا کی بات کرو
کرو تو اس بُتِ کافر ادا کی بات کرو

شکست وعدہ محبوب سے اداس ہو کیوں
پھر ایک وعدہ صبر آزما کی بات کرو



دو شعر

پسند کیوں قاتلوں کو آئیں ہمارے زخمِ لبّی کی باتیں
 سناؤ پچھلوں کا ذکر ان کو، کر، چھو ان سے چمن کی باتیں
 حسین ہے آرزو تو اسے دلِ حسین ہو حرفِ آرزو بھی
 کریں گے اس یارِ سرو قد سے ہم آج سروِ من کی باتیں

ۛ ۛ ۛ ۛ ۛ ۛ ۛ ۛ

تین شعر

یہ بوئے گل ہے کہ ہے بوئے پیرِ من تیری
 ہری بھری رہے اے دوستِ انجمن تیری
 تمام سینہ سحر ہے تمام روحِ شفق
 کہ دل سے پھوٹ رہی ہے مرے کرن تیری
 مری نظر کا ہے جادو کہ تیرے حسن کا سحر
 بہار پھیل گئی ہے چمن چمن تیری

ۛ ۛ ۛ ۛ ۛ ۛ ۛ ۛ

سلام

مری وفا کی طرف سے چلی ہے لے کے صبا
 مرے حبیب تری دلنوازیوں کو سلام
 تری نگاہ محبت سے دل کی وادی میں
 کیا ہے آ کے بہاروں کے قافلہوں نے قیام
 چھلکتے ہیں مری یادوں کے میکدے میں ابھی
 وہ تیرے پیار کے ساغر ترے شباب کے جام
 افق پہ میرے تھوڑے کے کانپتا ہے ابھی
 نیاز و ناز کی بیتی شبیوں کا ماہ تمام
 دلتی ہے میرے سینے پہ تیرے رخ کی سحر
 مہکتی ہے مرے شانوں پہ تیری زلف کی شام
 سرور عشق کی پابندیوں کا ضامن ہے
 دل و جگر پہ تری دلبری کا نقش دوام
 ترا خیال کچھ اس طرح دل میں آتا ہے
 کہ جیسے ساز کے تاروں پہ راگنی کا خرام
 کہ جیسے فنجے نورس پہ قطرۂ شبنم
 کہ جیسے سینہ شام پہ بارش البام
 کہ جیسے سرخ لبوں پر سرن تبسم نی

اے جے، یہ دُپٹہ میں عشق کا پیغام
 جو تو نہیں تھی تو اک رہا، بے وا تھی حیات
 ترے بغیر محبت کی زندہ تھی حرام
 تو مل گئی ہے تو آسمان ہیں زیست لی راہیں
 سب سب کی ہے کچھ آج گردش ایام

جنوری 1954

❦❦❦❦❦❦

قطعہ

حسن تیرا کبھی گل اور کبھی مہتاب ہوا
 کبھی آئینہ کبھی مہر جہاں تاب ہوا
 دل بیتاب مرا رگِ رواں کی صورت
 تیرے دیدار کی شبنم سے نہ تیرا ب ہوا

❦❦❦❦❦❦

تین شعر

کنار شوق میں تو اور ہیراں ہے کنار اپنا
 ترے ہونٹوں سے پی کے بڑھ گیا رنجِ خمار اپنا
 جنہیں اپنا سمجھ کر ہم تھے نازاں وہ بھی کیا نکلے
 نہ باقی احترام ان کا نہ باقی اعتبار اپنا
 طلوعِ آدمیت ہے بہت آہستہ آہستہ
 ابھی انسان کو کرتا ہے صدیوں انتظار اپنا
 ❦❦❦❦❦❦❦❦❦❦

تین شعر

جنون زلفِ معنہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
 دماغِ عقلِ معطر نہیں تو کچھ بھی نہیں 1
 بہت حسین سی زندگی کا بت خانہ
 نگاہِ شوقِ صنم گر نہیں تو کچھ بھی نہیں
 جوابِ تلخ لبِ یار ہو کہ بوسہ یار
 اگر وہ قندِ مقرر نہیں تو کچھ بھی نہیں
 ❦❦❦❦❦❦❦❦❦❦

دو شعر

دل ترے لیے ہے پھر، زخم تازہ کی سوغات
آج ظلم پر اپنے، پھر کوئی پشیمان ہے

لیا عجب سحر تک خود آفتاب بن جائے
اک چراغ چلکوں پر شام سے فزاں ہے

❦ ❦ ❦ ❦ ❦ ❦ ❦

قطعہ

ہوائے صبح مشرق جاگ اٹھی ہے
چمن میں آتش گل تیز تر ہے
نگارِ ایشیا ہے گل بداماں
کہ میدِ شعلہ و جہنم شرر ہے

❦ ❦ ❦ ❦ ❦ ❦ ❦

پانچ شعر

جس سے پہچان لیا کرتے تھے دشمن کو کبھی
آپ کا بھی تو کچھ انداز عنایت ہے وہی

یہ فقط طرزِ ادا، رُگِ قبا کا ہے فریب
قدِ ستم کا ہے وہی، ظلم کا قامت ہے وہی

قصرِ ایوان میں نیا جشن ہو یہ ممکن ہے
رہگزاروں میں مگر شورِ قیامت ہے وہی

آکے منزل پہ بھی ملتا نہیں منزل کا سراغ
اپنی گم کردہ رہی ان کی قیادت ہے وہی

گر یہی آپ کا اندازِ ستم رانی ہے
میرے اشعار میں تبلیغِ بغاوت ہے وہی

آبادویرانے

اجنبی لگتے ہیں چھ شہروں کے ایوانوں میں ہم
 کتنے آوارہ ہیں ان آباد ویرانوں میں ہم
 پیاس کی شدت سے جب گھبرا کے پیچ اٹھتی ہے روح
 بجلیاں حل کرنے لگی جاتے ہیں بیانون میں ہم
 اس دیار بیکسی میں زندگی ممکن نہیں
 ہاں مگر زندہ رہیں گے غم کے افسانوں میں ہم
 بوئے آدم، بوئے گل، بوئے وفا ملتی نہیں
 گھوم آئے ہمیں تیرے شبستانوں میں ہم
 آہ یہ جنس فراواں اس قدر تالیاب ہے
 ڈھونڈتے پھرتے ہیں انسانوں کو انسانوں میں ہم

مرے خواب

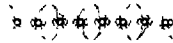
پھر مرے خواب تھوڑے کے جواں شبہ ادے
 مستی شوق کی کلرنگ قبائیں پہنے
 بزمِ امرز میں پیانہ بکف آئے ہیں
 پوچھتے ہیں کوئی پیاسا تو نہیں محفل میں
 کوئی بھوکا تو سرِ راہ نہیں سوتا ہے
 موجِ مے سس نے چھپا رکھی ہے میناؤں میں
 بجلیاں آس نے دبا رکھی ہیں پیاناؤں میں
 سہائی خاموش ہے اور ہیر، مٹھائیں شرمندہ

ایک پھول

میں، لکھ چکا ہوں سب بہاریں
 بیٹھا ہوں گلوں کی انجمن میں
 نکتی ہے لطافت اور نزاکت
 سیلے کی کلی کے کنوارے پن میں
 کیا رنگ کنول کے ہے لبوں پر
 کیا رس ہے گلاب کے دہن میں
 چمپا نے بدن میں ہے جو خوشبو
 ملتی نہیں حور کے بدن میں
 اُک پھول ہے تو بھی شوق و شاداب
 شمع کے لرزاتے چہرہ میں
 لیکن ہے تری امانی پچھ اور
 آتھ اور ہے تیرے ہاتھ میں
 شرمندہ ہیں دختراں گلزار
 گلزار ہے ایسا تیرے تن میں
 جو نکبت و رنگ میں ہو تجھ سا
 اک پھول بھی تو نہیں چمن میں
 پھولوں کی بہشت باغ میں ہے
 اور تیری بہشت میرے من میں
 یہ عمر شگوف کار تیری
 اس آئے تجھے بہار تیری

قطعه

عطا ہوئی ہے مرے دل کی سلطنت تجھ کو
حریم جاں میں اتر شمع دلبری لے کر
آزروفا کے شہستان رنگ و نعمت میں
مزاج آدمی و شیوہ پری لے کر



ترے پیار کا نام

دل پہ جب ہوتی ہے یادوں کی سنہری بارش
سارے بیتے ہوئے لمحوں کے کنول کھلتے ہیں
پھیل جاتی ہے ترے حرف وفا کی خوشبو
کوئی کہتا ہے مگر روح کی گہرائی سے
شدت تشنہ لبی بھی ہے ترے پیار کا نام



جب ترانام لیا

جب ترانام لیا، تو دل سے میرے
 جھگڑاتی ہوئی چھ جملوں راتیں نکلیں
 اپنی پلکوں پہ غائے ہوئے اشلوں کے تیراغ
 سر جھکا کے ہوئے چھ جہری شامیں نریریں
 قافلے کھمے سے پھر در، کے صحراؤں میں
 درد جو تیری طرح نور بھی ہے تار بھی ہے
 دشمن جاں بھی ہے، محبوب بھی، دلدار بھی ہے

۶ ۶ ۶ ۶ ۶ ۶

درد اک چاند ہے

درد اک چاند ہے

ساتا ہے جو سینے میں طلوع

غم ہے اک نشتر نور

جو دل و جاں کے اندھیرے میں اتر جاتا ہے

ۛ ۛ ۛ ۛ ۛ ۛ ۛ ۛ

غم کا ہیرا

غم کا ہیرا

دل میں رکھو

کس کو دکھاتے پھرتے ہو

یہ چوروں کی دنیا ہے

ۛ ۛ ۛ ۛ ۛ ۛ ۛ ۛ

اجنبی آنکھیں

ماری تھیں ان میں، وہیں
 ماری اہیں ان میں کھ میں
 مارے مانوان میں ہوئے
 ماری ہے
 نوق ان آنکھوں میں ہے
 بھٹکتی ہیں وہ مجھے لین بہت بیگانہ وار

✽ ✽ ✽ ✽ ✽ ✽

شعلہ لبی

یہ مری شعلہ لبی
 تشنہ لبی کی تکمیل
 اور تری شعلہ لبی
 آتش سیال کا جام
 کر دیا جس نے حریف لب پیانہ مجھے

✽ ✽ ✽ ✽ ✽ ✽

پیاس بھی ایک سمندر ہے

پیاس بھی ایک - مندر ہے - مندر کی طرح
 جس میں ہر درو کی دھار
 جس میں ہر غم کی ندی ملتی ہے
 اور ہر موج
 لپکتی ہے کسی چاند سے چہرے کی طرف

~~~~~

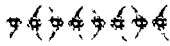
## شعلہ و شبنم

شعلہ ہے ایک نظر ایک نظر ہے شبنم  
 ایک آئینہ صد رنگ تمہارا عالم  
 کبھی دلدار ہو تم اور کبھی پتھر کے صنم  
 تم ہی قاتل ہو مرے تم ہی - میا میرے

~~~~~

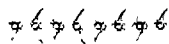
یا قوت لبی

۱۰ دے سکتا ہے یا قوت لبی لی قیمت
کون کر سکتا ہے قرضِ نلہ یار ادا
۱۱ نون عالم ہیں ترے ایک تبسم کا خراج



چاند کو رخصت کر دو

میرے ارہ ازے سے اب چاند کو رخصت کر دو
ساتھ آیا ہے تمہارے جو تمہارے گھر سے
اپنے ماتھے سے بنا دو یہ چمکتا ہوا تاج
پھینک دو جسم سے کرنوں کا سنبری زیور
تم ہی تنہا مرے غم خانے میں آ سکتی ہو
ایک مدت سے تمہارے ہی لیے رکھا ہے
میرے جلتے ہوئے سینے کا دمکتا ہوا چاند
دل خوں گشتہ کا ہنستا ہوا خوش رنگ گلاب



آرزو کے صنم خانے

میں نے جانا تھا کہ اب کچھ بھی نہیں ہے باقی
شکوہِ جور و جفا، شکرِ لطف و کرم
لب ہیں پینے، نہ اندازِ نظر ہے ساتی
مٹ گئی کاہشِ جاں، ختم ہوئی لذتِ غم

یک بیک پھر وہی مدہوش ہوائیں آئیں
کھیلتی رہتی تھیں جو گیسوئے جاناں کے قریب
یک بیک جاگ اٹھے عشق کے خوابیدہ نصیب

آئی پھر خنکی گل، شعلہٴ رخسار کی آنچ
شامِ گیسو کی مہک، صبحِ بدن کی خوشبو
آئے پھر رقصِ کناں دشتِ وفا کے آہو
ایک اک کر کے پٹ آئے گریزاں لمحے
ایک اک کر کے ہوئے سارے ستارے روشن
وہی ہاتھوں کی تمنا وہی رقصیں دامن

دل نے پیچھے سے ہی شوقِ ملاقات کی بات
 گامے آنکھوں سے نئی مامت دیدار کے گیت
 پھر وہی عشقِ نبار اور وہی حسن کی جیت
 چہرہ وہی کاشِ جہاں اور وہی لذتِ غم
 شکوہِ جور، بھلا، شکریہِ لطف و کرم

میں نے جانا تھا اب کچھ بھی نہیں ہے باقی
 آرزو ہے کہ نسیم خانے سجا لائی ہے
 دل میں سولی ملی یادوں کو سجا لائی ہے

تم نہیں آئے تھے جب

تم نہیں آئے تھے جب، تب بھی تو موجود تھے تم
 آنکھ میں نور کی اور دل میں لبو کی صورت
 درد کی لو کی طرح، پیار کی خوشبو کی طرح
 بے وفا وعدوں کی دلداری کا انداز لیے

تم نہیں آئے تھے جب، تب بھی تو تم آئے تھے
 رات کے سینے میں مہتاب کے فخر کی طرح
 صبح کے ہاتھ میں خورشید کے ساغر کی طرح
 شاخِ خوں رنگِ تمنا میں گلِ تر کی طرح

تم نہیں آؤ گے جب، تب بھی تو تم آؤ گے
 یاد کی طرح، دھڑکتے ہوئے دل کی صورت
 غم کے پیانہ سرشار کو چھلکاتے ہوئے
 بگڑے لب و رخسار کو مہکاتے ہوئے
 دل کے بجھے ہوئے انگارے کو دہکاتے ہوئے
 زلف در زلف بکھر جائے گا پھر رات کا رنگ
 شبِ تنہائی میں بھی لطیف ملاقات کا رنگ

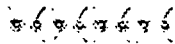
روز اے گی صبا کوئے صبا تے پیام
روز گائے گی سحر تہلیت جس فراق

آؤ آنے کی کریں بات کہ تم آئے ہو
اب تم آئے ہو تو میں کون سی شے نذر کروں
کہ مرے پاس بجز مہر و وفا کچھ بھی نہیں
ایک خوں گشتہ تمنا کے سوا کچھ بھی نہیں

~~~~~

## تو مجھے اتنے پیار سے مت دیکھ

تو مجھے اتنے پیار سے مت دیکھ  
 تیری ہلکوں کے نرم سائے میں  
 دھوپ بھی چاندنی سی لگتی ہے  
 اور مجھے کتنی دور جانا ہے  
 ریت ہے گرم، پاؤں کے چھالے  
 یوں دہکتے ہیں جیسے انگارے  
 پیار کی یہ نظر رہے نہ رہے  
 کون دھتِ وفا میں جلتا ہے  
 تیرے دل کو خبر رہے نہ رہے  
 تو مجھے اتنے پیار سے مت دیکھ



## بہت قریب ہو تم

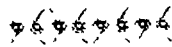
بہت قریب ہو تم، پھر بھی مجھ سے کتنی دور  
 کہ دل کہیں ہے، نظر ہے کہیں، کہیں تم ہو  
 وہ جس کو پی نہ سکی میری شعلہ آشامی  
 وہ کوزہ شکر و جام لکھیں تم ہو

مرے مزاج میں اشتعلی صبا کی ہے  
 ملی کلی کی ادا، گل کی تملنت تم کو  
 صبا کی گود میں، پھر بھی صبا سے بیگانہ  
 تمام حسن و حقیقت، تمام افسانہ

وفا بھی جس پہ ہے نازاں وہ بے وفا تم ہو  
 جو کھو گئی ہے مرے دل کی وہ صدا تم ہو  
 بہت قریب ہو تم، پھر بھی مجھ سے کتنی دور  
 حجاب جسم ابھی ہے، حجاب روح ابھی  
 ابھی منزل صد مہر و ماہ باقی ہے  
 حجاب فاصلہ ہائے نگاہ باقی ہے  
 وصال یار ابھی تک ہے آرزو کا قریب

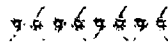
## تمہارے ہاتھ

تمہارے زم حسیں، دل نوا ز ہاتھ نہیں  
 بہک رہے ہیں مرے ہاتھ میں بہار کے ہاتھ  
 بچل رہی ہیں بتیلی میں انگلیوں کی لویں  
 تڑپتی نبض کہے جا رہی ہے پیار کی بات  
 پکسل رہی ہے رخ آنکھیں پہ جگر کی شام  
 نکل رہی ہے یہ زلف سے وصال کی رات



## نسیم تیری قبا

نسیم تیری قبا، بوئے گل ہے پیراہن  
 دیا کا رنگ ردائے بہار اڑھاتا ہے  
 ترے بدن کا چمن ایسے جگمگاتا ہے  
 کہ جیسے سیلِ بحر، جیسے نور کا دامن  
 ستارے ڈوبتے ہیں چاند جھلکاتا ہے





## پیاں کی آگ

میں کہ ہوں پیاں کے دریا کی تڑپتی ہوئی موج  
 پی چکا ہوں میں - مندر کا - مندر پھر بھی  
 ایک اک قطرہ شبنم کو ترس جاتا ہوں  
 قطرہ شبنم اشک  
 قطرہ شبنم دل، خونِ جگر  
 قطرہ شبنم نظر  
 یا ملاقات کے لمحوں کے سنہری قطرے  
 جو نگاہوں کی حرارت سے ٹپک پڑتے ہیں  
 اور پھر لمس کے نور  
 اور پھر بات کی خوشبو میں بدل جاتے ہیں  
 مجھ کو یہ قطرہ شاداب بھی چلے لینے دو  
 دل میں یہ گوہر تابیاب بھی رکھ لینے دو  
 خشک ہیں بوٹ مرے، خشک زباں ہے میری  
 خشک ہے درد کا، نغمے کا گلو  
 میں اگر پی نہ سکا وقت کا یہ آبِ حیات  
 پیاں کی آگ میں ڈرتا ہوں کہ جل جاؤں گا  
 ۛ ۛ ۛ ۛ ۛ ۛ ۛ ۛ ۛ ۛ

## قتالِ عالم

اک ادا یہ بھی ہے قتالِ عالم تیری  
آج پہلو میں ہو محبوب بنی بیٹھی ہے  
دلبری اپنی جتنا ہو تم گر جیسے  
قلت ناز ہے تلوار کا پیکر جیسے  
سائے مڑگاں لے رزتے ہوئے نشتر جیسے

سارے عالم کی شکاری تری زلفوں کی کند  
کبھی مقتل، کبھی زنداں، بسی سے خانہ ہے  
بزمِ یاراں ہے کبھی، کوئے نگاراں ہے کبھی  
شمع کی آگ ہے، روزِ الہ پروانہ ہے  
ماتمِ زخمِ خزاں، بارِ بہاراں ہے کبھی  
ہم نے ہر حال میں، ہر رنگ میں چاہا ہے تجھے  
زندگیِ جان کے سینے سے لگایا ہے تجھے  
وصل اور خبر کے آئینے میں دیکھا ہے تجھے  
تیرے ساغر کو پیا زہر کا ساغر جیسے  
بوسہ لب ہے ترا، بوسہ خنجر جیسے

## قطرہ

نسیم صبح تصور یہ کس طرف سے چلی  
 کہ میرے دل میں چمن درکنار آتی ہے  
 کہیں طے تو مرے گلبدن سے کہہ دینا  
 ترے خیال سے بوئے بہار آتی ہے



## غزل

خور روئے خوش بہال ہیں ہم  
 تاز پروردہ وصال ہیں ہم  
 ہم لو یوں رائیگاں نہ کر دینا  
 حاصل فصل ماہ و سال ہیں ہم  
 رنگ ہی رنگ، خوشبو ہی خوشبو،  
 گردش ساغر خیال ہیں ہم  
 رونق کاروبار بستی میں  
 ہم نے مانا شکستہ حال ہیں ہم  
 مال و زر، مال و زر کی قیمت کیا  
 صاحب دولت کمال ہیں ہم  
 کس کی رعنائی خیال ہے تو  
 تری رعنائی جمال ہیں ہم  
 ایسے دیوانے پھر نہ آئیں گے  
 دیکھ لو ہم کو بے مثال ہیں ہم  
 دولت حسن ۱۱ زوال ہے تو  
 دولت عشق ۱۱ زوال ہیں ہم

## غزل

نام اس نوگلِ رنیں کا لیا ہے کہ نہیں  
عط افشاں نفس بادِ صبا ہے کہ نہیں

دیکھنا پھول سے کھلتے ہوئے ہونوؤں میں مرے  
غنیچہ دل کے چٹکنے کی صدا ہے کہ نہیں

وصل کی صبح تو منسوب ترے نام سے ہے  
ہجر کی رات کا بھی کوئی خدا ہے کہ نہیں

اک ذرا اس کا جو اندازِ جفا ہو معلوم  
نہم بتا سکتے ہیں اس بت میں وفا ہے کہ نہیں

کاکلِ ناز، ترے حلقہِ غنیرِ بو میں  
میری قسمت کی کوئی شامِ بلا ہے کہ نہیں

## غزل

حسرتِ دل ہے ساقیِ محفل، وِطقتی ہے سہبائے خیال  
 شامِ تمنا خون سے نفیس، اشک سے روشن صبحِ جمال  
 آج ہے کلاؤ بجر بھی سر پر، اہل دل کی شان نہ پپے  
 روشن اس آئینے میں ہے، جاہ و جلالِ مبد و مسال  
 شاخِ نہال درد و غم پر فنجِ دل پھر خون ہوا  
 اتنا شوخ نہیں تھا یارو، رنگِ بہاراں اگلے سال  
 ساز سے کوئی نغمہ نکلے، دل میں کوئی پھول کھلے  
 ایک بار تو اپنی زباں سے پوچھ ہمارے درد کا حال  
 رات بہت تاریک ہے، شاید دشمنِ شبِ خوں ماریں گے  
 مشعلِ جان بجھنے مت دینا، روشن رکھنا شمعِ خیال  
 روٹھنے والا کوئی نہیں ہے، کوئی منانے والا نہیں  
 ایسا تو اسے دل نہ پڑا تھا اس سے پہلے غم کا کال

## غزل

ابھی اور تیز کر لے، سرِ خنجر ادا کو  
مرے خوں کی ہے ضرورت، تری شوخیِ حنا کو

تجھے کس نظر سے دیکھے یہ نگاہِ درد آئیں  
جو دعائیں دے رہی ہے، تری چشمِ بے وفا کو

کیس رہ گئی ہو شاید، ترے دل کی دھڑکنوں میں  
کبھی سن سکے تو سن لے، مری خوں شدہ نوا کو

کوئی بولتا نہیں ہے، میں پکارتا رہا ہوں  
کبھی بت کدے میں بت کو، کبھی کبے میں خدا کو



## غزل

نغمہ زنجیر ہے اور شہر یاراں ان دنوں  
 ہے بہت اہل جنوں، شور بہاراں ان دنوں  
 اس وفا دشمن سے بیانِ وفا ہے اتوار  
 زیرِ سنگِ سخت ہے پھر دست یاراں ان دنوں  
 محتسب بھی حلقہٴ رنداں کا ہے امیدوار  
 کم نہ ہو جائے وقار میکساراں ان دنوں  
 تیزی تیغ ادا کی شیریں ہیں دور دور  
 ہے بہت آباد کوئے دل فگاراں ان دنوں  
 دوستو پیراں جاں خونِ دل سے سرخ تر  
 بڑھ گیا ہے التفاتِ گلِ عذراں ان دنوں  
 اہل دل پر بارشِ لطیفِ نگاہِ دلخواہ  
 مہریاں ہے عشق پر چشمِ نگاراں ان دنوں  
 ہے گدائے میکدہ کے سر پہ تاجِ خسروی  
 کوزہ گر کی گھل ہے خاکِ شہر یاراں ان دنوں  
 کیا عجب عشرتِ کدوں پر بجلیاں گرنے لگیں  
 ہے بہت سرکشِ نگاہِ سوگوراں ان دنوں

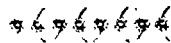


## تین شعر

رفیق بھی ہے تری یادِ غم اُسار بھی ہے  
لبو میں ڈوبی ہوئی تنجِ آبِ دار بھی ہے

خزاں شکستِ بہاراں کا نام ہے لیکن  
خزاں پیامِ بر صبحِ نو بہار بھی ہے

گزرتا رہتا ہے یادوں کی کہکشاں سے کوئی  
مگر کسی کا ہر اک لمحہ انتظار بھی ہے



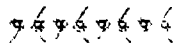
## دوستاں ٹے

ہم نہیں ہیں یہ گلے ملتے ہیں دو سناٹے  
 خامشی ہے کہ مہکتی ہے گل تر کی طرح  
 تیرے ہونٹوں پہ لرزتی ہے کرن کی صورت  
 میرے سینے پہ اتر آئی ہے خنجر کی طرح

❦ ❦ ❦ ❦ ❦ ❦ ❦

## شعلہ حسن

شعلہ حسن ترا آگ سے اپنی روشن  
 اپنی خوشبو سے مہک اٹھا ہے گلشن میں گلاب  
 آنکھریوں نے تری کابل کا جگایا جادو  
 تیرے ہاتھوں نے کیا رنگ حنا کو شاداب  
 تیری محفل ہے کہ تہذیب دل و جاں کا سبق  
 میں نے سیکھے ہیں یہاں عشق و جنوں کے آداب





## تن کی چاندی من کا سونا

ہم نے نیچی تن کی چاندی

ہم نے بیچا من کا سونا

آنکھ کے ہیرے

باتھ کے دریا

بازاروں میں لے کر نکلے

پھر بھی مفلس اور کج حال

اور انھوں نے

ہم سے خریدی تن کی چاندی

ہم سے خرید من کا سونا

لوٹ لیے آنکھوں کے ہیرے

پہ لے باتھوں کے دریا

اور کہا اے

صاحب دولت، صاحب مال

لکین اک دن

تن کی چاندی، من کا سونا

آنکھ لے ہیرے، ہاتھ لے دریا  
 سب واپس آ جائیں گے  
 اور زمانہ ہوگا نہال  
 اور دنیا ہوگی خوش حال  
 کوئی نہ ہوگا صلاب دولت  
 کوئی نہ ہوگا صاحب مال  
 کوئی نہ رہ جائے محفل  
 کوئی نہ ہوگا پھر کمال

۴ ۴ ۴ ۴ ۴ ۴ ۴

## قطعہ

متحد ہو لے اٹھے ظلم کے قدموں سے عوام  
 سارے گم گشتہ عزیزان جہاں مل ہی گئے  
 لاکھ لکھن میں بچائے تھے خزاں نے کائنات  
 قدم باد بہار آئے تو گل کھل ہی گئے

۴ ۴ ۴ ۴ ۴ ۴ ۴

## شامِ غم

شامِ غم صبحِ عشرت کی تمہید ہے  
 بھیلی آنکھوں میں تارے کھٹکتے رہیں  
 نوکِ مڑگاں پہ نشتر چمکتے رہیں  
 دل کے داغوں سے یہ رات روشن رہے  
 خوں کے دھبوں سے گلزارِ دامن رہے  
 آج زخموں کو بننے کی تاکید ہے

آرزو کی ہتھیلی پہ جلتا رہے  
 شوخیِ حسنِ رنگِ حنا کا کنول  
 بس تنہا کا ساغر چھلکتا رہے  
 مل ہی جائے گا ناکامیوں کا بدل  
 ہجر کے درد کا چاند بجھ جائے گا  
 دیکھو وہ زیرِ دامنِ رنگِ شفق  
 وصلِ محبوب کا سرخ خورشید ہے

ہو بلا سے جو ہے سخت تر امتحاں  
 داؤں پر لگ چکے دین و دل، جسم و جاں

عاشقوں کو کہاں فکر ہو دِ زیاں  
رکنے والا نہیں شوق کا کارواں  
ہمسفر آندھیاں ہم قدم بجلیاں  
دل کو منظور اس شوخ کی دید ہے

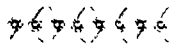
ہر خزاں ہے بہاراں کی پیغام برد  
سرحد شب پہ روشن سوادِ سحر  
پردہ خاموشی میں ہے گرمِ نوا  
اک ہی زندگی کا نیا نغمہ کر  
سارا عالم محبت کی آغوش ہے  
وصل ہی وصل ہے تابہ حدِ نظر  
آج دیا رِ محبوب کی عید ہے

ک ک ک ک ک ک ک ک



## لطفِ سخن

جب ہوں رسوا سر بازار تو ہے لطفِ سخن  
 حرفِ حق جب ہو سر دار تو ہے لطفِ سخن  
 اپنے اور غیر ہوں سچ سے پہ آلودہ قتل  
 اور نہ ہو کوئی طرف دار تو ہے لطفِ سخن  
 مصلحت وقت کی اقرار سکھائے لیکن  
 دل میں ہو جرأت انکار تو ہے لطفِ سخن  
 ظلم کے خوف کے اور موت کے سنائے میں  
 ایک اک حرف ہو بیدار تو ہے لطفِ سخن



## سناٹا

رواں ہیں وقت کے پر ہول رہگزاروں پر  
ہزاروں سال کے در ماندہ رہرواں حیات  
نہ کوئی منزل آسوائی نہ راہِ نجات

طویل ظلم کا صحرا، طویل جبر کا دشت  
یہ آفتاب، سر آسماں پہ آگ کا طشت  
افق سے تاجہ افق ہے ہوائے گرم کا گشت

نہ کوئی سایہ کہیں ہے نہ کوئی پر چھائیں  
شجر ہوا میں اُڑے جاتے ہیں دھواں ہو کر  
ہر ایک سمت صداۓ رہے ہیں سنائے  
شموشی بولتی ہے خوف کی زباں ہو کر

## خنجروں کی روشنی

تیرگی کی سازشیں، بد بختیوں کا انڈیا  
کو چہ احساس میں ہنگامہ شور نشور  
ہر طرف پھیلی ہوئی ہے خنجروں کی روشنی  
ہر طرف بکھرا ہوا ہے ایک خوں آلودہ نور  
رنگ رخ کے آئینے، آنکھوں کے ساغر چور  
پھر بھی دھڑکے ہی چلا جاتا ہے قلبِ ناصبور

مشعلِ جاں شعلہ ساماں، دردِ انساں سر بلند  
ظلم کی شامیں مبارک، غم کی راتیں ارجمند

کس قدر فناک ہیں ان قاتلوں کے خط و خال  
کتنی تابندہ شہیدانِ وفا کی ہے جبین  
شوخ اور بے باک کتنا بے گناہوں کا لبو

خنجروں کی روشنی تھی تیرگی کی ہم نوا  
خنجروں کی روشنی تھی دشمنِ خواب سحر  
خنجروں کی روشنی تھی باعثِ زخمِ جگر  
روزِ زخمِ جگر سے پھر سحر پیدا ہوئی  
اور تاریکی کے گوشوں میں سہ کر رہ گئی  
ماز شوں کی تیرہ بختی، خنجروں کی روشنی

قطر

ہر ایک خوشی اور کئے امن میں ہڈی ہے  
اہل بیت ہر اس نفعی و نفعی کے کلمے سے  
یہ اس کا، اہل بیت ہر اس نفعی و نفعی کے کلمے سے  
نکلتے ہیں ہر شہیدوں کے لئے اور

جب صبا آئے گی

جب صبا آئے گی ہر زلف کو مہکاتی ہوئی  
رنگ کے جام دروہام سے چھلکاتی ہوئی  
برگ صد لالہ و گل راہ میں بکھراتی ہوئی  
شب کی صبح کے بیانیے میں ڈھل جائے گی  
ختم ہو جائیں گے سب سردی، لہلہائی جاں  
شمع افسردہ کی روح پکھل جائے گی  
باغ خوابیدہ سہی ، ختمی شبنم پہ نہ جاؤ  
یہ تو ہیں رات کے آنسو جو ٹپک جائیں گے  
ایک اک شاخ میں ہے دوڑی ہوئی آتش گل  
جب صبا آئے گی شعلے بھی چمک جائیں گے  
لب مہک انھیں گے رخسار دہک جائیں گے  
جب صبا آئے گی ہر زلف کو مہکاتی ہوئی

## قتل آفتاب

شفق۔ رنگ میں ہے تمل آفتاب کا رنگ  
افق کے دل میں ہے نجر، لبو لبان ہے شام  
سفید شیشہ، نور اور سیاہ بارش سنگ  
زمین سے تاج فلک ہے بلند رات کا نام

یقین کا ذرہ ہی آیا ہے کہ اب گماں بھی نہیں  
مقامِ در، نہیں منزلِ فغاں بھی نہیں  
وہ بے ڈی ہے کہ جو قابلِ بیاں بھی نہیں  
کوئی ترکِ ہی باقی رہی نہ کوئی امنگ  
جمینِ شوق نہیں، جنگِ آستان بھی نہیں  
رقیبِ بیت گئے ختم ہو چکی ہے جنگ  
دلوں میں شعلہ نم بجھ گیا ہے کیا کیجیے  
کوئی حسین نہیں کس سے اب وفا کیجیے  
سوائے اس کے کہ قاتل کو ہی دنا، تہیے

مگر یہ جنگ نہیں وہ جو ختم ہو جائے  
اک انتہا ہے فتنہ حسن ابتدا کے لیے  
بچے ہیں ناکہ نوزیریں گے قافلے گل سے

ٹموش مہر بہ لب ہے کسی صدا کے لیے  
اداسیاں ہیں یہ سب نغمہ و نوا — لیے

وہ پہنا شمع نے پھر خونِ آفتاب کا تاج  
ستارے لے کے اٹھے نورِ آفتاب کے جام  
پلک پلک پہ فروزاں ہیں آنسوؤں کے چراغ  
لوں لچکتی ہیں یا بجلیاں چمکتی ہیں  
تمام پیرہن شب میں بھر گئے ہیں شراب

ہزار لب سے زمیں کہہ رہی ہے قصہٴ ار  
ہزار گوشِ جنوں سن رہے ہیں افسانہ

چمک رہی ہیں کہیں تیرگی کی دیواریں  
چمک رہی ہیں کہیں شاخِ گل کی تلواریں  
سک رہی ہے کہیں دھبے سرکشی میں ہوا  
چمک رہی ہے کہیں بلبلِ بہارِ نوا  
مہک رہا ہے وفا کے چمن میں دل کا گلاب  
چمک رہی ہے لب و عارض و نظر کی شراب

جوان خوابوں کے جنگل سے آ رہی ہے نسیم  
نفس میں کابیتِ پیغامِ انقلاب لیے  
خبر ہے قافلہٴ رنگ و نور نکلے کا  
سحر کے دوش پہ اک تازہ آفتاب لیے

## برہنہ پا ہے بہار

تمہارے تن پہ سلامت تمہارا پیراہن  
ہمارے پاس یہ دامن تار تار سہی  
تمہارے زیر قدم فرش گل بساط بہار  
ہمارے پاؤں میں دھبے جنوں کے خار سہی

کسی کی بھوک سے بھرتے نہیں ہیں پیٹ اپنا  
کسی کی پیاس سے لب اپنے تر نہیں کرتے  
برہنگی سے کسی کی لباس کیوں لیں گے  
بہشت پر بھی ہوس کی نظر نہیں کرتے

ہمارے دل کی تپش سے چراغ جلتے ہیں  
ہماری تپش لبی میکدے بناتی ہے  
نگاہ ساقی تا مہرباں کا شکوہ کیا  
ہمارے نام کی صبا چھلک ہی جاتی ہے

تمہیں خبر بھی ہے آوارگانِ کوچہ شوق  
شاید دل میں شکستہ دلوں کے یار بھی ہیں



بلاکشانِ محبت کا احترام کرو  
 خراب حال سہی، فخرِ روزگار بھی میں

ہماری طرح گریبانِ صبحِ نو بھی ہے چاک  
 فروغِ چاکِ گریباں ہے اہلِ دل کا شعار  
 ہماری طرح سے گلزار و دشت و صحرا میں  
 برہنہ سر ہے صبا اور برہنہ پا ہے بہار



# پیغمبر مسیحا دست 1

(حضرت عیسیٰ کے مبارک ہاتھوں کے نام)

سنا ہے آئے گا پیغمبر مسیحا دست  
قدیم عہد کی صورت نئے زمانے میں  
صلیب و دار کو ہو گا عدالتوں سے عروج  
دروغ رنگ بھرے گا ہر اک فسانے میں 2

صدائے حسن و صداقت لبو میں ڈوبے گی  
کریں گے دوست بھی اقرار دوستی سے گریز 3  
ٹٹے گی چاندی کے سکوں میں دل کی جھن و فاق 4  
ہوائیں تغ بلف ہوں گی، شاخ گل خوں ریز

- 
- 1۔ اس نظم کے سارے حوالے انجیل کی روایت کے مطابق ہیں۔
  - 2۔ حضرت عیسیٰ کے خلاف عدالت میں کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا پھر بھی انھیں صلیب پر چڑھایا گیا۔
  - 3۔ بارہ حواریوں میں سے ایک نے رات بھر میں تین بار حضرت عیسیٰ کو پہچاننے سے انکار کیا۔
  - 4۔ ایک حواری نے چاندی کے تمسکے لے کر حضرت عیسیٰ کو قاتلوں کے حوالے کر دیا۔

نشیپ خاک بھرے گا قمار خانوں سے  
 فراز دار پہ ہو گا تیری کا مقام <sup>1</sup>  
 گھٹا کی طرح سے جھوٹیں گے تیرگی کے نشان  
 سیاہ رو نظر آئے گا آفتاب کا جام <sup>2</sup>

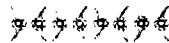
سنا ہے نکلے گی میلاؤنو کے جشن کی بات  
 صلیب ظلم سے اترے گی پھر مسیح کی لاش  
 نقوش پاک قدم بحر و بر پہ چمکیں گے  
 بڑھے گی اور بھی کچھ دل شکستگاں کی تاش <sup>3</sup>  
 وفور نور سے معمور ہو گا دیدہ کور  
 کرن کی طرح سے بالیدہ انگلیاں ہوں گی <sup>4</sup>  
 سروں پہ سایہ رحمت بنیں گے دست شفیق  
 جبین درد سے پیدا تجلیاں ہوں گی <sup>5</sup>  
 نکالے جائیں گے پھر زندگی کے معبد سے  
 بشر کے اشکوں کے تاجر لہو کے بیوپاری <sup>6</sup>  
 خدا کے نام کو نیلام کر نہ پائیں گے  
 وہ چاہے صاحب تسبیح ہوں کہ زناری <sup>7</sup>

- 
1. صلیب کے نیچے بیٹھے ہوئے سپاہی حضرت مسیحی کے پیڑوں کے لیے قمر عدا بازی کر رہے تھے۔
  2. شہادت کے وقت اندھیرا چھا گیا اور آفتاب کا رنگ کالا ہو گیا۔
  3. حضرت مسیحی کے مصلوب ہوجانے کے بعد وہ بارہ زندہ ہونے کی طرف اشارہ ہے، علامت کے طور پر یہ بھی سمجھنا صحیح ہے کہ سچائی نقل نہیں کی جاسکتی وہ پھر زندہ ہو جاتی ہے۔
  4. اندھوں کی آنکھوں کو بینائی ملنے اور کوڑھیوں کے تندرست ہوجانے کی طرف اشارہ ہے جو اعجاز مسیحی تھا۔
  5. مصائب کا خاتمہ اور مسرت کی ابتدا۔
  6. حضرت مسیحی نے سو، سو، تاجروں کو کلیسا سے باہر نکال دیا تھا۔
  7. صاحب تسبیح = مسلمان، زناری = زندہ۔

وہ ہاتھ بڑھ کے سنبالیں گے کائنات کی باگ  
 نہا چکے ہیں مشقت کے جو پسینے سے  
 جراحتِ دل و جاں مندمل کریں گے وہ ہاتھ  
 نشان ہیں جن کی ہتھیلی پہ سخت کوشی کے

وہ ہاتھ جن کو پنہائی گئی ہیں زنجیریں  
 وہ ہاتھ چھید چکی ہے جنھیں صلیب کی کیل  
 وہ ہاتھ شعلہٴ حق بن کے ہو رہے ہیں باند  
 اندھیری رات میں روشن ہے صبحِ نو کی دلیل

بہی مسیح و محمدؐ وہی سلیم و ظلیل  
 وہی حسین و دل آرا، وہی جلیل و جمیل



## رہبر کی موت

اپنا رہبر جنگ کے میدان میں کام آیا ہے آج  
 وہ وطن کی آبرو، اہل وطن کا افتخار  
 اشتراکیت کی جمہوری روایت کا نقیب  
 مظلوم انسان میں انسانیت کا تاجدار  
 ایک مردہ لاش، یہ توہین کر سکتا ہے کون  
 پاؤں پھیلانے ہوئے نقش میں سوتی ہے بہار  
 اپنی سرد آہوں کی چادر ہی اڑھائیں گے اسے  
 کیا نچھاور ہم کریں گے اس پر صرف اشکوں کے ہار  
 کیا زمانے سے کہیں گے جا کے بس اتنی سی بات  
 مر گیا ہے وہ تو اس کے غم میں ہیں ہم سو گوار  
 یوں تو رک سکتا نہیں اب دل کے طوفانوں کا گیت  
 کند ہو سکتی نہیں یوں عشق کے خنجر کی دھار  
 اب ہماری آنکھ میں ہے اس کی بند آنکھوں کا نور  
 اب ہمارے جسم میں ہے اس کی روح بیقرار  
 اس کا پرچم لے کے میدان میں نکلتا ہے ہمیں  
 فرش گل سے دور انگاروں پہ چلنا ہے ہمیں

8 جون 1964

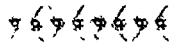


## صندل و گلاب کی راکھ

مرے وطن کی زمیں کے اداس آنچل میں  
 نہ آج رنگ نہ خوشبو، بھری ہوئی ہے دھول  
 خبر نہیں کہ ہے کس دل جلے کی لاش جسے  
 جھکا کے سر کو پہاڑوں نے بھی کیا ہے قبول  
 سنا ہے جس کی چتا سے یہ خاک آئی ہے  
 وہ فصل گل کا پیبر تھا عہدِ نو کا رسول  
 اسے خبر تھی خزاں کس چمن میں سوتی ہے  
 وہ جانتا تھا کہ کیا ہے بہار کا معمول  
 سکھایا کشمکشِ جنگ و امن میں اس نے  
 جراتوں کو چمنِ بندی جہاں کا اصول  
 انھیں دلوں کی محبت میں کیاریاں بونئیں  
 اگے ہوئے تھے جہاں صرف نفرتوں کے بول  
 عطا ہوئی تھی اسے روزِ و شب کی بیتابی  
 وہ اس کی جرأتِ رندانہ اس کا شوقِ فضول  
 جو آج موت کے دامن میں اک ستارہ ہے  
 وہ زندگی کے گریباں میں تھا گلاب کا پھول

وفا کا ذکر ہی کیا اس کی بے وفائی نے  
 خراجِ مشق و محبت کیا ہے ہم سے وصول  
 وہ بزمِ من کہ جسے مسجدوں نے پیار کیا  
 وہ بتِ شکن کہ جو بزمِ بتاں میں تھا مقبول  
 وہ جسمِ آج ہے جو صندل و گلاب کی راکھ  
 وطن کی خاک کے مسجدوں میں اب بھی ہے مشغول  
 اتر رہا ہے کچھ اس طرح اپنی دھرتی پر  
 کہ آسمان سے جس طرح رختوں کا نزول  
 اب اس کے فیض سے نجر بھی لہلہائیں گے  
 کھلیں گے خارِ میاں سے بھی بہار کے پھول

8 جون 1964



## فاصلے

ہزار فاصلے حائل ہیں فاصلوں کے سا  
وہاں ہو تم کہ جہاں دل دھڑک نہیں سکتا  
دلوں میں درد کے شعلے چمک نہیں سکتے  
وہاں ہو تم کہ جہاں آرزو کا نام نہیں  
وفا کی رسم جنوں کا شعور عام نہیں  
نظر کے چاند ستارے بجھائے جاتے ہیں  
پلک سے خون کے آنسو پک نہیں سکتے  
حسین یادوں کے عائن جلائے جاتے ہیں  
وہاں ہو تم کہ جہاں دل دھڑک نہیں سکتے

وہاں ہے عشق پہ پابندی نظر اب تک  
خود اپنی آگ سے ہے حسن بے خراب تک  
خیال یار کی راتیں ہیں مختصر اب تک

یہاں بس ایک تمنا اک آرزو یہ ہے  
کہ تم بھی میری طرح سو گورا ہو جاؤ  
کسی کی یاد میں آنکھوں کی نینداں جائے  
وہ دن بھی آئے کہ تم یہ قرار ہو جاؤ



## متفرق اشعار

پرتو سے جس کے عالم امکاں بہار ہے  
وہ نو بہار ناز ابھی رہ گزر میں ہے  
☆☆☆

سو ملیں زندگی سے سوغاتیں  
ہم کو آوارگی ہی راس آئی  
☆☆☆

تو وہ بہار جو اپنے چمن میں آوارہ  
میں وہ چمن جو بہاراں کے انتظار میں ہے  
☆☆☆

کمی کمی سی تھی کچھ رنگ و بوئے گلشن میں  
لب بہار سے نکلی ہوئی دعا تم ہو  
☆☆☆

شب کے سنانے میں یہ کس کا لبہ گاتا ہے  
سرحد درو سے یہ کس کی صدا آتی ہے  
☆☆☆

بہت برباد ہیں، لیکن سداۓ انقلاب آئے  
 وہیں سے وہ پکاراٹھے گا جو ذرہ جہاں ہوگا  
 ☆☆☆

اسی لیے تو ہے زنداں کو جستجو میری  
 کہ مفلسی کو کھٹائی ہے سرکشی میں نے  
 ☆☆☆

یہ میکدہ ہے، یہاں ہیں گناہ جام بدست  
 وہ مدرسہ ہے وہ مسجد وہاں ملے گا ثواب  
 ☆☆☆

دل و نظر کو ابھی تک وہ دے رہے ہیں فریب  
 تصورات کہن کے قدیم بت خانے  
 ☆☆☆

انقلاب آئے گا رفتار سے مایوس نہ ہو  
 بہت آہستہ نہیں ہے جو بہت تیز نہیں  
 ☆☆☆

پیار جہاں کی ایک بیاباں، تیری سخاوت شبنم ہے  
 بی کے اٹھا جو بزم میں تیری، اور بھی تشنہ کام اٹھا  
 ☆☆☆

یہ تیرا گلستاں، تیرا چمن، کب میری نوا کے قابل ہے  
 نغمہ مرا اپنے دامن میں آپ اپنا گلستاں لاتا ہے  
 ☆☆☆



پیراہنِ شرر  
نئی نظمیں

1965



ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں  
 میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے  
 جگر مراد آبادی

میں اپنے دوست مشہور مصوٰر حسین کا شکر گزار ہوں  
جنہوں نے گرد پوش کا ڈیزائن بنایا ہے

## پیراہنِ شبنم

علی سردار جعفری کو میں اندازاً 27 یا 28 سال سے جانتا ہوں۔ یہ اس زمانے میں لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی لکھنؤ کی شاخ کے سرگرم رکن۔ میرا حافظہ اگر غلطی نہیں کرتا تو وہ شاید اس ادبی انجمن کے سکریٹری تھے۔ انجمن کے جلسے مرحومہ رشید جہاں کے مکان پر ہوتے تھے اور گو اس زمانے میں بھی یہ شعر کہتے تھے لیکن اس وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ ایک پُر جوش، باحوصلہ اور باعمل اشتراکیت پر ایمان لانے والے نوجوان کارکن زیادہ ہیں اور شاعر کم۔ اراکین انجمن ترقی پسند مصنفین کے امیر کارواں اس وقت بہ ظاہر تو جوش ملیح آبادی تھے لیکن ان کے محبوب ترین شاعر دراصل مجاز مرحوم تھے اور اس کے بعد جذبی اور جاں نثار اختر کا نام آتا تھا۔ کسے خبر تھی کہ چند ہی سال بعد سرداران سب کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جائے گا اور دنیائے شعر میں اپنا مخصوص اور بلند مقام خالی اپنے وطن ہی میں حاصل نہ کرے گا بلکہ اس کی شاعرانہ عظمت اپنے ملک کے باہر بھی تسلیم کی جائے گی۔

سردار مجھ سے عمر میں 12 یا 13 سال چھوٹے ہیں۔ اگر زندگی میں جمود نہ ہو تو یہ عرصہ ادبی قدروں کو بدل دینے کے لیے بہت کافی ہے۔ موجودہ دور تو اتنا برق رفتار ہو چکا ہے کہ صبح کا مستقبل شام آتے آتے ماضی بن چکا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں سردار کی شاعری کا میرے دور کی شاعری سے موضوعات، نغمات، انداز بیان، علامات اور خلیق حسن کے نظریات، چاروں اعتبار سے مختلف ہونا ناگزیر تھا۔ ایک سردار کیا آج کے دور کے سب شاعر اپنے اپنے انداز میں نئے تخلیقی تجربے کر رہے ہیں اور نئے ادب کوں کا یہ خیال ہے کہ یہ شاعری کچی ہے اور انحطاط ادب کی دلیل ہے وہ بڑی حد تک اپنی پرانی مٹی ہوئی قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے اور بدلتی ہوئی زندگی کی زندہ قدریں قبول کرنے کو راضی نہیں۔

موجودہ دور کے شعراء کی طرف جب بھی میرا خیال جاتا ہے تو میرے ذہن میں پہلا نام



سردار ہی کا آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ میری پسند کی بات ہے۔ شاید اس پسند کی وجہ یہ ہے کہ سردار کی اور میری محض ادبی قدریں ہی نہیں بلکہ انسانی قدریں بھی بہت کچھ مشترک ہیں اور گو آج وہ دھارے پر ہے اور میں کنارے سے لگ چکا ہوں لیکن پھر بھی ہماری نظریں ایک ہی افق کی طرف اٹھتی ہیں۔ ہم نے ایک ہی خواب دیکھا ہے اور اپنی بساط بھر اسی طرف اپنی کشتیاں بڑھا کر اوروں کو بھی اس خواب کو حقیقت بنانے کی دعوت دی ہے۔

آج زندگی کا، ہر فن کار سے خالی یہی تقاضا نہیں ہے کہ وہ زندگی کی نا انصافیوں اور غلط نظریوں کی وجہ سے جو انسانی مشکلیں اور محرومیاں ہیں ان کو سمجھے بلکہ ان کے خلاف آواز بھی اٹھائے اور جہد بھی کرے۔ صحیح مفہوم میں آج کے شاعر کو مجاہد بھی ہونا ضروری ہے۔ لیکن شاعر کا جہد میدان جنگ میں نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شاعر تلوار بھی اٹھالے لیکن یہ فضل اس کا بحیثیت ایک شہری کے ہوگا، یہ حیثیت ایک فنکار کے نہیں کیوں کہ اصل لڑائی تو دلوں اور ذہنوں میں لڑی جا رہی ہے۔ اور تلوار اس نزاع میں کام نہیں دیتی۔ سردار کی زندگی میں ایک مقام ایسا آیا تھا جب مجھے اندیشہ ہونے لگا تھا کہ کہیں سردار کے دل میں جو شہری ہے وہ شاعر کے ہاتھ سے قلم چھین کر تلوار نہ اٹھالے لیکن شکر ہے کہ یہ نوبت نہیں آئی اور سردار نے قلم ہی کو تلوار بنالیا۔ سردار کے ارتقاءء فن میں یہ ایک اہم منزل تھی اور اس مقام سے گزرنے کے بعد اس کا شعور جو پہلے ہی سے بیدار تھا اور زیادہ پختہ ہوا اور اس کے لہجے میں تندگی کی جگہ نرمی آگئی جس نے اسے ساری نوع انسان کے قریب کر دیا۔ پیراہن شرٹ تک پہنچتے پہنچتے قلم کی تلوار اب اس کے ہاتھ میں شاخ گل بن چکی ہے۔ اور وہ نظریاتی غبار کی سطح سے ابھر کر کرۂ نور پر پہنچ گیا ہے۔ اب اس کے پیام میں ایک پیہر برانہ حلاوت ہے اور زخم انساں کے لیے مرہم۔ آج اس کی منزل کا تعین اس مجموعے کا آخری شعر کرتا ہے۔

کم ظرفی گفتار ہے دشنام طرازی تہذیب تو شائستگی دیدہ تر ہے

حرف اول میں وہ اپنا نظریہ ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ سماجی نظام کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت خود بخود بدل جاتی ہے۔ بدی ختم ہو جاتی ہے اور نیکی کا ظہور ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے اعتراف سے مفر نہیں کہ سماجی نظام کی تبدیلی جو ضروری بھی ہے اور ناگزیر بھی نا کافی ہے..... معاشی اور سیاسی نظاموں کی نا انصافیوں کو پہچاننا اور ان کے خاتمے کے لیے لڑنا برحق ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ صدیوں کی نفرت، ہوس، بدی، خود غرضی، غلط احساس برتری اور اسی قسم کے دوسرے تاریک جالوں سے دل و دماغ کی صفائی بھی برحق ہے۔ اس کے

بغیر نہ تو دنیا سے جنگوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور نہ انصافیاں ختم ہو سکتی ہیں۔

جب سے انسان نے تمدن زندگی میں قدم رکھا ہے وہ امن کا جو بارہا ہے لیکن ابھی تک اس کی قسمت میں ایک کے بعد دوسری جنگ آتی چلی گئی ہے۔ انسان کا بڑھتا ہوا علم ہر آنے والی جنگ کو جنگ گزشتہ سے اور زیادہ ہولناک تباہ کن بناتا چلا جا رہا ہے اور آج یہ نوبت آگئی ہے کہ نوع انسان کے مرنے جینے ہی کا سوال سامنے آ گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انسان کی عقل (جو اس کی ذاتی غرض اور حرص کا دوسرا نام ہو کر رہ گئی ہے) اُس کے دل (جو جذبہ اخوت کا دوسرا نام ہے) کو پیچھے چھوڑ کر اتنا آگے بڑھ گئی ہے کہ اب وہ اس کی آواز بھی نہیں سن سکتی۔ آج دنیا کو تباہی سے بچانا دراصل صرف اس سوال پر منحصر ہے۔

نمو کی طاقت ابھی دلوں میں ہے یا اسے زیست کھو چکی ہے

ضمیر انسان میں آج بقی ہے یا یہ نو سرد ہو چکی ہے

آج ہر فنکار کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ عقل اور دل کا یہ فاصلہ اور بڑھنے نہ دے بلکہ انہیں قریب لانے کی کوشش کرے اور ضمیر انسان کو بھنھوڑ بھنھوڑ کر اس انسانی اخوت کی لو کو بھنھنے نہ دے بلکہ ہوا دے دے کر اسے شعلہ جوالہ بنادے۔

اگر اس نظر سے اردو شعری ادب کا جائزہ لیا جائے تو سردار کا مقام سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔ 'میرا بہن شرز' کی زیادہ تر نظمیں نوع انسان کے لیے مشعل راہ ہیں۔ سردار کا بیدار شعور اور ساتھ ہی ساتھ الفاظ کا فنکارانہ حسن انتخاب ان نظموں کو ادبی شہکار بنادیتا ہے اور اس کے احساس کی صداقت اور خلوص اس کے لہجے کو وہ درد مندی بھی عطا کر دیتا ہے جو بعض نظموں کو انسانی دستاویز کا درجہ دے دیتا ہے۔ ان نظموں میں سردار ایک معلم اور فلسفی بن کر نہیں بلکہ ایک دوست بن کر سامنے آتا ہے اور چونکہ وہ غم مشترک میں اپنا ساتھی ہے لہذا اس کی آواز میں اک بے پناہ کشش اور اس کے پیام میں ایک پائیدار اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ ظریف مرحوم نے شاعر کے بارے میں کہا تھا۔

تو معانی نفس لتارہ کی بیماری کا ہے تو ذریعہ قوم اور ملت کی بیداری کا ہے

میں نے بھی اپنے مجموعہ 'کلام' میری حدیث عمر گریزاں میں ایک عظیم فنکار کی تعریف یوں کی

تھی۔

'میں تو اس فنکار کو عظیم فنکار سمجھتا ہوں جو نوع انسان کی اکائی بن کر انسانی درد و غم سہے اور اس

غم کا مکمل احساس ہونے کے باوجود اس کی ذات میں اتنی لوچ اور اس کے فن میں اتنی سکت ہو کہ وہ اس

زہر کو امرت بنا کر پی جائے، اپنے دل و دماغ کی معصومیت، تازگی اور حسن کو برقرار رکھے اور دانائی کی چوٹیوں سے کُل نوع انسان کو جس میں گمراہ انسان بھی شامل ہوں، ایک طفل معصوم کے بیٹھے اور سریلے بولوں میں پکارے اور منزل انسانیت کی طرف قدم بڑھانے کا پیغام دے۔  
'پیراہن شرر' کی ان نظموں میں سردار نے اگر یہ مقام حاصل نہیں کر لیا ہے تو اس مقام سے بہت دور بھی نہیں ہے۔

زندگی اور ادب دونوں ایک سلسلہ لامتناہی ہیں۔ دونوں افتخار و افتخار آگے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں اور جب تک دنیا قائم ہے یہ سلسلہ ختم ہونے والا نہیں ہے۔ میرا خیال تو ایسا ہے کہ وہ نظام حیات کبھی بھی مرتب نہ ہو سکے گا جس سے خوب تر کا جلوہ کچھ نگاہوں میں نہ ہو۔ یہ خوب تر کی خواہش ہی ارتقاء زندگی کا راز ہے۔ عظیم فن کار وہی ہے جس کا دیدار عینا اس خوب تر کو دیکھ سکے اور کاروان انسان کو اس خوب تر منزل کی طرف گامزن ہونے پر آمادہ کرے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور سختیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔ لیکن ایک سچا شاعر ان سے ڈر کر اپنی آواز اٹھانے سے گریز نہیں کرتا۔ غالب کے اس شعر میں۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں      ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے  
اور چمکتے کے اس شعر میں۔

نظر کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں      مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے  
اور فیض کے اس قطعے میں۔

مناجی لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے      کہ خونِ دل میں ڈوبی ہیں انگلیں میں نے  
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے      ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے

اور سردار کے پیراہن شرر کے ان اشعار میں۔

کھڑا ہے کون یہ 'پیراہن شرر' پہنے  
بدن ہے چور تو ماتھے سے خون جاری ہے  
کوئی دوانہ ہے لیتا ہے سچ کا نام اب تک  
فریب و کمر کو کرتا نہیں سلام اب تک

باوجود انداز بیان اور علامات کے نمایاں فرق کے ایک حیرت انگیز خانہ دانی مشابہت ہے۔ ایک کرب جو دور بہ دور سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن سردار کی آواز یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ

اس کی نگاہ بینا ایک درخشاں مستقبل کی بشارت بھی دیتی ہے۔ اس مجموعے کی آخری نظم 'امانتِ غم' میں سردار لکھتا ہے ۔

امانتِ غمِ انساں امانتِ غمِ دل  
یہ اک چراغ ہے قدیل مہر و مہد کی طرح  
جو یہ نہ ہو تو زمانے میں روشنی کیوں ہو

-----

اٹھو کہ بشارتِ دل و جاں منایا جائے گا  
ہر اک چمن میں یہی گل کھلایا جائے گا  
یہ گل جو دردِ محبتِ امانتِ غم ہے  
یہ گل جو شوخ بھی خوں گشتہ بھی ملول بھی ہے  
خدائے عشق بھی ہے امن کا رسول بھی ہے

انسان کے دل کی آرزو نا موافق ماحول سے لڑنے کے لیے ایک شاعر کا پیام بن کر ہمیشہ ہونٹوں تک آتی رہی ہے۔ غالب کے کاغذی پیراہن سے لے کر سردار کے پیراہن شریک یہ آرزو نہ جانے کتنے لباس پہن کر گھڑی گھڑی سامنے آئی ہے لیکن جو چیز پیراہن شرر کو طرہ امتیاز بخشی ہے وہ یہ کہ اس پیراہن شرر کے نیچے ایک پیراہن شبنم بھی ہے۔ ممکن ہے کہ اس سلگتی ہوئی دنیا کو یہ پیراہن شبنم ابھی سالوں میسر نہ ہو لیکن ایک بچے فن کار کا حوصلہ اس خیال سے پست نہیں ہوتا۔ وہ تو اس عقیدے پر عمل کرتا ہے

بلا سے ہم نے ند دیکھا تو اور دیکھیں گے      فردغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

## حرفِ اوّل

ایک دیوانہ کھڑا ہوا ہے، چاک دامن، چاک گریباں۔ اور اس پر چاروں طرف سے پتھراؤ ہو رہا ہے۔ یہ بارش اتنی شدید ہے کہ پتھر سے پتھر ٹکرا رہا ہے اور جسم سے خون کی دھاریں نکل رہی ہیں اور پتھروں سے چنگاریاں اُڑ رہی ہیں اور اس طرح برس رہی ہیں کہ دیوانے کے بدنہ جسم کا لباس بن گئی ہیں۔ اب چاک دامن اور چاک گریباں کی بھی گنجائش نہیں رہ گئی ہے مگر دیوانہ جو خود صداقت ہے اور صداقت کی آواز سر سے پاؤں تک ایک حسین مگر خون آلود شاعر بن گیا ہے۔

بہ جرم عشق تو ام می کشند غوغائیت

تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشا نیست

یہ قتل صدیوں سے جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔ یہ رُکتا ہے اور پھر شروع ہو جاتا ہے اور انسانیت ایک منزل اور آگے بڑھ جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ صداقت، جیسے گلاب کا پودا ہے، جس کی شاخیں قلم ہو جانے کے بعد نئے پھولوں کا پیراہن پہن لیتی ہیں۔ یہ بھی پیراہن شرر ہے۔ یا صداقت ایک دانہ ہے جو زمیں میں دفن ہونے کے بعد پھراگتا ہے اور ہزار دانوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ مسیح بھی ہے اور حسین بھی اور انسان کی لافانی جدوجہد بھی۔ یہ کذب کی قاتلانہ حرکتوں کا جواز نہیں ہے بلکہ صداقت کی مظلومیت کا کرشمہ ہے جو قلم سے زیادہ طاقتور ہے۔ اس کی زبان کبھی بند نہیں کی جاسکتی، اس کی خوشبو کبھی قید نہیں کی جاسکتی۔

دست صناد بھی عاجز ہے، کعب گل چیں بھی

بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ سماجی نظام کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت خود بخود بدل جاتی

ہے، بدی ختم ہو جاتی ہے اور نیلی کا ظہور ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے امتداد سے مفر نہیں کہ سماجی نظام کی تبدیلی، جو ضروری بھی ہے اور ناگزیر بھی، نا کافی ہے۔ ذہنی اور روحانی تبدیلی بھی ایک جہاد ہے اور چونکہ یہ جہاد نفس ہے اس لیے اور بھی مشکل ہے۔ کبیر داس کے الفاظ میں

”جسم و جان کے رن میں گھسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ ہوس،  
غصہ، غرور اور لالچ مقابلے پر کھڑے ہوئے ہیں۔ صبر، قناعت اور صداقت کی  
بادشاہت میں شمشیر کا نام بلند ہو رہا ہے۔“

’صداقت کے متلاشی کی جد و جہد بہت دشوار ہے۔ سو رما کی لڑائی  
دو چار ٹھنڈے چلتی ہے سی کی جد و جہد ایک پل میں ختم ہو جاتی ہے لیکن صداقت کا  
متلاشی دن رات جنگ کرتا ہے۔ اس کی لڑائی زندگی کے آخری لمحے تک جاری  
رہتی ہے۔“

بہتر سماجی نظام اس جہاد نفس کے لیے سازگار فضا پیدا کرتا ہے۔ لیکن اس سازگار فضا میں  
مسلح جہاد ضروری ہے۔ یہ اجتماعی عمل بھی ہے اور انفرادی بھی۔

دوسروں کے نفس سے پہلے اپنے نفس سے جہاد ضروری ہے۔ معاشی اور سیاسی نظاموں کی نا  
انصافیوں کو پہچاننا اور ان کے خاتمے کے لیے لڑنا برحق ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ صدیوں کی نفرت، ہوس،  
بدی، خود غرضی، منطہ احساس برتری اور اس قسم کے دوسرے تاریک جالوں سے دل و دماغ کی صفائی بھی  
برحق ہے۔ اس کے بغیر نہ تو دنیا سے جنگوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور نہ نا انصافیاں ختم ہو سکتی ہیں۔

تکوار پرانے ظالموں کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود تو ضرور کر سکتی ہے لیکن نئے ظالموں کو پیدا  
کرنے والی کوکھ کو ضبط تولید نہیں سکھا سکتی پھر کتنی بار تاریخ کی نہ بند ہونے والی آنکھوں نے یہ تماشا دیکھا  
ہے کہ مظلوم ظالموں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ اس بھیا تک قلب ما بیت کو بھی تو روکنا ضروری ہے۔

خارجی نظام کی تبدیلی کی جد و جہد سیاسی جماعتوں کا اجتماعی عمل ہے۔ لیکن انسانی روح کے  
داخلی نظام کی ترتیب و تربیت کی جد و جہد شاعروں اور دانشوروں کے حصے میں آتی ہے۔ اس میں شعروں  
کی تمام اصناف کام آتی ہیں۔ عشقیہ شاعری روح میں لطافت پیدا کرتی ہے اور لذت فراق کو بھی  
لذت وصال بنا کر انسانوں کو سخت سے سخت حالات میں جینا سکھاتی ہے اور سیاسی اور انقلابی شاعری روح  
کو صلابت عطا کرتی ہے۔ ضرورت دونوں کی ہے۔ اخلاقی شاعری کا بھی ایک مقام ہے۔ لیکن شاعر کا  
منصب و اعظم کے منصب سے بلند ہے اور انداز بیان مختلف۔ یہی وجہ ہے کہ ممبر پر واعظ جلوہ گر ہوتا ہے

لیکن دلوں میں شاعر ابھرتا ہے۔

میری یہ نئی نظمیں جو پیراہن شرپنہ کھڑی ہیں، سیاسی دستاویزیں نہیں ہیں۔ واقعات ان کی تخلیق میں کارفرما ضرور رہے ہیں۔ لیکن یہ واقعات کا بیان نہیں ہیں بلکہ ان سے پیدا ہونے والے روحانی کرب کا اظہار ہیں۔ انھیں احتجاج کہنا بھی غلط ہے۔ شاید دل کی چیخ اور روح کی پکار نے ان نظموں کی شکل اختیار کر لی ہے۔

کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے جیسے دنیا کے سر پر خوف اور نفرت دو بھوت منڈلا رہے ہیں (اور یہی انسان کے سب سے بڑے دشمن ہیں) جن سے گھبرا کر انسانی عقل ماؤف ہو جاتی ہے اور دل کی شرافت کمتر درجے کے جذبات میں تبدیل ہو جاتی ہے اور بھوتوں سے لڑنے کے بجائے انسان انسانوں کا خون کرنے لگتے ہیں اور خون جتنا زیادہ بہتا ہے خوف اور نفرت میں اتنا ہی اضافہ ہوتا جاتا ہے اور شاعر کی آواز گونگی ہو جاتی ہے اور ساز کے تار ٹوٹ جاتے ہیں۔

گیت کے دل میں خنجر ہے، الفاظ ہیں سر بریدہ

اپنے قبضے میں اک بے بسی کے سوا کچھ نہیں

نالے بیکار، فریاد بے سود ہے

آؤ مل کر محبت کو آواز دیں

نیکیوں کو پکاریں

یہ آواز اور یہ پکار خوف اور نفرت کے گہرے اندھیرے میں کتنی ہی نحیف و زار، کتنی ہی بیکار کیوں نہ معلوم ہو لیکن اس میں امید کی ایک ننھی سی کرن دکھائی دیتی ہے جو گھنے سے گھنے اندھیرے کے دل میں اتر سکتی ہے اور خوف زدہ روح کو ایک لمحے کے لیے بے خوف بنا سکتی ہے۔

اس اندھیرے میں کہ ملتی نہیں انسان کو راہ

صرف تابندہ ہے شاعر کی نوا اے ساقی

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد سے، جنگ نہ کرنے کے عہد اور انجمن اقوام متحدہ کی تشکیل کے باوجود، دنیا تیسری جنگ عظیم کے خطرے سے دوچار ہے اور اگر یہ جنگ ہوگی تو آخری جنگ ہوگی۔ لیکن اتفاق سے یہ خوف جو جنگوں کو جنم دیتا ہے اسی خوف نے تیسری عالم گیر جنگ روک بھی رکھا ہے۔ خوف ناک ایٹمی اور ریڈیائی ہتھیاروں سے مسلح طاقتوں کے درمیان ایک باہمی توازن قائم ہو گیا ہے۔ لیکن جب کبھی دنیا کے کسی گوشے میں کوئی چھوٹی سی جنگ شروع ہوتی ہے تو اس توازن کے گمراہ جانے

کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے اور تیسری عالم گیر جنگ کا بھیا تک چہرہ دکھائی دینے لگتا ہے۔

گزشتہ چند سالوں کے اندر تیسری جنگ عظیم کا محور یورپ سے ایشیا میں منتقل ہو گیا ہے کیوں کہ ایشیا اور افریقہ کے آزاد ہونے والے ملک، جو کل تک غلام تھے دنیا کی بڑی طاقتوں کے توازن میں فرق پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اب دیت نام سے کشمیر تک ایک نیم دائرہ ہے جو ہمالیہ کی چوٹیوں سے گزرتا ہوا جہلم کی وادیوں تک پہنچ جاتا ہے اور اس میں ایشیائی اقوام کی آرزوؤں اور امیدوں کی بڑی طاقتوں کے مفادات اور سیاسی مصلحتوں کی جگہاں چمک رہی ہیں۔

اس نیم دائرے کے بطن میں مستقبل کی ساری تعبیریں ہیں۔ وہ بہت بھیا تک بھی ہو سکتی ہیں اور اگر انسانی اقدار کی جیت ہو تو ایک خوبصورت بشارت بھی بن سکتی ہیں لیکن یہ بشارت اس دن پوری ہو گی جب خوف کے بجائے محبت جنگوں کے روکنے کا باعث بنے گی۔ جب نفرت کے بجائے ایک عالمگیر انسانی برادری کا تصور انسان کے درمیان نئے رشتے قائم کرے گا۔

اس لیے آج کی جنگ آلود فضا میں ان قدروں کا نام بار بار لینا ضروری ہے جو ساری انسانیت کا صدیوں کا ورثہ ہیں اور یہ خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان نے اپنی بائیس دن کی دفاعی جنگ میں بھی جو ہمیں مجبوراً لڑنی پڑی ان قدروں کو فراموش نہیں کیا۔ ہم جو گوتم بدھ، اشوک، کبیر، گردنا تک، میر، غالب، ٹیگور، گاندھی اور نہرو کی شرافت کے وارث ہیں آج بھی ان الفاظ کو فخر کے ساتھ دہرا سکتے ہیں جو ہمارے راشنرپتی ڈاکٹر رادھا کرشنن نے 25 ستمبر 65ء کی رات ہندوستانی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی ریڈیو تقریر میں ارشاد فرمائے تھے:-

”جنگ جو کبھی کبھی دفاعی مقاصد کے لیے ضروری ہو جاتی ہے اس کے بعد بھی ایک بدی ہے اور انسانیت کے لیے خطرہ۔ اس سے کسی مسلک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا کیونکہ وہ اپنے پیچھے صرف تلخی خوف اور شبہات چھوڑ جاتی ہے اور سماجی اور معاشی ترقی کی تمام کوششوں کو نقصان پہنچاتی ہے.....

”ہم ایک بین الاقوامی برادری کے رکن ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ انسانیت تمام قوموں سے بالاتر ہے اس لیے ہمیں خلوص نیت کے ساتھ تمام جھگڑوں کے پرامن فیصلے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ہر سچے انسان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جس حد تک ممکن ہو اپنی انسانیت کو برقرار رکھے۔

’برمن فلسفی شاہین ہارکو یہ شکایت تھی کہ اکثر انسان بندر سے ملے



جلتے ہیں اس نے انفس کے ساتھ کہا کہ اس سے بھی بری بات یہ ہے کہ دور سے ان پر انسان ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ زیادہ تر جنگیں غلط فہمی، جھنجھلاہٹ، ناگامی، محرومی اور قومی جذبات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اگر ہم انسانوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان تمام جذباتی کیفیات پر قابو حاصل کرنا پڑے گا۔“

(مائٹنر آف انڈیا بمبئی کی رپورٹ سے ترجمہ 26 ستمبر 1965)

ڈاکٹر رادھا کرشنن کے الفاظ میں ہندوستان کی صدیوں کا دل دھڑک رہا ہے۔ یہ ہم سب کے دل کی آواز ہے۔ اپنی سرحد، اپنی آزادی، اپنی غیر مذہبی جمہوریت کی حفاظت میں بحالت مجبوری ہتھیار اٹھانے کے باوجود جنگ کی خواہش کو کبھی برکت کا نام نہیں دیا گیا۔ یہ چونکہ ہماری مملکت کے صدر اور ہندوستان کے سب سے زیادہ ذمہ دار شہری کے الفاظ ہیں اس لیے ان میں حکومت کی جنگ اور امن کی پالیسی تلاش کی جاسکتی ہے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جنگ نفرت کے ساتھ نہیں بلکہ انتہائی دردمندی کے ساتھ لڑی گئی ہے۔ جنگ کی ناگزیر غارت گری اور تباہ کاری کے باوجود دلوں میں اتحاد، محبت اور امن کا جذبہ انگڑائیاں لیتا رہا ہے اور آج بھی ہر دل میں یہی خواہش ہے کہ ہماری سلگتی ہوئی سرحدیں بد امن ہو جائیں۔ وزیر اعظم شاستری کی ہر تقریر، ہر بیان سے اس نصب العین پر ہمارے بنیادی عقیدے کی مہر ثبت ہوتی ہے۔

ہماری قوم کے دل کی صحیح حالت کا اندازہ عصمت چغتائی کی ایک مختصر سی تقریر سے کیا جاسکتا ہے۔ عصمت نے کہا کہ:

”اگر میرا بھائی، میری بیٹی کے سینے میں خنجر بھونکنے کی کوشش کرے گا تو

میں اپنے بھائی کو قتل کر دوں گی اور پھر اس کی لاش پر بیٹھ کر روؤں گی۔“

کچھ ایسا ہی جذبہ عظیم امریکی شاعر والٹ وھٹ مین کی ایک نظم میں ہے۔ وہ کہتا ہے :

’مصالحت ایک لفظ ہے، آسمان کی طرح خوبصورت

’خوبصورت اس لیے کہ جنگ اور اس کی تباہ کاریاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں

’خوبصورت اس لیے کہ موت اور رات جو دو بہنیں ہیں ان کے

ہاتھ خون اور گندگی سے بھری ہوئی زمین

کو بار بار دھوئیں

’کیونکہ میرا دشمن مر چکا ہے، ایک ایسا شخص جو میری طرح مقدس

اور ملکوٹی تھا

’میں وہاں نظر ڈالتا ہوں جہاں وہ اپنے سفید بے خون

چہرے کے ساتھ

تابوت میں لیٹا ہوا ہے

میں اس کے قریب آتا ہوں

’اور جھکتا ہوں اور جھک کر تابوت کے اندر سفید چہرے کو بڑی نرمی کے ساتھ

اپنے ہونٹوں سے چھو لیتا ہوں‘

بہمنی کے ادیبوں کے اسی جلسے میں گجراتی زبان کے ایک بڑے ادیب گلاب داس بردکار نے اپنے پاکستان میں رہنے والے گجراتی قارئین کا ذکر کیا جو انھیں محبت اور پیار سے تحفے بھیجتے رہتے ہیں۔ نئی دہلی کی مشہور نامہ نگار خاتون امیتا ملک کا بیان ہے کہ عین اس زمانے میں جب ہندوستانی فوجیں لاہور سکس کی طرف بڑھ رہی تھیں، دلی میں نہ جانے کتنے لوگ جن کی حب الوطنی پر شبہ نہیں کیا جا سکتا، لاہور اور سیالکوٹ کے گلی کوچوں کو فخر اور محبت کے ساتھ یاد کر رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ وہ ہندو اور سکھ ہیں جو تقسیم کے وقت ان شہروں سے بے آبرو ہو کر نکلے تھے لیکن ان کے پیار کا یہ عالم تھا کہ وہ لاہور کو چیرس کی طرح حسین کہہ رہے تھے۔ حالانکہ ملک کے قومی رہنما اور فوجی افسر بار بار یہ اعلان کر رہے تھے کہ ہندوستانی فوجوں کا مقصد لاہور پر قبضہ کرنا نہیں ہے پھر بھی یہ دکھے ہوئے دلوں کے ہندوستانی لاہور کے لیے بیتاب تھے۔

(السٹریٹ ویلکی آف انڈیا، بہمنی)

خود وزیراعظم شاستری، وزیر دفاع چوہان اور ہمارے نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین نے راشٹر پتی کی آواز میں آواز ملا کر ان جذبات کا اظہار کیا کہ ہماری لڑائی پاکستان کے عوام کے خلاف نہیں ہے۔ ہم ان کی ایک انچ زمین پر بھی قبضہ نہیں کرنا چاہتے، ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ وہ ایک خوش حال اور پُر امن زندگی بسر کریں اور ہمیں ہمارے ملک کے اندر چین سے رہنے دیں۔ جب جنگ اپنے شباب پر تھی اور روزانہ بمباری کی خبریں آرہی تھیں اور دلی اور بہمنی کی دہلی کی طرح جھگمگاتی ہوئی راتیں سیاہ پوش ہو گئی تھیں، اس وقت بھی ہر ایک کے دل میں یہی جذبہ تھا کہ یہ جنگ جلد سے جلد ختم ہو جائے۔

اسی زمانے میں میری نظم ’کون دشمن ہے‘ شائع ہوئی۔ اس نظم کا اور اس کے بعد ’صبح فردا‘ اور ’وسری نظموں کا جس محبت اور خلوص کے ساتھ ہر حلقے میں استقبال کیا گیا وہ ہندوستانی قوم کے دل کی

بنیادی شرافت کا ثبوت تھا۔ اردو کے علاوہ ہندی، انگریزی، مراٹھی، گجراتی، پنجابی اخبارات اور رسائل نے اس نظم کو بار بار شائع کیا، دوستوں نے اسے ایک دوسرے کے پاس تحفے کی طرح بھیجا، پڑھنے والوں نے مجھے محبت بھرے خطوط لکھے، آل انڈیا ریڈیو نے اسے مختلف شہروں سے بار بار نشر کیا اور کشمیر کے وزیر اعلیٰ محمد طارق نے مجھے سری نگر سے لکھا کہ:

’نظم بے حد پسند کی گئی۔ کل مجھے ریڈیو سے سرحد کے اس پار رہنے والوں کو خطاب کرتا تھا۔ میں نے تقریر کم کی اور نظم زیادہ سنائی۔ پوسٹر اور پمفلٹ کی شکل میں نظم چھاپی جا رہی ہے۔‘

میں نے بمبئی اور دہلی کے درمیان مختلف شہروں میں صرف چند ہفتوں کے اندر یہ نظم سیکڑوں بار سنائی اور بعض محفلوں میں کئی کئی بار پڑھی اور ہر مرتبہ کسی بوڑھے، کسی جوان، کسی مرد یا عورت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہ نم دیدہ آنکھیں ہندو اور مسلمان کی قید سے آزاد تھیں۔

میں نے تیس برس کی شاعرانہ زندگی میں اس سے اچھی نظمیں بھی کہی ہیں، پرسکون زمانے میں بھی اور طوفانی دور میں بھی، سیاسی ہنگاموں اور فرقہ وارانہ فسادات کی تباہ کاریوں کے عالم میں، جب کہ جذبات براہِ بیخندہ ہوتے ہیں، میری کسی نظم کا اتنا شاندار استقبال نہیں ہوا۔ اس تجربے نے میرے یقین اور حوصلے کو بڑھا دیا ہے۔ میں اپنے ملک کی صحت مند جمہوری روایت پر فخر کر سکتا ہوں اور اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہماری قوم کی روح گندی نہیں ہے اور اس بُرائی امن قوم کو جنگ باز قوم میں تبدیل کیا جاسکتا۔ یہ ہندوستان کی عظمت اور صداقت کی دلیل ہے کہ جنگ کے شباب کے زمانے میں بھی عام آدمی گلوگیر آواز میں یہ مصرعے میرے ساتھ دہرا رہے تھے۔

ہمارے پاس ہے کیا دردِ مشترک کے سوا  
مزا تو جب تھا کہ مل کر علاج جاں کرتے  
خود اپنے ہاتھوں سے تعمیرِ گلستاں کرتے  
ہمارے درد میں تم اور تمہارے درد میں ہم  
شریک ہوتے تو پھر جشنِ آشیاں کرتے

اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جاسکتا ہے کہ تقسیم کے باوجود ہندوستان اور پاکستان کے عوام ایک دوسرے سے جتنے قریب ہیں دنیا کا کوئی ملک اس کی مثال نہیں پیش کر سکتا۔ ہندوستان کے تمدن کے ابتدائی سرچشمے ہڑپا اور مہنڈو داڑو تہذیب کی نشانیاں تھکشا اور سکھوں کی مقدس زیارت گاہیں پاکستان میں

ہیں گردِ نایک کے نقشِ قدم اب بھی اس خاک میں تلاش کیے جاسکتے ہیں اور مسلمانوں کی تہذیب کی نشانیاں لال قلعہ، قطب مینار، تاج محل، نظام الدین اولیا اور خواجہ معین الدین چشتی کے مزار، غالب اور میر کے شہر دلی اور لکھنؤ اور آگرہ سب ہندستان میں ہیں۔ اسی بنگالی زبان کی خوشبوڑھا کے میں پھیلی ہوئی ہے جس سے کلکتے کی گلیاں معطر ہیں۔ ٹیگور اور نذر الاسلام دونوں جگہ کے قومی شاعر ہیں۔ اگر ایک دلی اٹھ کر کراچی میں جا بستی ہے تو ایک لاہور دلی میں آباد ہو گیا ہے۔ وہی اردو، وہی پنجابی، وہی سندھی زبانیں دونوں ملکوں کے درمیان دریاؤں کی طرح بہہ رہی ہیں، اگر فیض ہندستان میں مقبول ہیں تو مولانا ابوالکلام آزاد اور کرشن چندر کی تحریریں پاکستانیوں کی آنکھ کا سرمہ ہیں۔ ہماری تہذیب، ہمارا تمدن، ہمارا رہن سہن، ہماری جذباتی افتاد، ہمارے پیار کرنے اور نفرت کرنے کے طریقے سب ایک سے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی امر تار پر تہمِ تقسیم کی غارت گری پر آنسو بہاتی ہے تو اپنی بے بسی کے عالم میں وارث شاہ کو آواز دیتی ہے۔ لاہور یڈو اور دلی یڈو ایک ہی لے میں سیر گاتے ہیں۔ پھر کیا اس کے بعد ہم یہ محسوس کرنے پر مجبور نہیں ہیں کہ ان دو ملکوں کے درمیان ہونے والی جنگ سے زیادہ بھیانک کسی اور جنگ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

غالباً 10 یا 11 ستمبر کی بات ہے میں اپنے گھر کی دوسری منزل سے اتر رہا تھا کہ پہلی منزل کے زینے پر مجھے ایک سکھ دوست ملے جنہیں میں اتنا کم جانتا تھا کہ پہچاننے میں تکلف ہوا۔ وہ تھوڑی دور میرے ساتھ چلتے رہے اور پھر پوچھنے لگے 'کیا بور ہا ہے؟' میں نے ایک لفظ میں جواب دیا 'جنگ' سردار جی خاموش رہے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بولے 'ایک شعر سناؤں' اور انھوں نے مجھے میرا ایک پرانا شعر سنایا۔

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا

راستے بند ہیں سب کوچہ قاتل کے سوا

یہ محبت اور دردمندی اگر پاکستان کو بھی نصیب ہو جائے تو ہم بڑی آسانی سے کوچہ قاتل کو کوچہ جاناں میں تبدیل کر سکتے ہیں۔

لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ پاکستان کے ادیبوں اور دانشوروں نے نفرت کو اپنا سب سے بڑا حربہ بنا رکھا ہے۔ ہمیں پاکستان کے اندرونی حالات میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور نہ ہم پاکستان کے حکمرانوں سے بات کر سکتے ہیں لیکن ہم پاکستان کے شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کو مخاطب کرنے کا حق ضرور رکھتے ہیں اور اگر ہماری آواز ان تک پہنچ سکے تو ہم ان سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ

ہندستان کے خلاف نفرت پھیلانے کے بجائے اگر وہ اپنے ملک کے اندر محبت، دوستی اور ہمدردی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں، اپنے عوام کے جمہوری حقوق کے لیے آواز بلند کریں اور اپنے ملک کو سامراجی سازشوں کے جال سے باہر نکال لینے کی جدوجہد میں اپنے قلم سے کام لیں تو ہندستان اور پاکستان کے درمیان خوشگوار حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ دونوں ملکوں کی بقا اور ترقی ہی کے لیے نہیں بلکہ سارے ایشیا کی آزادی اور سارے عالم کے امن کے لیے ایک مبارک قدم ہوگا۔

ہماری پیش کش امن ہے اور ہم اس کا جواب امن کے نعرے ہی کی شکل میں سننا چاہتے ہیں۔ انسانی برادری کا جو خواب صوفیوں اور سنتوں نے دیکھا تھا، جس کے ترانے رومی، حافظ، کبیر اور گرو نانک جیسی مقدس ہستیوں نے گائے تھے، وہ خواب ابھی تک شرمندہ تعبیر نہیں ہوا ہے۔ انسان اب بھی نسل، رنگ مذہب، عقائد، سیاست، جغرافیائی حدود اور قوموں کے نام پر تقسیم ہے۔ جب انسان ان تمام اضافی تعریفوں سے بے نیاز ہو کر صرف انسان رہ جائے گا، وہ وقت ابھی بہت دور ہے لیکن اس وقت کا تھوڑا کرنا، اس کو محسوس کرنا، دیکھ لینا اور اس کا جشن منانا ہر شاعر کا کام ہے۔

بمبئی

سرदार جعفری

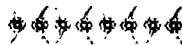
اکتوبر 1965

## پیرا، بن شرر

کھڑا ہے کون یہ پیرا، بن شرر پئے  
 بدن ہے چور تو ماتھے سے خون جاری ہے  
 زمانہ گزرا کہ فر باد قیس ختم ہوئے  
 یہ کس پہ اہل جہاں، ختم سنگ باری ہے  
 یہاں تو کوئی بھی شیریں ادا نکار نہیں  
 یہاں تو کوئی بھی لیلیٰ بدن بہار نہیں  
 یہ کس کے نام پہ زخموں کی لالہ کاری ہے

کوئی دوانہ ہے، لیتا ہے جج کا نام اب تک  
 فریب و مکر کو کرتا نہیں سلام اب تک  
 ہے بات صاف سزا اس کی سنگ ساری ہے

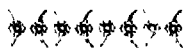
6، اگست 1965



## تم بھی آؤ

منزل دور اندھیری راہیں  
 کانٹے کانٹے، جنگل جنگل  
 خشک لبو کے لیے صحرا  
 خون کی بارش  
 سناٹوں کے بھاری پنہر  
 جیسے اولوں کا چہرہ آؤ  
 تنہا رہیں کٹ نہ سکیں گی  
 تنہا منزل مل نہ سکے گی  
 پاؤں کے چھالے  
 دشت کے دل میں  
 بھول کی صورت کھل نہ سکیں گے  
 خون کی بارش رک نہ سکے گی  
 سناٹوں کے ہاتھ کے پنہر  
 ختم نہ ہوں گے  
 میں تنہا ہوں، تم بھی تنہا  
 تنہا تمہاں جاؤں گے  
 میں آتا ہوں  
 تم بھی آؤ

15 جولائی 1965



# انٹلکچوئل

(ایک طنزیہ نظم)

یہ کتابیں ہیں، یہ کافی کے حسیں بیالے ہیں  
جس پہ بنگال کے نقاشوں نے  
اپنے ہاتھوں سے بنائے ہیں عجب نقش و نگار  
جنہی، اسے کی تصویریں بھی شرمندہ ہیں

اور یہ نوٹا ہوا سر، اٹینٹھے ہوئے ہاتھ اور پاؤں  
سات آنکھوں کا فریب  
کیا رہ ہونٹوں کا طلسم

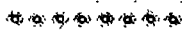
ایک تصویر ہے، مقصد ہے نہ مطلب کوئی  
صرف اک لذت اظہار کا آئینہ ہے  
کس کو معلوم حسیں کیا ہے، بھیانک کیا ہے  
ایک ہی شے ہے، جسے کہتے ہیں احساسِ نشاط  
یا نشاطِ احساس  
نہ تو اظہار ہی ممکن ہے، نہ ترسیل اس کی



جس کو سر سمجھا تھا، وہ سر بھی نہیں  
 آنکھ اور ہونٹ فقط رنگ کے کچھ دھبے ہیں  
 اور دھبے بھی نہیں  
 شاید اک لمحہ بیتاب و گریزاں جم کر  
 قطرہ خون دل و اشک بنا جاتا ہے

اور یہ لمحہ کہ ازل ہے نہ ابد  
 وقت کی جنش پر کا یہ گریزاں سایہ  
 آتشیں بوسہ لب ماضی و مستقبل کا  
 یاس و امید کی ہم آغوشی  
 موت اور زیست کا وصل  
 یہی انساں کی حقیقت، یہی انسان کی اصل

وقت اور موت کے پنجے سے ملے گی نہ نجات  
 سب ہی بے کار ہیں شمشاد قدوں کی باتیں  
 لب لعلیں کی میٹھنسی کے قہقے  
 حق و باطل کے تصادم کے تمام افسانے  
 اک حقیقت ہے تو وہ روح کی تنہائی ہے  
 مئے تنہائی سے تنہائی کا پیکار نہ بھرو  
 مئے تنہائی سے  
 مئے تنہائی سے



## یہ لہو

اس لہو کا لیا کرو گے

یہ لہو

گرم جیسے بوسہ لب، سرخ جیسے رنگ گل  
 نچھے بچوں کا تھم، بوزھے ہونٹوں کی دعا  
 نیم، آفتخموں کا کاہل بزم ہاتھوں کی جتا  
 برہم مطب کا فغہ، ساز شاعر کی نوا  
 'شق کا مہد وفا

یہ لہو کا فر نہیں، مرتد نہیں، مسلم نہیں  
 وید و گیتا کا ترنم، مصحف یزداں کا لحن  
 یہ کتاب زندگی کا پہلا حرف دل نواز  
 آرزوئی سب سے پہلی رائی  
 روح انجیل مقدس، جان تو ریت و زبور  
 خنجروں کی پیاس اس شعلے سے بجھ سکتی نہیں

اس لہو کا لیا کرو گے

یہ لہو

گرم و سرخ و نو جوان

خاک پر ٹپکے گا تو جل جائے گی دھرتی کی کوکھ  
 آسمان سے قطرہ رحمت نہ برے گا کبھی  
 کوئی دانہ پھر نہ اُجے گا کبھی  
 کوئی کونیل مسکرائے گی نہ پھر مہکے گا پھول

یہ لہو ہونٹوں کی خوشبو، یہ لہو نظروں کا نور  
 یہ لہو عارض کی رنگت، یہ لہو دل کا سرور  
 آفتاب کو و فاراں، جلوہ سینا و طور  
 شعلہ حرف صداقت، سوز جانِ ناصبور  
 کلہ حق کا اجالا، یہ تجلی کا ظہور  
 یہ لہو، میرا لہو، تیرا لہو، سب کا لہو

10 اگست 1965



## دعا

(وایت نام سے کشمیر تک خون آلودہ افق کے نام)

پھر چلا جنگ کا دیوتا  
 سرخ شعلوں کے فخر کو تانے ہوئے  
 خون کی پیاس سے  
 گوشت کی بھوک سے  
 چیخا اور چنگھاڑا  
 آسمانوں پہ غفریت کی طرح اڑتا ہوا  
 موت کی طرح دھرتی پہ چلتا ہوا

حسن کی خیر ہو، خیر بچوں کی معصومیت کی  
 فصلیں بھی ہوئی  
 کھیت گھبرائے گھبرائے سے  
 جو فضا میں نئی کونپلوں کی مہک سے معطر تھیں وہ  
 گندی بارود کی بو سے سرشار ہیں  
 خوں کے چھینٹے ہیں شبنم کے پیرا ہنوں پر  
 مندر دوں، مسجدوں اور کلیساؤں کے دامنوں پر

اس کا آغاز سب چم ہے،  
انجام چھ بھی نہیں  
حاصل قتل و غارت ہے کیا؟  
چند اجڑے ہوئے شہر، جھلے ہوئے راستے  
سرنگوں بیوگی  
اشک آلودہ و زخم خورہ تپتی

کوئی گونم نہیں جس کی شفقت  
دل کے زخموں پہ رکھ دے  
اپنے غمگیں تبسم کی درد آشنا چاندنی  
کوئی گاندھی نہیں  
آج جس کی شہادت سپر بن کے ہر وار کو روک لے  
کوئی نہر نہیں  
جس کا دامن پکڑ کر یہ پوچھیں یہ کیا ہو رہا ہے

گیت کے دل میں فخر ہے، الفاظ ہیں سربریدہ  
اپنے قبضے میں ایک بے بسی کے سوا کچھ نہیں  
مالے بیکار، فریاد بے سود ہے  
آؤ مل کر حُجرت کو آواز دیں  
بچیوں کو پکاریں

16 اگست 1965

## قَطْعہ

دل کو پھر زخم تمنا نے دیا ہے ۔  
 جان بے تاب کو لو درد نے یہ یار کیا  
 جب کبھی یاد کیا شہبہ رمانی —  
 ہم نے بھی کوئے ملامت سے نہ انکار کیا

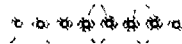
17 اگست 1965



## غزل

الجھے کانٹوں سے کہ کھیلے گل تر سے پہلے  
 فکر یہ ہے کہ صبا آئے کدھر سے پہلے  
 جام و پیانہ و ساقی کا گماں تھا لیکن  
 دیدہ تر ہی تھا یاں دیدہ تر سے پہلے  
 ابر نیساں کی نہ برکت ہے نہ فیضان بہار  
 قطرے گم ہو گئے تعمیرِ گہر سے پہلے  
 جم گیا دل میں لبو، سوکھ گئے آنکھوں میں اشک  
 تھم گیا دردِ جگر، رنگِ سحر سے پہلے  
 قافلے آئے تو تھے نعروں کے پرچم لے کر  
 سرنگوں ہو گئی ہر آہ اثر سے پہلے  
 خونِ سر بہہ گیا، موت آ گئی دیوانوں کو  
 بارشِ سنگ سے طوفانِ شر سے پہلے  
 سرنخیِ خونِ تمنا کی مہک آتی ہے  
 دل کوئی ٹوٹا ہے شاید گل تر سے پہلے  
 مقتلِ شوق کے آدابِ نزالے ہیں بہت  
 دل بھی قاتل کو دیا کرتے ہیں سر سے پہلے

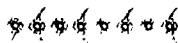
18 اگست 1965



## غزل

وہ بہاریں وہ ہوائیں، جو زمیں زمیں چمن دیں  
وہی مہر و ماہ لائیں، جو افق افق کرن دیں  
یہ نیا زمانہ اے دل جو وقار کھو چکا ہے  
اسے اپنی سر بلندی، اسے اپنا بانک پن دیں  
جو ہیں رند بھٹکے بھٹکے، جو ہیں ساقی بھٹکے بھٹکے  
انہیں درس میکدہ دیں، انہیں ذوق انجمن دیں  
بڑی دیر ہو چکی ہے کہ ہیں نوہ خواں ستارے  
چلو اب شب سیہ کو، نئی صبح کا کفن دیں  
لب تیغ پر لبو ہے، لب زخم پر تہنم  
یہ دیات تن بر بندہ اسے کیسا پیر بن دیں  
نئی روح جسم خستہ کو عطا نہ ہو سکے تو  
یہ کریں کہ روح نو کو، کوئی اک نیا بدن دیں  
نئی ابروؤں کو بجلی، نئی آنکھریوں کو صہبا  
نئی تیغ دیں نظر کو، نئی زلف کو شکن دیں  
یہ زمیں مری زمیں ہے، یہ فلک مرا فلک ہے  
انہیں صید کر چکی ہیں، مرے فکر کی کندیں  
اُسی بزم میں ملیں گے ابھی شعر تر کے ساغر  
چلو بزم جعفری میں تمہیں جام فکر و فن دیں

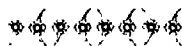
28 اگست 1965





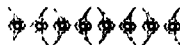
## غزل

وہی ہے وہشت ، وہی ہے نفرت، آخر اس کا کیا ہے سبب  
 انساناں انساناں بہت رٹا ہے ، انساناں انساناں بنے گا کب  
 وید، اپنی شد پرزے پرزے، گیتا قرآن ورق ورق  
 رام و کرشن و گوتم و یزداں ، زخم رسیدہ سب کے سب  
 اب تک ایسا ملا نہ کوئی، دل کی پیاس بجھاتا جو  
 یوں میخانہ چشم بہت ہیں ، بہت ہیں یوں تو ساقی لب  
 جس کی تیغ ہے دنیا اس کی، جس کی لاشی اس کی بھینس  
 سب قاتل ہیں سب مقتول ہیں ، سب مظلوم ہیں ظالم سب  
 خنجر خنجر قاتل ابرو، دلیر ہاتھ، مسیحا ہونٹ  
 لہو لہو ہے شام تمنا، آنسو آنسو صبح طرب  
 دیکھیں دن پھرتے ہیں کب تک، دیکھیں پھر کب ملتے ہیں  
 دل سے دل، آنکھوں سے آنکھیں، ہاتھ سے ہاتھ اور لب سے لب  
 زخمی سرحد، زخمی قومیں، زخمی انساناں ، زخمی ملک  
 حرف حق کی صلیب اٹھائے، کوئی مسیح تو آئے اب



## غزل

کس سے پوچھیں کون بتائے، صبح کی کب بھوئے گی کرن  
 رات کی سرحد مقتلِ مقتل، باندھ کے نکلے سر سے کفن  
 لے کر پھر قدیلِ محبت، اترو دل کے اندھیرے میں  
 روح کی تاریکی کو روشن کرتی نہیں سورج کی کرن  
 جشنِ ستم ہے، ناچ رہے ہیں خنجر، تیغیں گالتی ہیں  
 خون آلودہ شام گیسو، زخمِ رسیدہ صبحِ بدن  
 کعبہِ دل میں بیٹھے ہیں، اب بھی صدیوں کے فرسودہ بُت  
 رنگ و نسل و شیخ و برہمن، مذہب و ملت، ملک و وطن  
 یہ دنیا گمراہ ہے اب تک، پھر بولو اے سنتِ کبیر  
 ایک ہی سونے کے سب گہنے، ایک ہی مٹی کے برتن  
 ایک ہی نور ہے سب شمعوں میں، ایک ہی رس سب میوؤں میں  
 اپنے منہ کو میٹھا کر لو، کر لو آنکھوں کو روشن  
 ایک پرستاں کی سب پریاں، ایک گلستاں کے سب پھول  
 نیلے نیلے، پیلے پیلے، اودے اودے پیراہن  
 خون کی نہریں سبج رہی ہیں انسانی لاشوں کے کھیت  
 بھوکے پیٹ کے کام نہ آئیں گے یہ زخموں کے خرمن  
 ہم نے تو روٹی کی خاطر تن کے کھڑے بیچے ہیں  
 تم نے آخر کس کی خاطر بچ دیا ہے اپنا من



## جنگ بازوں کا فرمان

خون و بارود کی بو کو بھی معطر سمجھو  
 حکم اب یہ ہے کہ زخموں کو گل تر سمجھو  
 موت کی گود سے لذت ہم آغوشی  
 خمِ تلوار کو محبوب کا پیکر سمجھو  
 جنگ کو امن کہو، امن کو دو جنگ کا نام  
 نشترِ خار کو پھولوں کے برابر سمجھو  
 دولتِ دیدہ تر چار طرف عام ہوئی  
 آنسوؤں کو بھی مئے ناب کا ساغر سمجھو  
 روحِ ابلیس کو دو حضرتِ جبریل کا نام  
 جھوٹ کو حکمِ خدا، حرفِ پیہر سمجھو

3 ستمبر 1965



## کون دشمن ہے

یہ نینک، توپ، یہ بمبار، آگ بندوقیں  
کہاں سے لائے ہو بس کی طرف ہے رخ ان کا  
دیار وارث و اقبال کا یہ تحفہ ہے؟  
جگا کے جنگ کے طوفاں زمین ٹانک سے  
اٹھے ہو برق گرانے کبیر کے گھر پر

غلام تم بھی تھے کل تک، غلام ہم بھی تھے  
نہا کے خون میں آئی تھی فصلِ آزادی

ابھی تو صبح کی پہلی ہوائیں سخی ہیں  
ابھی شگونوں نے کھولی نہیں ہے آنکھ اپنی  
ابھی بہار کے لہر پر ہنسی نہیں آئی  
نہ جانے کتنے ستارے بجھی سی آنکھوں کے  
نہ جانے کتنے فردہ ہتھیلیوں کے گلاب  
ترس رہے ہیں ابھی رنگ و روشنی کے لیے

ہمارے پاس ہے کیا درِ مشترک کے سوا

مرا تو جب تھا کہ مل کر علاج جاں کرتے  
خود اپنے ہاتھ سے تعمیر گلستاں کرتے  
ہمارے درد میں تم اور تمہارے درد میں ہم  
شریک ہوتے تو پھر جشنِ آشاں کرتے

مگر تمہاری نگاہوں کا طور ہے کچھ اور  
یہ ہنکے ہنکے قدم اٹھ رہے ہیں کس جانب؟  
کدھر چلے ہو یہ شمشیر آزمانے کو؟  
سمجھ لیا ہے جسے تم نے ملک کی سرحد  
وہ سرحد دل و جاں ہے، ہمارا جسم ہے وہ  
حسین ، بلند، مقدس، جوان، پاکیزہ  
ہے اس کا نام خیابانِ جنت کشمیر  
ہے اس کا نام گلستانِ دلی و پنجاب  
ہم اس کو پیار سے کہتے ہیں لکھنؤ بھی کبھی

تم اس کو تیغ کے ہونٹوں سے چھو نہیں سکتے  
ادب سے آؤ کہ غالب کی سرزمین ہے یہ  
ادب سے آؤ کہ ہے میر کا مزار یہاں  
نظام و کاکي و چشتی کے آستانے ہیں  
جھکا دو تینوں کے سر بارگاہِ رحمت میں

ہمارے دل میں رفاقت بھی اور پیار بھی ہے  
 تمہارے واسطے یہ روح بے قرار بھی ہے  
 اگرچہ کہنے کو جی چاہتا نہیں لیکن  
 جواب اہل ہوس، تنج آب دار بھی ہے  
 ادھر بہن ہے کوئی، کوئی بھائی، کوئی عزیز  
 گزشتہ بادہ پرستوں کی یادگار کوئی  
 رفیق مجلس و زنداں ، رفیق دار کوئی  
 ہماری طرح سے رسوائے کوئے یار کوئی  
 لبوں پہ جن کے تہنم ہے عہد رفتہ کا  
 نظر میں خواب ہیں بیتے ہوئے زمانے کے  
 دلوں میں نور چراغ امید فردا کے

وہ سب جو غیر نظر آرہے ہیں ، اپنے ہیں

ادھر بھی حلقہ یاراں ، ہجوم مُصنّاعاں  
 ادھر بھی چاہنے والوں کی کچھ کمی ہی نہیں  
 ہزاروں سال کی تاریخ ہے ثبوت اس کا  
 کھڑے ہیں سینوں پہ غموں کے گل کھلائے ہوئے  
 دیارِ ہیر کی یادوں سے دل جلائے ہوئے  
 چناب و جہلم و راوی سے لو لگائے ہوئے  
 ہمارے بچ میں حائل ہیں آگ کے دریا

تمہارے اور ہمارے لہو کے ساگر ہیں  
 بہت بلند سیہ نفرتوں کی دیواریں  
 ہم ان کو ایک نظر میں گرا بھی سکتے ہیں  
 تمام ظلم کی باتیں بھلا بھی سکتے ہیں  
 تمہیں پھر اپنے گلے سے لگا بھی سکتے ہیں  
 مگر یہ شرط ہے تیغوں کو توڑنا ہوگا  
 لہو بھرا ہوا دامن نچوڑنا ہوگا  
 پھر اس کے بعد نہ تم غیر ہو نہ غیر ہیں ہم

تم آؤ گلشن لاہور سے چمن بردوش  
 ہم آئیں صبح بنارس کی روشنی لے کر  
 ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر  
 اور اُس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے؟

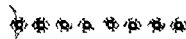


## شہرِ تمنا (دہلی کے نام)

اے دیارِ دوست، اے شہرِ تمنا، آج کیوں  
 آ رہی ہے یاد تیری دلیری کی بار بار  
 دردِ دل کی کیفیت پہلے کبھی ایسی نہ تھی  
 روحِ شاعر یوں تو رہتی ہے ہمیشہ بے قرار  
 جنگ کی تاریک شب ہے اور بلاؤں کا نزول  
 ہونہ جائیں یک بہ یک تیری فضا میں شعلہ بار  
 لٹ نہ جائے یہ ضیاء، یہ رونقِ دیوار و در  
 راکھ ہو جائے نہ جل کر تیرے کوچوں کی بہار  
 منتظر ہوں میں بھی اس جہنِ مسرت کے لیے  
 جس کی خاطر لمحہ لمحہ ہے سراپا انتظار  
 تجھ کو لے لے اپنے حلقے میں جوانی کی امنک  
 سرنگوں ہونے نہ پائے تیری عظمت کا حصار  
 تیری دیواروں سے ٹکرائیں بلائیں اپنا سر  
 تیرے دروازے سے جائے ہو کے آفتِ شرمسار  
 مشعلِ رخسار سے روشن ہوں تیرے بام و در  
 بوئے گیسوئے معنہ سے ہوں گلیاں عطر بار



تیرے دیوانوں پہ برسیں مہرباں نظروں کے تیر  
 عشق کے سینے پہ ہو زلفوں کی تیغ آبِ دار  
 نغمہ جمہوریت ہو تیرے بازاروں کا شور  
 کار خانے گام میں تیرے گیت جیسے آبشار  
 پھول سی آغوش میں بچوں کو مائیں بھیج لیں  
 پھول سے ہونٹوں سے بچے پڑھیں ماں کو پیار  
 پھر اڑیں ہر سمت ہاتھوں کی سنہری تتلیاں  
 دھو دے پھر گرد مصیبت کو تبسم کی پھوار  
 پھر کھلیں در حسن کی محبوب باہوں کی طرح  
 کھڑکیوں سے ہو طلوع جلوۂ دیدار یار  
 بلکا اٹھیں ترے بے نور، بے رونق چراغ  
 تیرے ایوانوں کی گردن میں ہوں پھر شمعوں کے بار  
 آرزوئیں پھر کہیں افسانہ تعمیر نو  
 کشتیِ دل سے ہو طوفانِ تمنا ہم ناز  
 دور ہو کر بھی میں تجھ سے آج ہوں نزدیک تر  
 اے دیارِ دوست، اے شہرِ تمنا، لوئے یار  
 جل رہی ہے دل میں تیری شمعِ محبوبی کی لو  
 روح میں اتری ہوئی ہے حسن کے خنجر کی دھار  
 تیری پیشانی کو چومے فتح و نصرت کی آراں  
 تیرے قدموں پر ہو قرباں گردِ شبِ لیل و نہار



## دستِ فریاد

چھاؤں ہے جنگ کے میدان میں تلواروں کی  
 دل ہلا دیتی ہے لکار جگر داروں کی  
 ایک بھی دشمن جاں نچ کے نہ جانے پائے  
 وہ جو ہتھیار لیے آتے ہیں، سب دشمن ہیں  
 جس نے ہتھیار دیے وہ بھی تو دشمن ہوگا  
 آج ہی کل میں مگر آنے کو ہے روزِ حساب  
 دستِ فریاد میں کس کس کا نہ دامن ہوگا

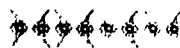
15 ستمبر 1965



## اشکِ ندامت

کہاں ہیں اشکِ ندامت، کہ دھوئیں دامن سے  
 لبو کا داغ، دلوں سے کدورتوں کا غبار  
 یہ اشک ہوں تو ابھی روح پر جلا ہو جائے  
 یہ آدمی کہ جو ہے نفرتوں کے حلقے میں  
 یہ آدمی جو ہوا و ہوس کے دام میں ہے  
 شکارِ اپنی بنائی ہوئی سیاست کا  
 مقامِ عشق پہ فائز ہو اور خدا ہو جائے

16 ستمبر 1965



## صبح فردا

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ککڑے  
 اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبح آزادی  
 یہ سرحد خون کی، اشکوں کی، آہوں کی، شراروں کی  
 جہاں بوئی تھی نفرت اور تلواریں اگائی تھیں

یہاں محبوب آنکھوں کے ستارے تھلائے تھے  
 یہاں معشوق چہرے آنسوؤں میں جھللائے تھے  
 یہاں بیٹوں سے ماں، پیاری بہن بھائی سے چھتری تھی

یہ سرحد جو لبو پیتی ہے اور شعلے اگلتی ہے  
 ہماری خاک کے سینے پہ تاگن بن کے چلتی ہے  
 سجا کر جنگ کے ہتھیار میدان میں نکلتی ہے  
 میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں، صبح فردا کا

(2)

یہ سرحد پھول کی، خوشبو کی، رنگوں کی، بہاروں کی  
 دھنک کی طرح ہنسی، ندیوں کی طرح مل کھاتی  
 وطن کے عارضوں پر زلف کے مانند لہراتی  
 مہکتی، جگمگاتی، اک دلہن کی مانگ کی صورت  
 کہ جو ہالوں کو دوضوں میں تو تقسیم کرتی ہے  
 مگر سیندور کی تلوار سے، صندل کی انگلی سے

یہ سرحد دلبروں کی، عاشقوں کی، بے قراروں کی  
 یہ سرحد دوستوں کی، بھائیوں کی، غم گساروں کی  
 سحر کو آئے خورشید درخشاں پا سہا بن کر  
 نگہبانی ہوشب کو آسمان کے چاند تاروں کی  
 زمیں پامال ہو جائے بھرے کھیتوں کی پورش سے  
 سپاہیں حملہ آور ہوں درختوں کی قطاروں کی  
 خدا محفوظ رکھے اس کو غیروں کی نگاہوں سے  
 پڑیں نظریں نہ اس پر خوں کے تاجر تاہداروں کی  
 کچل دیں اس کو فولادی قدم بھاری مشینوں کے  
 کرے یلغار اس پر ضرب کاری، ستکاروں کی  
 اڑیں چنگاریوں کے پھول، خنجر کے پلجے سے  
 جھکے تیثوں کی محرابوں میں گردن کو ہساروں کی  
 لبوں کی پیاس ڈھالے اپنے ساتی اپنے پینے  
 چمک انھیں سزت سے نگاہیں سو گواروں کی  
 محبت حکمراں ہو، حسن قاتل، دل میجا ہو  
 تپن میں آگ برے شعلہ پیکر گل مزاروں کی

وہ دن آئے کہ آنسو ہو کے نفرت دل سے بہہ جائے  
وہ دن آئے یہ سرحد بوسہ لب بن کے رہ جائے

### (3)

یہ سرحد من چلوں کی، دل جلوں کی، جاں نثاروں کی  
یہ سرحد سرزمین دل کے بانگے شہہ سواروں کی  
یہ سرحد کچ کلاہوں کی، یہ سرحد کچ اداؤں کی  
یہ سرحد گلشن لاہور و دلی کی ہواؤں کی  
یہ سرحد امن و آزادی کے دل افروز خوابوں کی  
یہ سرحد ڈوبتے تاروں، ابھرتے آفتابوں کی  
یہ سرحد خوں میں لتھڑے پیار کے زخمی گلابوں کی

میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبح فردا کا

25 ستمبر 1965



## ہمارے نام

ستارے آماں پر نقری حرفوں سے لکھتے ہیں  
 تمھارا نام تاریلی کے سینے پر ابھرتا ہے  
 یہی تارے تھے جن کو جوڑ کر مدت ہوئی تم نے  
 اندھیری رات لے ماتھے پہ میرا نام لکھا تھا  
 یہ نورانی شے تاج اٹھے تھے، مسکرائے تھے  
 تمھاری ایک انکشت حنائی کے اشارے پر  
 ہمارے بسم کیلی گماں کی شبنم سے تر ہو کر  
 فراز آماں سے کہنشاں کو کھینچ لائے تھے  
 نظر کا نپتی تھی لب تا آشاب تھر تھرائے تھے

زمیں پر میں بھی تنہا ہوں، زمیں پر تم بھی تنہا ہو  
 ہجوم بزمِ یاراں میں، ہجوم غمِ گساراں میں  
 ہزاروں فاصلے ہیں منزلوں کے رگزاروں کے  
 ہزاروں فاصلے دریاؤں کے اور کوہساروں کے  
 ہزاروں فاصلے ایسے کہ تا پے جا نہیں سکتے

مگر نیلی فضا میں آسمانوں کی بلندی پر  
ہمارے نام ہیں دو دوست، دو معشوق، دو عاشق  
جنہوں نے پیار سے ہانپوں میں باہیں ڈال رکھی ہیں

یہ روشن دائرے، ہیروں کی محرابوں کے سائے میں  
کبھی جا کر ٹپتا ہے، کبھی زہرہ سے ملتے ہیں  
کبھی کرتے ہیں باتیں ماہ و مریخ و عطارد سے  
کبھی یہ تیرتے ہیں کہکشاں کی گہری جھیلوں میں  
نہاتے ہیں کبھی رنگِ شفق کے آبشاروں میں

لیے پھرتی ہے ان کو گردشِ شام و سحر لیکن  
یہ دامِ گردشِ شام و سحر کو توڑ دیتے ہیں  
یہ لافانی ستارے عصرِ حاضر کا مقدر ہیں  
زمیں، رقصِ افلاک کے ماتھے کا جھومر ہیں

کبھی دہلی، کبھی شیراز پر یہ جھمکاتے ہیں  
کبھی لندن، کبھی نیویارک پر یہ مسکراتے ہیں  
کبھی یہ ماسکو کے سر پہ تاجِ نور رکھتے ہیں

کبھی یہ دشمنوں کی سرحدوں کو پار کرتے ہیں  
کبھی چشموں، کبھی باغوں کو جھک کر پیار کرتے ہیں  
پروتے ہیں کبھی زلفوں میں موتی مہرِ جبینوں کی  
کھٹکتے ہیں کبھی نظروں میں اپنے نکتہ چینیوں کی  
کبھی یہ جھانکتے ہیں اک عروں نوکی آنکھوں میں  
کبھی مشعل بہ کف، بے آسرا مایوس راتوں میں

کبھی بسکے ہوئے رہرو کو یہ رستہ دکھاتے ہیں  
 کبھی ٹھہرے ہوئے پانی کے اندر ڈوب جاتے ہیں  
 کبھی یہ کھڑکیوں پر پھول کی صورت برستے ہیں  
 کبھی اپنی بلندی سے زمیں والوں پہ ہنستے ہیں  
 کبھی یہ کھیلتے ہیں مہر و شوں سے، ماہ پاروں سے  
 بلاتے ہیں کبھی بچوں کو آنکھوں کے اشاروں سے

کبھی بڑھتی ہوئی فوجوں کے اوپر سے گزرتے ہیں  
 جنازوں میں شہیدان وفا کے ساتھ چلتے ہیں  
 ٹھہرتے ہیں کبھی کشمیر کے یہ لالہ زاروں میں  
 کبھی جنا کی موجوں میں، کبھی گنگا کے دھاروں میں  
 کبھی تبدیل ہو جاتے ہیں آتش میں، شراروں میں

جلا سکتی نہیں جنگوں کی آگ ان ماہتابوں کو  
 بجھا سکتی نہیں بارود روشن آفتابوں کو

ہمارے نام حرفِ خیر و برکت، نور و نزہت ہیں  
 ہمارے نام امن و دوستی، عشق و شرافت ہیں  
 ہمارے نام جنگِ آلودہ و خونخوار دنیا میں  
 اشارہ آدمیت کا ہیں، نیکی کی ضمانت ہیں  
 ہمارے نام طاقت ہیں، لطافت ہیں، صداقت ہیں  
 ہمارے نام لافانی و روحانی مسرت ہیں

ہمارے نام تاریکی کے سینے پر ابھرتے ہیں  
 اندھیری رات کے بے نور ماتھے پر چمکتے ہیں

20 ستمبر 1965

{ } { } { }



## غزل

بیٹھے ہیں جہاں ساقی، پیانہ زر لے کر  
 اس بزم سے اٹھ آئے ہم دیدہ تر لے کر  
 یادوں سے تری روشن محراب شبِ جہراں  
 ڈھونڈھیں گے تجھے کب تک قدیلِ قمر لے کر  
 کیا حسن ہے دنیا میں، کیا لطف ہے جینے میں  
 دیکھے تو کوئی میرا اندازِ نظر لے کر  
 ہوتی ہے زمانے میں کس طرح پذیرائی  
 نکلو تو ذرا گھر سے اک ذوقِ سفر لے کر  
 راہیں چمک اٹھیں گی خورشید کی مشعل سے  
 ہمراہ صبا ہو گی خوشبوئے سحر لے کر  
 محفلِ سی بچا دیں گے قدموں کے تلے ساحلِ  
 دریا اہلِ آئیں گے صدموجِ گہر لے کر  
 پہنائیں گے تاج اپنا بیڑوں کے گھنے سائے  
 ٹھکیں گے شجر اپنے خوش رنگِ ثمر لے کر  
 لپکیں گے گلے ملنے سرد اور صنوبر سب  
 اٹھیں گے گلستاں بھی شاخِ گل تر لے کر

ہتے ہوئے شہروں کی آواز بلائے گی  
 لب جام کے چمکیں گے سوشعلہ تر لے کر  
 افلاک بجائیں گے ساز اپنے ستاروں کا  
 گائیں گے بہت لمبے انفاسِ شر لے کر  
 یہ عالم خاکی اک سیارہ روشن ہے  
 افلاک سے ٹکرا دو تقدیرِ بشر لے کر

30 ستمبر 1965



## جرعہ جرعہ، قطرہ قطرہ

انجم و مہتاب کے سائے میں جب آئے گی رات  
 نیلگوں زلفوں کے بچ و خم میں بل کھائے گی رات  
 مسکرائے گی گر بیانوں میں پھولوں کی طرح  
 آنچلوں کی ریٹھی ٹکٹوں میں لہرائے گی رات  
 مطرب رنگیں نوا کے ساتھ ہوگی نغمہ سنج  
 ساقی کافر ادا کے ساتھ اٹھائے گی رات  
 شعلہ پیکر قامتوں کے خلقہ آغوش میں  
 کبکشاں در کبکشاں پھر رقص میں آئے گی رات  
 چھیڑ دے گی جہش مڑگاں کا سائہ دلبری  
 عارض و لب کے مہکتے پھول برسائے گی رات  
 عشق کے ہونٹوں سے پی کر جرعہ آب حیات  
 حسن کے پیاتہ سیمیں کو چھلکائے گی رات  
 گنگنائے گی جواں پیروں کی بازبوں کے سنگ  
 ساعدوں کی شمع کافوری میں بل جائے گی رات  
 چشم ساقی ہی میں ٹھہرے گی نہ زلف بادہ میں  
 ساغر و مینا کے سینے سے ابل جائے گی رات  
 جرعہ جرعہ کر کے : دق تھگی پی جائے گا  
 قطرہ قطرہ کر کے پیاؤں میں دھل جائے گی رات

رنگِ خونِ آرزو بن کر سحر ہو گئی طلوع  
 درو دل بن کر مگر سینے میں رہ جائے گی رات  
 رنگ و بو کے قافلے، غنچوں کی آوازِ جرس  
 دور باد صبح کی صورت نکل جائے گی رات  
 ہم نہ ہوں گے پر قدحِ خوارانِ بزمِ نو کے ساتھ  
 لے کے صہبائے طرب کے جام پھر آئے گی رات

18 جولائی 1965

XXXX

## چار شعر

کبھی ملے نہ دلِ غم زدہ کو غم سے نجات  
 کبھی تمام نہ ہو تشنہ آرزو کا سفر  
 خیالِ خواب کے سینے میں جگمگا تا رہے  
 جمالِ یار ترے حسن و نور کا نشتر  
 یوں ہی چھلکتا رہے محفلِ تمنا میں  
 پہلے دلِ خونِ گشت، جامِ دیدہ تر  
 یوں ہی چمکتے رہیں دامنِ وگرباں میں  
 ستارہِ سحری بن کے آنسوؤں کے گہر

12 اکتوبر 1965

XXXX

## موسموں کا گیت

(کالی داس کی نظم 'رت سیوں ہارے' سے ماخوذ)

کتنے دل کش ہیں مرے ملک کے موسم، ان میں  
حسن کی بات کریں، عشق پر اصرار کریں  
نورِ محبوب سے روشن کریں آنکھوں کے چراغ  
پھول کی طرح سے ذکرِ لب و رخسار کریں  
مصحفِ حق کی طرح کھولیں کتابِ دل کو  
جس میں جنگ اور جدل کا کوئی افسانہ نہیں  
فصلِ گل فصلِ خزاں، فصلِ زمستان ہے مگر  
موسمِ جنگ نہیں، موسمِ دیرانہ نہیں

(۱)

گرمیاں آئی ہیں برساتی ہوئی انگارے  
دیکھنا شعلہ بدن دھوپ پہ آیا ہے شباب  
لوگ تالابوں میں اترے ہیں نہانے کے لیے  
تہہ نشیں ہوتی چلی جاتی ہے ہر چادرِ آب  
اک ذرا دیر کو تھوڑا سا سکون ملتا ہے  
جسم کو چھوتا ہے جس وقت خشک شام کا ہاتھ

اتنی سوزش ہے کہ بس سرد ہوئی گرمی عشق  
 پیار کے منہ سے نکلتی ہی نہیں پیار کی بات  
 نیند آسکتی نہیں عشق کے پیاروں کو  
 ان دنوں جاگتے رہنے کے بہانے میں بہت  
 تیرتی رہتی ہیں وینا کی سریلی تانیں  
 گیت شیریں ہیں بہت، نرم ترانے ہیں بہت  
 آبِ صندل میں ڈبوئے ہوئے پنکھوں کی ہوا  
 اپنے مہکے ہوئے ہاتھوں سے تھپک دیتی ہے  
 اور دھڑکتے ہوئے سینوں پہ دھڑکتے ہوئے ہار  
 ہرلڑی موتی کی بس جان ہی لے لیتی ہے

آگ برساتی ہوئی دھوپ کی کرنوں کا جلال  
 تیز اور تند ہو جس طرح ہون کا شعلہ  
 دشمنی سانپ کی طاؤس سے بس ختم ہوئی  
 وہ بھی طاؤس سے دیرینہ عداوت بھولا  
 اتنی گرمی ہے کہ کھلتی نہیں مقدار اس کی  
 بھوک باقی نہیں، کیا جائے غذا کے پیچھے  
 دھوپ کی جلتی ہوئی آگ سے بچنے کے لیے  
 سانپ آبِ میٹھا ہے رنگین پروں کے نیچے

میری جاں، اے مرے نغموں کی جواں شہزادی  
 فصلِ گرما سحر و شام تجھے راس آئے  
 چاندنی رات سجائے تری مہکی ہوئی سج  
 جسمِ سیمیں کے لیے پھولوں کے تھے لائے  
 تری مہکوں کو رکھیں سرد کنول کی جھیلیں

ٹھنڈے پانی کے اچھلتے ہوئے فواروں سے  
تیری شاموں کو ترے چاہنے والے مل جائیں  
جو چنیں پھول ترے حسن کے گلزاروں سے  
دھوپ بے جان ہو، گیتوں کی گھٹا چھائی ہو  
تو ہو، احباب ہوں، اور گوشہ تنہائی ہو

(2)

دیکھنا میکہ کا وہ شامسوار آہنچا  
گونج اٹھے کوہ و دمن، گونج اٹھے دشت و جبال  
گھن گرج وہ ہے مری جان، کہ شامی ڈنکے  
جس طرح بیٹے ہیں میداں میں بہ صدشانِ جلال  
بجلی لہراتی ہے شعلوں کا سنہری پرچم  
ابر کے فیل پہ بارش کا شہنشاہ سوار  
گھر سے سب اس کے سواگت کو نکل آئے ہیں  
غول عشاق کے، بدست حسینوں کی قطار

فوجیں بادل کی چلی آتی ہیں کرتی ہوئی کوچ  
چوٹ پڑتی ہے گر جتے ہوئے نظاروں پر  
آگ کی ڈور ہے، رنگوں کی کڑکتی ہے کمان  
بجلیاں باندھی گئیں اندر دھنش پر کس کر  
چھینٹا بارش کا ہے یا تیروں کی بوچھاریں ہیں  
جو کیے دیتا ہیں متوالوں کے دل کو چھلنی  
عشق تو زخم رسیدہ ہے، ستم دیدہ ہے  
آج تو حسن پہ بھی ہوتی ہے ناوکِ فلفلی

ایسا لگتا ہے کہ بننے لگا جنگل سارا  
 اور نیا کے درختوں میں نئے پھول کھلے  
 شائیں بیتاب ہواؤں میں نبت کرنے لگیں  
 جیسے مدھوشی کے عالم میں کوئی رقص کرے  
 آئی نور سے شگوفوں کے لبوں پر ہلکی  
 دل نوازانہ تبسم کی دل آویز کلیر  
 درد باقی ہے تپش کا نہ نشان گرمی کا  
 نکل برسات جو پہنے ہوئے پوشاک حریر

تجھ کو اے نور کی تصویر، مبارک ہوں یہ دن  
 لے کے آئے ہیں جو گنگھور گھٹاؤں کا پیام  
 آتش شوق میں جل جائے جوانی تیری  
 نو عروسی کو تری میٹھ و مسرت کا سلام  
 زندگی جس سے تروتازہ ہے اس بارش سے  
 سبز بیلوں کی طرح تو بھی تروتازہ رہے  
 میری محبوبہ پہ ہو رحمت حق کی بارش  
 جھلکاتا ہوا رخسار رہے غارہ رہے

(3)

لو وہ آتی ہے خزاں، گاؤں کی کنواری جیسے  
 ناز و انداز کی جاں، حسن کی نازک صورت  
 بالیاں دھان کی بالوں میں چار کھچی ہیں  
 دونوں رخسار دکتے ہیں کنول کی صورت  
 جسم پر گھاس کے پھولوں کا مہکتا ملبوس  
 اپنی رفتار سے ہنسون کو بھی شرماتی ہوئی



اس کے سواگت میں چمک اٹھتی ہیں چڑیاں جیسے  
کسی معشوقہ کی پائل کی صدا آتی ہوئی

رات کی مانگ میں تاروں کی سنہری افشاں  
تاج مہتاب سے کچھ اور بھی روشن ہے جہیں  
پیرہن، چاند کی کرنوں کا چمکتا ریشم  
اتنا شفاف کہ بادل کا کہیں نام نہیں  
بنستی ہے دیکھ کے منہ چاند کے آئینے میں  
پڑتی ہے سانولے مکھڑے پہ تہنم کی پھوار  
ایسا لگتا ہے کہ نو عمر ہے، دوشیزہ ہے  
ابھی آنے کو ہے بھر پور جوانی کی بہار

دھان کے کھیت، وہ استادہ شربارد رخت  
جھوم اٹھتے ہیں جب آتے ہیں ہوا کے جھونکے  
لے کے آغوش میں جب تاجتی ہے بادِ خزاں  
پھول ہی پھول برس جاتے ہیں بیڑوں کے تلے  
جہر جہری لیتی ہیں آہستہ کنول کی جھیلیں  
کلیاں منہ چوم کے کلیوں کا جھجک جاتی ہیں  
عشق کے ماروں کو آتا ہے حبت کا خیال  
خواہشیں دل کے کنوروں سے چھلک جاتی ہیں

اس خزاں میں بھی مگر تو ہے بہاروں کی بہار  
نوجوان جسم سے گل رنگ شگونے پھونٹیں  
پیار کے ہاتھ محبت سے سنواریں تھہ کو  
کبھی ہونٹوں، کبھی مشتاق نگاہوں سے چھوئیں  
مسکرائے ترے پیروں کی حنا، اور ہجے

زمینوں کا جسم کی، سینے کا شہرِ اسندل  
دل پہ عشاق لے زلفوں کی کھائیں برسوں  
دھونڈھیں خود، بھونڑوں کو ہستی ہوئی آنکھوں کے کنول

## (4)

باہجی فصل خزاں، فصل زمیں آئی  
کوئی تنہا سی غلی شاخ پہ نم دیدہ ہے  
اپنے دامن میں لیے اپنے نہرے موتی  
خونخند گندم نو کھیت میں بالیدہ ہے  
نم نہ کر جان جہاں، لٹ گئی گردِ دولت گل  
سخت جاں پھول کوئی اب بھی نظر آتا ہے  
برف و باراں سے بھی بجھتا نہیں شعلہ اُس کا  
سرد اور تیز ہواؤں میں بھی لہراتا ہے

برف آلودہ ہواؤں میں لرزتی بلیں  
یاد آتی ہے انھیں موسمِ تابستان کی  
کچھ تو مل جاتی ہے یادوں سے حرارت دل کو  
جب تو درد کو ہے کھوئے ہوئے درماں کی  
زندگی کی وہ تڑپ ہے کہ ابھی زندہ ہیں  
پھر بھی پہلی سی نظر آتی ہیں کھلائی ہوئی  
جس طرح ہجر کی ماری ہو سہاگن کوئی  
جیسے دوشیزہ کوئی عشق کی ترسائی ہوئی

ناش! یہ فصل زمیں ہو تری فصلِ امید  
ہر گھڑی آئے مسرت کے فسانے لے کر

منتظر رہتی ہیں جس کے لیے دوشیزائیں  
 روز و شب آئیں وہ راحت کے نزلے لے کر  
 گاؤں میں شور ہے، ہنگامہ ہے، آوازیں ہیں  
 پک چکے کھیت و نخلیان میں آتا ہے اناج  
 دور آکاش پہ اڑتے ہوئے بگلوں کی قطار  
 حسن کو تیرے ملے عشق و محبت کا خراج

(5)

اے مری جاں، مجھے اذنِ سخن آرائی دے  
 نو بہار آئی ہے، نغموں پہ بہار آجاتے  
 نو بہار ان گل اندام کے دل بننے لگے  
 ان کی بے تاب تمنا کو قرار آ جائے  
 بھر گئی تاج کے ڈھیروں سے زمیں کی گودی  
 بڑھ گئی اور بھی ہر سینے کی شوق انگیزی  
 دور سے آتی ہے سارس کے کلیجے کی پکار  
 خوابوں میں ہوتی ہے، جذبات کی رنگ آمیزی

فصل یہ وہ ہے کہ خوش ہوتے ہیں سب مل جل کر  
 جمع ہو جاتے ہیں جب جلتی ہوئی آگ کے پاس  
 گھر سے باہر جو نکلتے ہیں تو سورج کے لیے  
 سردی جسم بڑھا دیتی ہے کچھ دھوپ کی پیاس  
 زینپ تنِ اطلس و پشینہ و سنجاب و سمور  
 اب جو چلتی ہیں چلیں سرد ہوائیں ہر سو  
 کھڑکیاں بند ہیں اور لپٹی ہوئی ہے تن سے  
 بھینبی بھینبی کسی دوشیزہ بدن کی خوشبو

نو بہاروں کے یہ دن تجھ کو کریں آسودہ  
 رنگ عارض سے ترے حسن کی ہو مغل پوشی  
 خوش کرے عشق کی گستاخ نگاہی تجھ کو  
 تجھ کو سرشار کرے لذت ہم آغوشی  
 نیشکر رس کی لطافت سے دہن کو بھر دے  
 لب شیریں میں ہو پاول کے نوالوں کی مٹھاس  
 تیری ہستی سے رہے دور بہت درد فراق  
 تیری قسمت میں نہ ہو ہجر کی راتوں کا ہراس

(6)

آخرش موسم گل، دیروست آہی گیا  
 اپنے ہاتھوں میں لیے عشق کی رنگین کمان  
 کالے بھوزوں کی قطاروں کی لچکتی ڈوری  
 آم کے پور کے تیر آتے ہیں یا پریم کے بان  
 چھیدتے ہیں یہ مرے دل کو، ترے سینے کو  
 ہم تو اسے چند رو دن عشق کے متوالے ہیں  
 ہم نے کب عشق کے دیوتا سے کیا ہے انکار  
 ہم نے کیا شوق کے پیغام کبھی ملالے ہیں  
 جوش گل یہ ہے کہ شاخوں کی جھکی ہے گردن  
 اور ہوا چلتی ہے مہکی ہوئی اترائی ہوئی  
 جھیلیں ہیں سرخ کٹوروں سے کنول کے رہن  
 عورتیں عشق کی کرنوں سے ہیں گدرائی ہوئی  
 ان سب، نرم، رواں، شام حسین و شاداب  
 ان کے لے لینے کا انداز انھیں آتا ہے

جو بھی اس فصل میں بالیدہ و روئیدہ ہے  
بوئے گل، رنگ بہاراں میں بدل جاتا ہے

بیلا پھولا ہے کہ چلے ہیں خیاباں میں چراغ  
نور کا کج نظر آتا ہے مدھ بن جیسے  
جس طرح عشق میں ہستی ہے سینہ کوئی  
جگمگا اٹھتے ہیں رخساروں کے مکش جیسے  
زاہد خشک کی بھی خیر نہیں ہے کہ رواں  
ہر طرف حسن کی اور عشق کی تصویریں ہیں  
نوجوان سینوں میں جذبات ہیں یا آویزاں  
وصل کے خوابوں کی ہستی ہوتی تصویریں ہیں  
فصل گل آئی ہے یا فصلِ وصال آئی ہے  
ایک معشوقہ خورشید جمال آئی ہے

کتنے دل کش ہیں مرے ملک کے موسم، ان میں  
حسن کی بات کریں عشق پر اصرار کریں  
نورِ محبوب سے روشن کریں آنکھوں کے چراغ  
پھول کی طرح سے ذکرِ لب و رخسار کریں  
صحفِ حق کی طرح کھولیں کتابِ دل کو  
جس میں جنگ اور جدل کا کوئی افسانہ نہیں  
فصلِ گل، فصلِ نزاں، فصلِ زمناں ہے مگر  
بزمِ جنگ نہیں، موسمِ ویرانہ نہیں

12 اکتوبر 1965

## حرفِ آخر

مرگِ مجنوں پہ عقلِ گم ہے میر  
کیا دوانے نے موت پائی ہے

یہ کتاب آخر اکتوبر 65 میں تیار تھی اور میری خواہش تھی کہ وسط نومبر تک شائع ہو جائے۔ لیکن کسی وجہ سے تاخیر ہو گئی۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاخیر اس حرف آخر کے لیے ہوئی تھی جس کے بغیر شاید یہ کتاب نامکمل رہ جاتی۔

جب میں نے 2 جنوری 66 کو شام کے سات بجے شاستری جی کو اپنی نظم 'کون دشمن ہے' دوسری بار سنائی تو مجھے یہ گمان بھی نہ تھا کہ یہ ان کی زندگی کی آخری نظم ہوگی۔ اس وقت میرے دل سے تاشقند ملاقات کی کامیابی کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں اور 10 جنوری کی رات کو امید و بیم کی بہت سی منزلوں سے گزرنے کے بعد میں نے دلی کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ معاہدہ تاشقند کا جشن منایا۔ لیکن 11 جنوری کی صبح یہ معلوم ہوا کہ پردہ گرنے سے پہلے اس ایلیے کا آخری سین باقی تھا جس نے پاک ہند جنگ کی شکل اختیار کی تھی اور معاہدہ تاشقند پر ختم ہو رہا تھا۔ شاستری جی نے جان دے کر اس معاہدے پر اپنے خون کی مہر لگا دی ہے۔

بنا کر دند خوش رہے یہ خاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند ایس عاشقان پاک طینت را

## تاشقند کی شام

۰ نا، جسنِ محبت کہ خوں کی بو نہ رہی  
 برس لے کھل گئے بارود کے یہ بادل  
 بجھی بجھی سی ہے جنگوں کی آخری بجلی  
 مہک رہی ہے گلابوں سے تاشقند کی شام

چگاؤ گیسوئے جاناں کی مہریں راتیں  
 جلاؤ ساعدِ سیمیں کی شمع کا فوری  
 طویل بوسوں کے گل رنگِ جام چھلکاؤ

یہ سرخ جام ہے خوبانِ تاشقند کے نام  
 یہ سبز جام ہے لاہور کے حسینوں کا  
 سفید جام ہے دلی کے دلبروں کے لیے  
 گھلا ہے جس میں محبت کے آفتاب کا رنگ

کھلی ہوئی ہے افق پر شفقِ تبسم کی  
 نسیمِ شوق چلی مہرباںِ تکلم کی  
 لبوں کی شعلہ فشانہ ہے شبنم افشانہ  
 اسی میں صبحِ تمنا نہا کے نکھرے گی



کسی کی زلف نہ اب شام غم میں بکھرے گی  
 جو ان خوف کی ۱۱۰ ی سے اب نہ گزریں گے  
 بیالے موت کے ساحل پہ اب نہ اتریں گے  
 بھی نہ ہائے گی اب ناک و خوں سے مانگ کبھی  
 ملے گی ماں کو نہ مرگ پر کی 'خوش خبری'  
 کوئی نہ ۱۰ ے گا قیہوں کو اب 'مبارک باد'

کھلیں گے پھول بہت سرحد تھمتا پر  
 خبر نہ ہوگی یہ زرخس ہے کس کی آنکھوں کی  
 یہ گل ہے کس کی جبین، کس کا لب ہے یہ لالہ  
 یہ شاخ کس کے جواں بازوؤں کی انگڑائی

بس اتنا ہوگا، یہ دھرتی ہے شہہ سواروں کی  
 جہان حسن کے گم نام تاجداروں کی  
 یہ سرزمین ہے محبت کے خواستگاروں کی  
 جو گل پہ مرتے تھے جنم سے پیار کرتے تھے

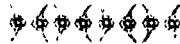
خدا کرے کہ یہ شبنم یوں ہی برتی رہے  
 زمیں ہمیشہ لبو کے لیے ترستی رہے

## اُسے نہ ڈھونڈھو

اُسے نہ ڈھونڈھو  
 اُسے نہ ڈھونڈھو کہ وہ کہیں بھی نہیں ملے گا  
 ابھی یہاں تھا، ابھی وہاں ہے  
 وہاں جہاں سے کبھی کسی کی  
 خبر ملی ہے نہ مل سکے گی  
 وہ ایک تازہ ہوا کا جھونکا تھا، ایک تازہ ہوا کا جھونکا  
 جو زیت کے گلشنِ ترنہ  
 کو رنگ و بوئے بہار دے کر  
 گزر گیا ہے  
 کبھی نہ کہنا وہ مر گیا ہے

11 جنوری 1966

نئی دہلی



## امانتِ غم

وہ جب ملک تھا افق پر، ہمیں خیال نہ تھا  
کہ روشنی کی کرن بھی ہے اس اندھیرے میں  
یہ نفرتوں کا اندھیرا جو دل کا دشمن ہے

ہزاروں لاکھوں ستارے طلوع ہوتے ہیں  
سیاہ رات کے سینے پہ تیرنے کے لیے  
اور اس کے بعد وہ سیلاب صبح میں جا کر  
جو ڈوبتے ہیں تو ان کا پتہ نہیں چلتا  
مگر یہ ننھا ستارہ، یہ نور کا نقطہ  
جو دل نگار بھی تھا اور بے قرار بھی تھا  
غروب ہو کے جو چکا تو آفتاب بنا  
غریب و عاجز و مسکین و بے زر و نادار  
وہ انکسار میں ڈوبا خلوص کا پیکر  
جسے ملی تھی شرافت دکھے ہوئے دل کی  
نہ جاہ و حشمتِ حاکم نہ دولتِ دنیا  
عطا ہوا تھا اُسے صرف مفلسی کا غرور  
وہ ایک اشک کا قطرہ تھا، اس کا سرمایہ  
بس ایک دردِ محبت، بس ایک دولتِ غم

ہر اس ہا آخری تہذبات غم ہے  
یہ بار اٹھے گا ان مجروحہ افسار سے ماتھ

امات غم انماں، امات غم دل  
یہ اک چراغ ہے قندیل مدہ کی طرح  
جو یہ نہ ہو تو زمانے میں رہتھی کیوں

یہ ایک پھول ہے بہ زخم کے گستاں میں  
لہا، نہایا، شہیدوں کے خوں کی بارش میں  
باغ و ایش امن و اماں کی شبنم میں

یہ تاشقند کے سینے کا سرخ پھول بھی ہے  
اسی کہ کہتے ہیں لاہور کی جبین کا گلاب  
مہک رہا ہے جو دلی کے اب گریباں میں

اٹھو کہ جشن دل و جاں منایا جائے گا  
ہر اک چمن میں یہی گل کھلایا جائے گا  
یہ گل جو دروہجت، امات غم ہے  
یہ گل جو شوخ بھی، خوں گشتہ بھی، ملول بھی ہے  
خدائے عشق بھی ہے، امن کا رسول بھی ہے

کم ظرفی گفتار ہے دشنام طرازی  
تہذیب تو شائستگی دیدہ تر ہے

لہو پکارتا ہے

1968

\* اس مجموعہ کا آخری ایڈیشن 1995 میں شائع ہوا۔ جس میں بعد کی تحقیقات بھی شامل کر لی گئیں۔



یہ وہ صدا ہے جسے قتل کر نہیں سکتے

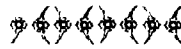


" Cry aloud ,spare not. lift up thy voice like a trumpet.. . "

[ ISAIAH 1 : viii : i ]

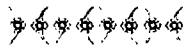
## حرف اول

دستور حکومت کے بنتے ہیں بگڑتے ہیں  
 شاعر کا مگر نغمہ، ہے نغمہ لافانی  
 اس نغمے سے روشن ہے مستقبل انسانی  
 اس نغمے میں پنہاں ہے جمہور کی سلطانی



## ایک شعر

ہینے میں حرارت ہے افسون تمنا سے  
امروز مرا روشن رنگِ رخ فردا سے



## لہو پکارتا ہے

لہو پکارتا ہے  
 ہر طرف پکارتا ہے  
 سحر ہو، شام ہو، خاموشی ہو کہ ہنگامہ  
 جلوسِ غم ہو کہ بزمِ نشاطِ آرائی  
 لہو پکارتا ہے

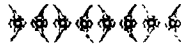
لہو پکارتا ہے جیسے خشک سحر میں  
 پکارا کرتے تھے پیغمبرانِ اسماعیل

زمین کے سینے سے اور آستینِ قاتل سے  
 گلوئے کشتہ سے بے حس زبانِ خنجر سے  
 صدا لپکتی ہے ہر سستِ حرفِ حق کی طرف  
 مگر وہ کان جو بہرے ہیں سن نہیں سلتے  
 مگر وہ قلب جو ٹپکتا ہے سن نہیں سلتے  
 کہ ان میں اہلِ ہوس کی صدا کا سید ہے۔  
 وہ جھکتے رہتے ہیں لبہائے اقتدار کی تہ سے

وہ سننے رہتے ہیں بس حکیمِ حاکمانِ جہاں  
طواف کرتے ہیں اربابِ گیر و دار کے گرد

مگر لہو تو ہے بیباک و سرکش و چالاک  
یہ شعلہ مے کے پیالے میں جاگ اٹھتا ہے  
لباسِ اطلس و دیا میں سرسراتا ہے  
یہ دامنوں کو پکڑتا ہے شاہراہوں میں  
کھڑا ہوا نظر آتا ہے دادگاہوں میں  
زمین سمیٹ نہ پائے گی اس کو بانہوں میں  
چھلک رہے ہیں - مندر سرک رہے ہیں پہاڑ  
لہو پکار رہا ہے، لہو پکارے گا  
یہ وہ صدا ہے جسے قتل کر نہیں سکتے

مارچ 1967



## گفتگو

(ہند پاک دوستی کے نام)

گفتگو بند نہ ہو

بات سے بات چلے  
صبح تک شام ملاقات چلے  
ہم پہ ہنستی ہوئی تاروں بھری یہ رات چلے

ہوں جو الفاظ کے ہاتھوں میں ہیں سنک د شام  
طنز پھلکا گئے تو پھلکا کرے زہر کے جام  
تیکھی نظریں ہوں ترش اپروئے خمدار ہیں  
بن پڑے جیسے بھی دل سینوں میں بیدار ہیں  
بے بسی حرف کو زنجیر پہ پا کر نہ سکے  
کوئی قاتل ہو مگر قتل نہ کر نہ سکے

صبح تک وصل کے کوئی حرف وفا آئے گا  
”شق آئے گا بصد لغزش پا آئے گا“  
نظریں جھک جائیں گی، دل دھڑکیں گے لب کانپیں گے

خامشی بوسہ لب بن کے مہک جائے گی  
صرف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آئے گی

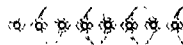
اور پھر حرف و نوا کی نہ ضرورت ہوگی  
چشم و ابرو کے اشاروں میں محبت ہوگی  
نفرت اٹھ جائے گی، مہمان مرقت ہوگی

باتھ میں باتھ لیے سارا جہاں ساتھ لیے  
تحفہ درد لیے پیار کی سوغات لیے  
ریگزاروں سے عداوت کے گزر جائیں گے  
خون کے دریاؤں سے ہم پار اتر جائیں گے

کُتھلو بند نہ ہو

بات سے بات چلے  
صبح تک شام ملاقات چلے  
ہم پہ نیستی ہوئی تاروں بھری یہ رات چلے

اگست 1966



## نظم

انگھیاں بادِ صبا کی بھی لہو سے تر ہیں  
چاک ہوتے ہوئے دیکھا ہے چمن کا سینہ  
تارِ پیراہن گل اڑتے ہوئے دیکھا ہے

اب نہ صیاد سے شکوہ ہے نہ گل چیں سے گلہ  
بلبلیں خود ہی رجز خواں ہیں گلستاں کے خلاف  
قمریاں شاخِ صنوبر کی ہوئی ہیں دشمن  
اب طرفدارِ چمن کوئی نہیں ہے شاید

کوئی بتلاؤ کہ اس دورِ سیہ و حشت میں  
حسنِ معصوم و دل آرا کی ادا کیا ہوگی  
عشقِ برباد کے آداب جنوں کیا ہوں گے



## نظم

وہ شاخِ غم جسے کہتے ہیں دل اسی پہ کہیں  
 کھلا ہے میری محبت تری بہار کا پھول  
 کبھی یہ زخم بنا ہے کبھی تبسم لب  
 جو زخم ہے وہ امانت ہے میرے سینے میں  
 یہ لعل ناب کسی کو دکھا نہیں سکتا  
 مگر تبسم لب صبح کی کرن کی طرح  
 چھپانا لاکھ میں چاہوں چھپا نہیں سکتا  
 جہاں میں بانٹ رہا ہوں یہ دولت بیدار  
 مری بہار کا غنچہ تری بہار کا پھول

1966



## قطعہ

اب کسی کو بھی نہیں حوصلہ تلخی جام  
 خاک پر بکھرے ہیں ٹوٹے ہوئے شیشوں کے نجوم  
 واعظِ شہر کو مے خواروں نے مانا ہے امام  
 خانقاہوں میں ہے زندانِ بلاکش کا نجوم

1966



## آرزوئے تشنہ لبی

خُشکی لب ہے نہ اب دیدہ تر باقی ہے  
جانے کیا ہو گئے وہ عہد گزشتہ کے رفیق  
وقت نے چھین لیا بھوک کا فاقوں کا غور

وہ جو اٹھے تھے زمانے کو بدلنے کے لیے  
ایسے بدلے ہیں کہ حیراں ہیں نگاہیں سب کی  
زیر پا قہلِ آسودہ خرامی کا ہے فرش  
زیب تن خلعتِ پشمینہ در یوزہ گری  
دل ہے یا تمنعہ خوں کشیہ آوازِ ضمیر

جن میں تلواری تھی ان ہاتھوں میں اب ساغر ہیں  
جن میں شفقت تھی ان آنکھوں میں رعنت اب ہے  
اور ان سوکھے ہوئے ہونٹوں کو تر رکھتے ہیں  
چند خیرات میں بخشی ہوئی مے کے جرے  
چند مانگے ہوئے، جھلکے ہوئے ٹوٹے ہوئے جام

دوستو جراتِ شعلہ طلبی لے کے اٹھو  
آج پھر آرزوئے تشنہ لبی لے کے اٹھو

## چار شعر

یہ بزمِ غیر ہے یاں دل کا ماجرا نہ کہو  
سمجھنے والے نہیں، حرف آشنا نہ کہو

خوشی سے کب ہیں گرفتار الفتِ صیاد  
خدا کے واسطے اس جبر کو وفا نہ کہو

اُٹھی ہے آتش و آہن کے گرم سینے سے  
سمومِ دشتِ بلا ہے اسے صبا نہ کہو

بہت سیاہ ہیں راتیں، بہت اندھیرا ہے  
کوئی بھی حرف بجز شعلہ نوا نہ کہو

1966

}}}}{

## دو شعر

شب ہجر صبحِ وصال ہے، ترا عکس جب بھی جگا لیا  
تری یاد دل کا چراغ ہے، سرِ شام ہی سے جلا لیا

غمِ زندگانی تھا تلخ تر غمِ عشق اس کو بنا لیا  
یہ امانتِ غمِ دوست ہے اسے طاقِ دل میں سجا لیا

1966

}}}}{

## غزل

فصل گل فصل خزاں، ہو بھی ہو خوش دل رہے  
 کوئی جسم ہو، ہر اک رنگ میں کامل رہے  
 موج و گرداب و عظام کا تقاضا ہے کچھ اور  
 رہے مٹا تو بس طالب ساطل رہے  
 دیکھتے رہے کہ ہو جائے نہ کم شان جنوں  
 آئینہ بن لے خود اپنے ہی مقابل رہے  
 ان کی نظروں کے سوا سب کی نگاہیں انہیں  
 محفل یار میں بھی زینت محفل رہے  
 دل پہ ہر حال میں ہے صحبت نا جنس حرام  
 حیف صد حیف کہ تا جنوں میں شامل رہے  
 داغ سینے کا دہلتا رہے، جلتا رہے دل  
 رات باقی ہے جہاں تک مہ کامل رہے  
 جانے دولت کونین کو بھی جنس حقیر  
 اور در یار پہ اک بوسے کے سائل رہے  
 عاشقی شیوہ زندانِ بلا کش ہے میاں  
 وہ شائستگی خنجر قاتل رہے

1966

## تمہارا شہر

تمہارا شہر تمہارے بدن کی خوشبو سے  
 مہک رہا تھا، ہر اک بام تم سے روشن تھا  
 ہوا تمہاری طرح ہر روش پہ چلتی تھی  
 تمہارے ہونٹوں سے ہنسی تھیں نرم لب لہیاں  
 عطا ہوئی تھی سحر کو تمہاری سیم تنی  
 ملی تھی شام و شفق کو تمہاری گل بدنی

تمہارا نام تصور بھی تھا، تخیل بھی  
 یقیں بھی، شوق بھی، امید بھی، تمنا بھی  
 سچی تھی زلف جواں آرزو کے پھولوں سے  
 'امیدوار تھے ہر سمت عاشقوں کے گروہ'

مگر یہ کیا ہے کہ ہر کوچہ آج ویراں ہے  
 کلی گلی میں ہیں فولاد پاسیہ مفریت  
 چمن چمن میں سڑی لاش کا تعفن ہے  
 دوائیں گرم ہیں، بارود کا اندھیرا ہے  
 خبر نہیں کہ یہاں سے کدھر کو جاتا ہے

تمہارا شبیر تمہارے بدن کی خوشبو کو  
 ترس رہا ہے، ہر اک بام تیرہ سماں ہے  
 نہ روشنی ہے، نہ نکبت، نہ نفرت ہے، نہ نوا  
 ہر اک روش پہ ہوا چل رہی ہے نوحہ کنناں  
 سحر کی کل بدن پہ لہو کا پیراہن  
 نہ شام ہے، نہ سحر، صرف اک سیاہ آفتاب  
 تمہارا ہے شہر لی مریا نیوں کو ڈھانپتا ہے

خبر نہیں کہ یہاں سے کدھر کو جانا ہے

وہ اک جلوس سا اک موڑ پر نظر آیا  
 کوئی عظیم جنازہ گزرنے والا ہے  
 ہوا میں تالہ و فریاد کی ہے کیفیت  
 ہر ایک آنکھ میں آنسو، ہر ایک ہونٹ پہ آہ  
 دلوں کا نوحہ غم سسکیوں میں ڈھلتا ہے  
 وہ درد ہے کہ کوئی کھل کے رو نہیں سکتا

تھر جنازہ نہیں بھی نظر نہیں آتا  
 آفتاب روش بھی ہیں، گورکن بھی ہیں لیکن  
 کوئی بتا نہیں سکتا کہ کس کی میت ہے  
 کوئی بتا نہیں سکتا کدھر گیا تابوت  
 کوئی بتا نہیں سکتا کہاں ہے قبرستان

چلو قریب سے دیکھیں یہ بدنصیب ہیں کون  
 کلرک ہیں جو ابھی دفتر سے نکلے ہیں  
 تمام ایک سی شکلیں ہیں ہندسوں کی طرح  
 کسان ہیں جو ابھی کھیتیوں سے پلٹے ہیں  
 نکل کے آئے ہیں مزدور کارخانوں سے  
 اور ان کی پشت پہ افسردہ کھولیوں کی قطار  
 سروں پہ اڑتے دھوئیں کے سیاہ رنگِ علم  
 برہنہ بچوں کے رونے کی دردناک صدا

جلوسِ غم ہے جنازہ بدوش چلتا ہے  
 مگر جنازہ کدھر ہے نظر نہیں آتا  
 خبر نہیں کہ یہاں سے کدھر کو جاتا ہے

1966

~ ~ ~ ~ ~

## پھول، چاند، پرچم

یہی ہے منزل  
 جہاں پر ہم تھکتے آ گئے ہیں  
 اور ایک بے شک و بارِ ظلِ مراد لے بیٹھے بیٹھے  
 تمازتِ آفتاب سے اپنا سر پھپھانے کی آرزو میں  
 بہشت کی بات سر رہے ہیں  
 نہ موج کوثر، نہ شاخِ طوبی  
 یہی ہے منزل بہاں سے ہر قافلہ بڑھے گا  
 نشاط کا، درد کا، دنوں کا  
 نشاطِ زمیں کا پھول سے  
 دردِ چاند سینے کا، اور دنوں  
 دھبیوں کا پرچم

انہیں سے ہر قافلہ بنا ہے  
 انہیں سے ہر قافلہ بنے گا  
 یہ قافلہ ہو، ہم تو انسان  
 نجات کے خواب دیکھ لے گا  
 بشارتِ زندگی سنے گا  
 صداقتِ دائمی کے پہرے کا حسنِ نظروں سے پی سکا  
 نہیں تو حیران اور پشیمان  
 کسی کے رحم، کرم، پر زندہ



فریب وعدہ کا زہر کھائے  
 وفائے وعدہ سے لو لگائے  
 بدن چرائے، جیسے جھکائے  
 حقیر کمزوروں کی طرح  
 انجانے اور بے رحم راستوں میں  
 زمیں کے سفاک دل درندوں  
 کے زیر پارینگتار ہے گا

حکومتوں کا جلال، اہل حکم کی صولت  
 سیاہ کاروں کا زور، اہل ہوس کی دولت  
 خبیث روجوں، خبیث اسماں کی سیاست  
 وہ گندگی جس کا ظاہری روپ ہے نفاست  
 سبھی ہیں اس قافلے سے لرزاں  
 یہ قافلہ پھول، چاند، پرچم اٹھائے صدیوں سے چل رہا ہے  
 ہوس کے صحرا  
 جلال و صولت کے ریگزاروں سے  
 پابند بند گزر رہا ہے  
 سبھی کو اس قافلے میں ملنا ہے  
 (کوئی اس سے نہ بچ سکے گا)  
 کسی کو بانگِ درا کے مانند  
 کسی کو گروِ سفر کی صورت  
 کوئی نہیں ہے مفر کی صورت

## لدی تے

(لدی تے پتوہلہ ایہ لے آئی باغ امن کا نام ہے۔ جس میں ماری دنیا لے گلاب ہیں۔ وہاں پہلے اسی نام کا ایک گاؤں تھا جسے جرمن نازیوں نے جلا کر خال کر دیا تھا میں نے 1955ء میں یہ باغ دیکھا تھا۔)

کاب لے بیول

خون ناق لے انا تے بے تمار قطرے  
تہسوں کی بکھی ہوئی آک کے تارے  
گواہ ہیں ان سیہ دنوں کے  
کہ جب جہاں میں  
جوان ماؤں لی لہریاں قتل ہو رہی تھیں  
کہ حسب زمین پر  
سیاہ فولاد جسم مغریت مل رہے تھے  
ہوا میں بارود بن چکی تھیں  
بجائے بلبل نغمہ خوانی لے لہلیاں سنسار ہی تھیں

یہاں

جہاں چاند بکھ چکے ہیں  
ستارے راتوں کی نیلی آنکھوں سے  
اٹل بن کر ٹپک چکے ہیں  
زمین کی کوکھ مل چکی ہے

یہاں

نے پانداگ رہے ہیں  
 نئے ستارے زمین کی کوکھ سے نکلا کر  
 گلاب بن کر مہل رہے ہیں  
 (2)

گلاب کے پھول۔

خون دل کے چراغ روشن  
 یہ ہند کی آرزو، یہ امریکہ کی تمن  
 یہ رہس کی خواہشوں کے رنگین خواب  
 تعمیر خواب انساں  
 یہ گل نے مہدی بشارت  
 یہ نغمے پنچاں کی مسکراہٹ  
 زمین کے سینے میں کروٹیں لیتی کونپلوں کے پیامبر ہیں  
 یہ کارخانوں میں خون فواا کی روانی  
 یہ امن عالم کے پاساں ہیں  
 تمام رنگوں کے بیہ بن ہیں  
 تمام خوتہ کی تتلیاں ہیں  
 مگر یہی پھول

ویت نامی مجاہدوں کے  
 جوان سینے پہ زخم بن کر دھک رہے ہیں  
 زخم جو آفتاب تازہ کا نور لے کر  
 سیاہ بارود کے اندھیرے میں  
 بجلیاں بن کے گر رہے ہیں  
 گلاب کے پھول بس رہے ہیں

## ایک پرانی داستان

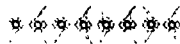
ہنگامیں اٹھتی ہیں جس طرح تیر چلتے ہیں  
فضا میں زہر ہے، جنبش یوں لی قاتل ہے  
سوال یہ ہے کہ یہ شخص بے قصور ہے یوں  
اسے نجوم۔ کال میں نکال کر اداؤ  
اسے ابھی سر بار، سنگ مار کر

یہ ظلم و جبر بھی ایک پیاس ہے جو صدیوں سے  
بجھائی جاتی ہے، انساں کے خون ناحق سے  
کوئی تسکین ہو، کوئی مسیح، یا سقراط  
لہو کی پیاس انھیں ڈھونڈتی ہی رہتی ہے  
زباں نکالے ہوئے، تیوریاں چنہاٹے ہوئے

تمام اہل بوس پارسا ہیں، منصف ہیں  
جو بے قصور ہیں، وہ عدل کے کٹہرے میں  
گلہیلو کی طرح سے بلائے جاتے ہیں  
بس اس خط پہ کہ ہیں محرم رموزیات

ہزار بار زمانے میں آئے ہیں یوسف  
 ہزار بار کچے ہیں وہ مصرِ عالم میں  
 برادروں نے شرافت کا بھیس بدلا ہے  
 خریدنے کو کھل آئی ہیں زلیخا میں  
 اور اس کے بعد وہی ان کی چاک دامانی  
 وہی فریبِ عدالت  
 وہی سلاسلِ زنداں  
 اور اس کے بعد وہی داستانِ طرازی شوق  
 حسنِ یوسف  
 عشقِ زلیخا  
 پاکیِ داماں  
 چاکِ گریباں

1967



## اب بھی روشن ہیں

اب بھی روشن ہیں، میں، ست مینا آلودہ

ریگ صحرا ہے نہ قدموں کے نشاں باقی ہیں  
 خشک اشلوں کی ندی، خون کی ٹھہری ہوئی دھار  
 جھلے، رے ہوئے لمحات کے سوکھے ہوئے خار  
 ہاتھ اٹھائے ہوئے افلاک کی جانب اشجار  
 کامرائی ہی کی تفتی نہ ہریت کا شمار  
 صرف اک درو کا جنگل ہے فقط ہو کا دیار  
 جب گزرتی ہے مگر خوابوں سے، میرا ہے  
 اشک آلودہ، تسم لے چہ انجمن فی قطار  
 جگمگا اٹھتے ہیں کیسے صبا آلودہ

ٹولیاں آتی ہیں نو عمر تمناؤں کی  
 دشت بے رنگ خموشی میں چلتی ہوئی شور  
 پھول مانتے سے برستے ہیں نظر سے تارے  
 ایک اک گام پہ جاوے کھل بفتے ہیں  
 ندیاں بہتی ہیں آنچل سے ہوا چلتی ہے  
 پتیاں ہنستی ہیں اڑتا ہے کرن کا سونا  
 ایسا لگتا ہے کہ بے رحم نہیں ہے دنیا  
 ایسا لگتا ہے کہ بے ظلم زمانے کے ہیں ہاتھ

بیوفانی بھی ہو جس طرح وفا آلودہ

اور پھر شاخوں سے تلواریں برس پڑتی ہیں  
جبر جاگ اٹھتا ہے سفاکی جواں ہوتی ہے  
سائے جو سبز تھے پڑ جاتے ہیں پل بھر میں سیاہ  
اور ہر موڑ پہ غفرتیوں کا ہوتا ہے گماں  
کوئی بھی راہ ہو قتل کی طرف مڑتی ہے  
دل میں خنجر کے اترنے کی صدا آتی ہے  
تیرگی خوں کے اجالے میں نبا جاتی ہے  
شام غم ہوتی ہے غمناک وضیا آلودہ

یہی مظلوموں کی جیت اور یہی ظالم کی شکست  
کہ تمنا نسیں صلیبوں سے اتر آتی ہیں  
اپنی قبروں سے نکلتی ہیں مسیحا بن کر  
قتل گاہوں سے وہ اٹھتی ہیں دعاؤں کی طرح  
دشت و دریا سے گزرتی ہیں ہواؤں کی طرح  
مہر جب لگتی ہے ہونٹوں پہ زباں پر تالے  
قید جب ہوتی ہے سینے میں دلوں کی دھڑکن  
روح چیخ اٹھتی ہے، ہلٹے ہیں شجر اور حجر  
خامشی ہوتی ہے کچھ اور نوا آلودہ

سرکشی ڈھونڈھتی ہے ذوق گنہ گاری کو  
خود سے شرمندہ نہیں اوروں سے شرمندہ نہیں  
یہ مرادل ہے کہ معصوم و خطا آلودہ



## شعور

مری رگوں میں چمکتے ہوئے لہو کو سنو  
ہزاروں لالہوں ستاروں نے ماز چھیڑا ہے  
ہر ایک بوند میں آفاق گنگناتے ہیں

یہ شرق و غرب، شمال و جنوب، پست و بلند  
لہو میں غرق ہیں، اور شش جہات کا آئینہ  
زمین کی پینک، طلوع نجوم شمس، قمر  
غروب شام، زوال شب، نمود و سحر  
تمام عالم رعنائی، بزم برتائی  
کنول کی طرح، ملے ہیں لہو کی جھیلوں میں

کائنات مرے دل کی ہڑتوں میں آیا  
میں ایک ذرہ، بساط نظام شمسی پر  
میں ایک نقطہ سر کائنات، ہم، شعور  
میں ایک قطرہ، انا البحر ہے صدا میری  
میں کائنات میں تنہا ہوں آفتاب کی طرح  
مرے لبہ میں رواں وید بھی ہے قرآن بھی  
شجر حجر بھی ہیں، سحر ابھی ہیں گلستاں بھی  
کہ میں ہوں، ارث تاریخ مصر انسانی  
قدم قدم پہ جہنم، قدم قدم پہ بہشت



## برہنہ فقیر

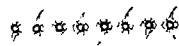
مری زندگی، تری زندگی  
 یہ جو ایک کہنہ لبادہ ہے  
 ہیں کشیدہ اس پہ ہزار گل  
 کوئی خون سے کوئی شعلے سے  
 کوئی اشک سے، کوئی آہ سے  
 کوئی خوف اور گناہ سے  
 کوئی اک تہسم زیر لب  
 کوئی حرف نیم نگاہ سے  
 کوئی کم ہے یاں نہ زیادہ ہے  
 مری زندگی، تری زندگی  
 یہ جو ایک کہنہ لبادہ ہے

عدم ایک برہنہ فقیر ہے  
 کہ لباس جس کا ہوا میں ہیں  
 کہ لباس جس کا دشائیں<sup>1</sup> ہیں  
 کبھی چاند کو وہ پہنتا ہے

لکھی، ہانپتا ہے بدن کو وہ  
 نئے آفتاب نور سے  
 بھی رنل گل کے ریہ سے  
 بھی پوے گل کے لتاں سے  
 مگر اس کے بعد بھی وہ قیہ  
 یوں ہی گھومتا ہے برہنہ تن  
 مَتنا سے ظلمت و نور میں  
 بھی سیپ۔ کاندہ بے بدن

مری آمد کی تری رند کی  
 اسے، یقی سے یا پیر بن  
 یہ جو وصامت ماروے  
 جو برہنہ عدم کو روز  
 نیا اس لباس پہناتا ہے

19 اپریل 1967



## نفرتوں کی سپر

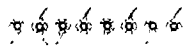
وہ نفرتوں کی سپر دل پہ رکھ کے آتے ہیں  
 وہ بدنصیب، وہ محروم درد انسانی  
 انھیں ملی ہی نہیں چشمِ تر کی تابانی  
 نہ ان کی بات میں لگت نہ آنکھ میں غم ہے  
 نہ ذوقِ چاک گریباں نہ چاک دامانی  
 لبوں پہ نعرہٴ وحشت، نگاہ برآم ہے  
 قلم ہے ہاتھ میں، تلوار دستِ قاتل میں  
 بس اپنا جوہر تیغِ زباں دکھاتے ہیں  
 بیانِ خون و کفن کر کے مسکراتے ہیں  
 انھیں خبر نہیں اک چیزِ زخمِ دل بھی ہے  
 کہ جس سے ہوتی ہے تہذیبِ نفسِ انسانی

قطر

(ویت نام)

سر فروشان محبت کے جنوں کے آگے  
سر فاقل بھی، سر دار بھی خم ہوتا ہے  
ست جلا، سے گر جاتی ہے شمشیر تم  
(فد حق سینہ باطل پہ رقم ہوتا ہے

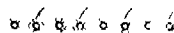
1968



دو شعر

مری جرد و نوحی شوق ہے ترے لعل لب کے فشار سے  
ترا سن بادۂ تاب ہے جو کھنچا ہے رنگ بہار سے  
تجھے اے شبِ غمِ زندگی، وہ طلوعِ صبح نصیب ہو  
جو دمِ اٹھے رخ، ست سے جو دمک اٹھے لب بار سے

1969



## غزل

شمع کا، سے کا، شفق زار کا، گلزار کا رنگ  
 سب میں اور سب سے جدا ہے لب دلدار کا رنگ  
 تہہ عارض جو فروزاں ہیں ہزاروں شمعیں  
 لطف اقرار ہے یا شوخی انکار کا رنگ  
 آئی مہکی ہوئی پھر جشن ملاقات کی رات  
 جام میں ڈھلنے لگا شام کے رخسار کا رنگ  
 عکس ساقی سے دمک ابھی ہے ساغر کی جہیں  
 اور کچھ شوخ ہوا بادۂ گلزار کا رنگ  
 ان کے آنے کو چھپاؤں تو چھپاؤں کیسے  
 بدلا بدلا سا ہے میرے درہ دیوار کا رنگ  
 اور ہے عشق کی نظروں کا نکھارا ہوا روپ  
 یوں تو شائستہ تھا پہلے بھی رخ یار کا رنگ  
 موج طوفاں بھی ہے اور جوش بہاراں بھی ہے  
 کون سا دیکھو گے تم دیدہ نواں بار کا رنگ  
 شفق صبح شہادت سے ہے تابندہ جہیں  
 ورنہ آلودہ نواں تھا افق دار کا رنگ  
 آفتابوں کی طرح جاگتی ہے انسان کی جوت  
 جگمگاتا ہے نہرا پردۂ اسرار کا رنگ  
 وقت کی روح متور ہے نواسے میری  
 مصر نو میں ہے مری شوخی گفتار کا رنگ

# جشن دلداری

(love in)

وقت ہے فرمان عشق و عاشقی جاری کریں  
 سن والوں سے کہو سامان دلداری کریں  
 مہنہ آنکھوں میں لہرائے بدن میں موج نور  
 ماضوں سے چاند سورج پر ضیا باری کریں  
 کھول کر بند قبا، بکھرا کے زلف عنبریں  
 عشق رسوا کی پذیرائی کی تیاری کریں  
 رہگزاروں میں جلائیں عشق و مستی کے چراغ  
 رونے کے بغیر ہست گوشوں میں شرر باری کریں  
 آہستی، سندی، سمیں تنوں کے رقص سے  
 ساری دنیا پر جنوں کی کیفیت طاری کریں  
 جشن بیزاری منائیں ظلم و نغوت کے خلاف  
 قریہ قریہ شہر شہر آوارہ رفتاری کریں  
 لذت شہد و شکر ہو خوش بیانی میں مگر  
 اہلکارانِ ستم سے تلخ گفتاری کریں  
 تاجدارانِ جہاں کے سامنے سر نہ ہوں

نازنینِ جہاں کی ناز برداری کریں  
 کج کلابانِ جنوں کو دیں خراجِ تہنیت  
 بوسہ ہائے لب سے روحِ دل پہ گلکاری کریں  
 دوسرا عقل و خرد ہے جب ریاکاری کا نام  
 کیوں نہ اس کو غرقِ سرمستی و سرشاری کریں  
 ساری دنیا جل رہی ہے نفرتوں کی آگ میں  
 عشق والے آئیں اب دنیا کی سرداری کریں  
 مشرق و مغرب میں جا کر خونِ انساں کیوں بہائیں  
 اس سے بہتر ہے کہ مہ خوانوں میں مے خواری کریں  
 فخر سے پہنیں گلے میں تمغہٴ ۱ آوارگی  
 اور یوں انسانیت کا جشنِ بیداری کریں

28 فروری 1971



نئی دہلی۔ مارچ 1971



## دلنواز لہو

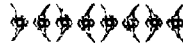
بہت حسین بہت دلنواز ہے یہ لہو  
 کشید تم نے کیا ہے جو قلبِ انساں سے  
 جو عارضوں سے چرایا، لبوں سے چھینا ہے  
 تمہارے جام میں ڈھلتا ہے موجِ مے بن کر  
 لطیف و نرم ہے نیگور کی زباں جیسے  
 جوان و شوخ، چمکتی ہیں بجلیاں جیسے  
 یہ نندیوں کی طرح سے زمیں پہ بہتا ہے  
 تمہارے پاؤں کے نیچے ہمیشہ رہتا ہے  
 خوش، جیسے یہ منہ میں زباں نہیں رکھتا

بہت حسین بہت دلنواز ہے یہ لہو  
 مگر اب اس سے ڈرو، انقلاب ہے یہ لہو  
 ہر ایک ظلم و ستم کا جواب ہے یہ لہو

## قطعہ

دور سے ختم ہوا، ختم ہوئی صحبت شب  
 ہو چکی صبح مگر رات ابھی باقی ہے  
 ایسا لگتا ہے کہ بچھڑی ہے ابھی مل کے نگاہ  
 ایسا لگتا ہے ملاقات ابھی باقی ہے

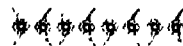
نومبر 1971



## کون سیج بولے گا

کون اس عہد میں سیج بولے گا  
 حرف آتے ہیں قطاروں میں سپاہی کی طرح  
 سہم شاہی کی طرح  
 اور پھر آتے ہیں آنچہ اور بھی حرف  
 صف پہ صف دست جنوں باندھے ہوئے  
 ایک بھی حرف نہیں جودل و جاں بن جائے  
 عہد حاضر کی زباں بن جائے  
 سیج تو اک درد ہے، اک زخم ہے، اک جرأت ہے  
 قید و زنداں بھی ہے سیج اور رن و دار بھی ہے  
 لذت شوق بھی ہے اور ندرتِ اظہار بھی ہے  
 'کون ہوتا ہے حریف مے مردانِ مکن عشق'

20 ستمبر 1972



## تین شعر

میری آنکھوں کی بہار، اے شہ شمشاد قداس  
میرے شعروں کی زباں، خسرو شیریں دہناں  
لب پہ روشن ہو کوئی حرفِ مروت کی کرن  
منہ سے بولو بھی تو اے بادِ شہِ کم خناں  
خاک سے روز نکلتا ہے شہیدوں کا جلوس  
صورتِ لالہ و گل ہلکتی خونیں کفناں

1972



## دو شعر

اگر ہے سائی میخانہ کو غرور بہت  
ہمیں بھی اپنی جگہ ہے غرورِ تشہِ لبی  
برایک برگِ گل و لالہ مستِ جامِ بہار  
برایک قطرہٗ شبنم ہے شیعہٗ حلّی

مارچ 1973



## قطرہ

میری آنکھوں کو تیرے حسن نے ٹھنڈک بخشی  
زندگی جلتی رہی دھوپ کی صورت جن میں  
اب کبھی کھلتے ہیں فردوسِ بریں کے غنچے  
اتر آتے ہیں کبھی پائند ستارے ان میں

13 اکتوبر 1973

{ } { } { }

## دو شعر

اہلِ دل جب تری زلفوں کے جنوں تک آئے  
ساحلِ درد سے اٹھے تو سکون تک آئے

ایک بھی ان میں نہ تھا اس رہنِ روشن کا جواب  
کتے خورشید میری تپشِ خوں تک آئے

مارچ 1973

{ } { } { }

## دو شعر

زمانہ زیب تن پیراہن گل کرنے والا ہے  
ہوائے صبح مشرق پھر نشاط انگیز ہے ساقی  
وہ ساغر دے کہ دنیا محلہ گل بن کے جاگ اٹھے  
جہاں کی تیرگی کب سے شر انگیز ہے ساقی

مارچ 1973

}}}}{

## خون کا اجالا

(چلی کے شہیدوں کی یاد میں)

چلی کے سرخ شہیدو سلام لو میرا  
مرے عزیز زودا<sup>1</sup> کے ہم وطن یارو  
تمہارے خون کی سرخی میں وہ اجالا ہے  
کہ قاتل اپنے اندھیرے میں چھپ نہیں سکتے  
ہزار قتل کی سازش ہزار جنگ کے دار  
تمہارا خون مگر رائیگاں نہ جائے گا  
زمانہ جسم سے ملبوس زخم اتارے گا  
حیات پیراہن گل کے انتظار میں ہے

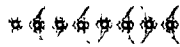
12 ستمبر 1973

}}}}{

## سجاد ظہیر

اے صبا گل مری جانب سے دل کے لیے  
جس کی دھڑکن میں پھپھا تھا نغمہ عالم کا دل  
دشمنوں کے واسطے جو آہن و نوا، تھا  
دوستوں کے واسطے تھا قطرہ شبنم کا دل

15 ستمبر 1973



## صلیب

اپنی زنجیروں کی جھنکار پہ میں اڑتا ہوں  
اپنی ناکامی سے بڑھ جاتی ہے رفتار مری  
آنسوؤں کے میں اجالے میں سفر کرتا ہوں  
پاؤں کے چھالوں سے ہو جاتی ہیں راہیں روشن  
دل میں انسانوں کے آتا ہوں اٹھائے ہوئے میں اپنی صلیب  
اور پاتا ہوں عروج  
اے خدا میری صلیب اور بلند اور بلند  
میرے دکھ اور سوا اور سوا اور سوا

(ماخوذ)

اکتوبر 1973



## چار شعر

ہر طرف ہے ریگ صحرا، ہر طرف ہے خارزار  
خونِ دل دیجے تو شاید ہے کہ آجائے بہار

رہبری میں جس کے سارے کارواں کو سنب دیں  
ہے کہاں، کوئی تو بتلاؤ، وہ مردِ اعتبار

یوں تو کہنے کے لیے آتی ہیں محسوسِ روزِ روز  
جانے کیوں کتنی نہیں ہے پھر بھی شامِ انتظار

عارضِ گل ہے کہ محرومِ تجلی اب بھی ہے  
کب سے رکھی ہے خزاں کے دل پہ تیغِ نو بہار

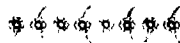
دسمبر 1973



## غزل

خرد والو، جنوں والوں کے ویرانوں میں آجاؤ  
 دلوں کے باغ، رخصتوں کے گلستانوں میں آجاؤ  
 یہ دامن و گریباں اب سلامت رہ نہیں سکتے  
 ابھی تک کچھ نہیں بگڑا ہے، دیوانوں میں آجاؤ  
 ستم کی تیغ خود دست ستم کو کاٹ دیتی ہے  
 ستم رانو تم اب اپنے عزا خانوں میں آجاؤ  
 یہ کب تک سرد لاشیں بے حسی کے برف خانوں میں  
 چراغ درد سے روشن شبستانوں میں آجاؤ  
 یہ کب تک سیم و زر کے جنگلوں میں مشق خونخواری  
 یہ انسانوں کی بستی ہے اب انسانوں میں آجاؤ  
 کبھی شبنم کا قطرہ بن کے چمکو لالہ و گل پر  
 کبھی دریاؤں کی صورت بیابانوں میں آجاؤ  
 ہوا ہے سخت، اب اشکوں کے پرچم اڑ نہیں سکتے  
 لہو کے سرخ پرچم لے کے میدانوں میں آجاؤ  
 جراحت خانہ دل ہے تلاش رنگ و نکبت میں  
 کہاں ہو اے گلستانو! گریبانوں میں آجاؤ  
 زمانہ کر رہا ہے اہتمام جشنِ بیداری  
 گریباں چاک کر کے شعلہ دامنوں میں آجاؤ

12 فروری 1974

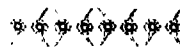




## نظم

بھئی ہم پی رہے ہیں آج لے کر تیرا نام  
 لکھنؤ کی مے کے ساغر، بادۂ دہلی کے جام  
 صبح کی آنکھوں میں ہے صبح بنارس کا سرور  
 زلفِ شب میں خم پہ خم شامِ اودھ کا اہتمام  
 ہے ہوا میں وادیِ گنگا کی خوشبوئے بہار  
 ساحلِ موجِ عرب کو موجِ جمن کا سلام  
 لے کے آئے ہیں مراٹھی کی زمیں کے واسطے  
 آسمانِ شوق سے اردو نوازوں کا پیام  
 مختلف ہوں سب کی طرزیں مختلف ہوں سب کے رنگ  
 پھر بھی سارے ہم نوا یاں چمن ہوں ہم کلام

( یکم مئی 1974 آل انڈیا ریڈیو، بھئی بزمِ اردو کا افتتاح )



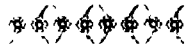
# غزل

(نذر جوش)

وہ صبح گل، وہ جوشِ شام بادہ ہے کہاں ساقی  
 نہ جسن دل، نہ فصلِ روئے سادہ ہے یہاں ساقی  
 حیاتِ نو گریباں چاکِ پیراہنِ دریدہ ہے  
 بحر کی روشنی پہ خونِ دل کا ہے گماں ساقی  
 مذاقِ عاشقی اک جرم ہے ان کی سیاست میں  
 متاعِ دلبری ہے تیغ و شمشیر و سناں ساقی  
 تماشا بن گئی انسان کی خواری اس زمانے میں  
 جہاں سے اٹھ گیا رسمِ مروت کا نشان ساقی  
 خبر ہے زخم کا ہے نامِ تمغائے وفا داری  
 سنا ہے تیغ ہے پیغمبرِ امن و اماں ساقی  
 یہ محفل ہے کہ مقتلِ گاہ ہے اہلِ تمنا کی  
 یہاں تو بات کرنے پر بھی کنتی ہے زباں ساقی  
 اب ان کے ہاتھ میں ہے اہتمامِ بزمِ انسانی  
 جو کانٹوں کو اڑھاتے ہیں حریر و پرنیاں ساقی  
 جہاں فریاد ہے اہلِ ستم کا جی بہکتا ہے

وہاں پر کون سمجھے گا زبانِ بے زباں ساقی  
 ہوئی ہے تربیتِ دل کی جلالِ خاکساری سے  
 مری نظروں میں کیا ٹھہرے شکوہ خسرواں ساقی  
 کوئی دیوانہ کوئی رند کیوں بردھتا نہیں آگے  
 کہ خالی دیر سے ہے مسندِ پیرِ مفاں ساقی  
 یہ مانا گر زباں کھولی تو جاں سے ہاتھ دھوتا ہے  
 یہ خاموشی تو لیکن روح و دل کا ہے زباں ساقی  
 کہیں سے ڈھونڈ لے اندازِ اگلی بیقراری کا  
 کہیں سے لے کے آ پہا! ساوہ قلبِ تپاں ساقی

7 مئی 1974



## دو شعر

درد دریا ہے ایک بہتا ہوا  
 جس کے ساحل بدلتے رہتے ہیں

وہی تلوار اور وہی مقتل  
 صرف قاتل بدلتے رہتے ہیں

1974



## غزل

اُک صبح ہے جو بولی نہیں ہے  
 اُک رات ہے جو بولی نہیں ہے  
 مقتولوں کا قتل نہ ہائے  
 قاتل کی کہیں کمی نہیں ہے  
 ویرانوں سے آ رہی ہے آواز  
 تخلیق بنوں کی نہیں ہے  
 ہے اور ہی کارہ بار مُستی  
 کی لینا تو زندگی نہیں ہے  
 ماتی سے جو جام لے نہ بڑھ کر  
 وہ تھکنے تھکنی نہیں ہے  
 عاشق نشی و فریب کاری  
 یہ شیوہ دلبری نہیں ہے  
 بھوکوں کی نگاہ میں ہے بھلی  
 یہ برق ابھی گری نہیں ہے  
 دل میں جو جلائی تھی کسی نے  
 وہ شمع طرب بجھی نہیں ہے  
 اک دھوپ سی ہے جو زیرِ مڑگاں  
 وہ آنکھ ابھی اٹھی نہیں ہے  
 ہیں کام بہت ابھی کہ دنیا  
 شازی آدمی نہیں ہے  
 ہر رنگ کے آچکے ہیں فرعون  
 لنین یہ جیسے بھلی نہیں ہے

ستمبر 1974

## شاعر

میں کہ ہوں اٹک کا ایک موتی  
 درو کے نیلے رخسار پر  
 خونِ ناحق کی اک بوند  
 سفاک تلوار کی دھار پر  
 ایک بیتاب بوہ  
 اُن لبوں پر جو بوسوں سے محروم ہیں  
 اک قسم کی بیباک ورہِ شن کرن  
 خنجر وں کی چمک کے مقابل  
 ایک نعرہ ہوں میں  
 ایک پرچم ہوں میں  
 ایک - مندر کا بیساختہ قہقہہ  
 اور ان کے سوا  
 یعنی سچھ اور بھی  
 جس کو اک لفظ 'شاعر' نئی معنویت عطا کر رہا ہے  
 گیت کا روپ  
 نغمے کا پیکر

25 اکتوبر 1974

## غزل

صبح کے اجالے پر رات کا کماں کیوں ہے  
جل رہی ہے کیا دنیا، چرخ پہ دھواں کیوں ہے

قطرہ ہائے شبنم ہیں یا لبو کی بوندیں ہیں  
رنگ و نور کا دامن آج خونچکاں کیوں ہے

خُم بھرے ہیں یا خالی کچھ پتا نہیں چلتا  
آج وقت کا ساقی اتنا سرگراں کیوں ہے

خنجر دوس کی سازش پر کب تک یہ ناموش  
روح کیوں ہے تن بستہ نغمہ بے زباں کیوں ہے

قافلے بھٹکتے ہیں منزلِ تمنا پر  
عشق کیوں ہے سرگرواں، حسن بے نشان کیوں ہے

راستہ نہیں چلتے صرف خاک اڑاتے ہیں  
کارواں سے بھی آگے گزر دکارواں کیوں سے

پنچھ کی نہیں لیلیٰ، کوئی کچھ تو بتلاؤ  
مشق اس تم گر کا شوق کا زیاں کیوں ہے

تم تو گھ سے نکلے تھے جیتنے کو دل سب کا  
تجہ ہاتھ میں کیوں ہے دوش پہ کہاں کیوں ہے

اک جہاں میں شہرت ہے تم بڑے مہیا ہو  
پھر یہ شاہراہوں پر درد کی دکان کیوں ہے

قتل کر کے آئے ہیں اور تن کے بیٹھے ہیں  
پوچھتے ہیں حیرت سے، نالہ و فغاں کیوں ہے

فرش ہو کہ عرش اسے دل یہ جہیں نہیں جھکتی  
راہ سرفروشی میں نلب آستان کیوں ہے

یہ ہے بزمِ مے نوشی اس میں سب برابر ہیں  
پھر حساب ساقی میں سود کیوں زیاں کیوں ہے

## غزل

سرد ہیں دل، آتش روئے نگاراں چاہیے  
 شعلہ رنل بہار کل عذراں چاہیے  
 منزلِ عشق و جنوں بے فاصلے ہیں سرِ بکف  
 ان کھن راہوں میں لطفِ دست یاراں چاہیے  
 لٹ رہی ہے اور آت چکتی نہیں فصلِ خزاں  
 تیز تر اک اور تیغِ نو بہاراں چاہیے  
 آج بے خانے میں حرمِ ساقی کے لیے  
 التفاتِ حرمِ سرت میکساراں چاہیے  
 اس دلِ وحشی کی آزادی کا کیا کیجئے علاج  
 اک کمند گیسوئے یزداں شکاراں چاہیے  
 نغمہ بن جاتا ہے نالہ ان کی بزمِ تاز میں  
 ان کو خوش رکھنے کو شورِ سوغواراں چاہیے  
 آسمانوں سے برستے ہیں زمیں پر رگزار  
 آج پھر سردارِ رقصِ برق و باراں چاہیے



## نظم

تیرگی پھر خونِ انساں کی قبا پہنے ہوئے  
دے رہی ہے صبحِ نو کا کم نگاہوں کو فریب

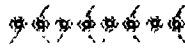
جنوری 1974



## نظم

درد کو روح کا آزار بنانے والو  
یہ شرارہ ہے جو شعلے میں بدل سکتا ہے  
اور لپکتی ہوئی تلوار میں ڈھل سکتا ہے

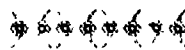
فروری 1974



## نظم

زندگانی ہے کہ شمشیرِ بربند جس کی  
دھار پر چلتے ہیں ہم  
اور ہر قطرہٴ خوں کے دل میں  
اپنے قدموں کے نشاں چھوڑتے ہیں  
دور تک جاتا ہے قطروں کا جلوس  
خوابِ مگر تب بہاراں کی ردِ اوڑھے ہوئے

اپریل 1974



## غزل

جا لے لحن لی قدیل نور بار چلو  
 لٹاتے دولت گل صورت بہار چلو  
 وصال و ہجر لی راہوں میں روشنی دے  
 دلوں میں لے کے چراغِ جمالِ یار چلو  
 انھیں سے پھول کھینیں گے لہو لہان ہیں پاؤں  
 ابھی تو وقت طاب میں بہت ہیں خار چلو  
 کہاں ہو میرے رفیقانِ حرف و صوت و صدا  
 سکوتِ شب ہے یہ رنگِ شعلہ بار چلو  
 امیدِ نور میں جنت پہ رکھنے والو  
 بلا رہے ہیں حسینانِ روزگار چلو  
 عدو کے تیغِ تم سے مقابلہ ہے ابھی  
 بھلا کے ظلمِ رفیقانِ کم عیار چلو  
 سوادِ منزلِ جاناں قریب ہے شاید  
 مثالِ بادِ صبا ہو کے بے قرار چلو

فروری 1975



## غزل

ستاروں کے پیام آئے، بہاروں کے سلام آئے  
 ہزاروں نامہ ہائے شوق اہل دل کے کام آئے  
 نہ جانے کتنی نظریں اس دلِ وحشی پہ پڑتی ہیں  
 براک کو فکر ہے اس کی، یہ شاہیں زیرِ دام آئے  
 اسی امید میں بیتابی جاں بڑھتی جاتی ہے  
 سکونِ دل جہاں ممکن ہو شاید وہ مقام آئے  
 ہماری تپکلی بجھتی نہیں شبنم کے قطروں سے  
 جسے ساقی گری کی شرم ہو آتشِ بجام آئے  
 کوئی شاید ہمارے داغِ دل کی طرح روشن ہو  
 ہزاروں آفتاب اس شوق میں بالائے بام آئے  
 انھیں راہوں میں شیخ و محتسب حائل رہے اکثر  
 انھیں راہوں میں حورانِ بہشتی کے خیام آئے  
 نکاہیں منتظر ہیں ایک خورشیدِ تمنا کی  
 ابھی تک جتنے مہر و ماہ آئے نہ تمام آئے  
 یہ عالم لذتِ تخلیق کا ہے قصِ لافانی  
 تصورِ خانۂ حیرت میں لاکھوں صبح و شام آئے  
 کوئی سردار کب تھا اس سے پہلے تیری محفل میں  
 بہت اہلِ سخن اٹھے، بہت اہلِ کلام آئے

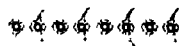
فروری 1975



## غزل

آج کی شام تنہا کی ہے شام اے ساقی  
 پابند کی طرح چھلکتا ہوا جام اے ساقی  
 تیز تر گردش ہے، تیز تر آہنگ نشاط  
 وقت کس درجہ ہے آہستہ خرام اے ساقی  
 زندگی کیا ہے بس اک گردش پیانہ رنگ  
 صبح بھی آئے گی آئی ہے جو شام اے ساقی  
 شاہراہوں پہ ہے پھر رقص میں رندوں کا ہجوم  
 آج سے خانے میں چینا ہے حرام اے ساقی  
 کیسے سمجھائیں کہ سے روح کو تر کرتی ہے  
 زلبد خشک تو ہے خام کا خام اے ساقی  
 جس میں شوخی بھی، بشارت بھی، رفاقت بھی ہو  
 ایک بار اور وہی طرز کلام اے ساقی

4 اگست 1975



## صبحِ نوا

اگرچہ دشتِ خموشی بہت ہے تیرہ و تار  
لباسِ نور میں صبحِ نوا بھی آئے گی  
فرازِ شوق سے اترے گی آبجئے کلام  
لبوں پہ پہنے ہوئے رنگِ آرزو مندی  
نہ جانے کتنے خداوند گاہِ دور سیاہ  
پناہ مانگیں گے لفظوں کی تیز کرنوں سے  
سحر کی زد میں ہے شانِ شبِ خداوندی

یکم دسمبر 1975



## کارل مارکس

’نمیت پیغمبر ولیکن در بغل دار و کتاب‘  
اقبال

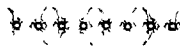
وہ آگ مارکس لے سینے میں جو ہوئی روشن  
وہ آگ سینے انساں میں آفتاب ہے آج  
وہ آگ جنبش لب جنبش قلم بھی بنی  
ہر ایک حرف نئے عہد کی کتاب ہے آج  
زمانہ گیر و خود آگاہ و سرکش و بیباک  
سرورِ نغمہ و رستی شباب ہے آج  
ہر ایک آنکھ میں رقصاں ہے کوئی منظر نو  
ہر ایک دل میں کوئی دلیوار خواب ہے آج  
وہ جلوہ جس کی تمنا تھی چشمِ آدم کو  
وہ جلوہ چشمِ تمنا میں بے نقاب ہے آج

4 دسمبر 1975

## غزل

چشم بد مست کو پھر شیوہ دلداری دے  
 دل آوارہ کو پیغام گرفتاری دے  
 عشق ہے سادہ و معصوم اسے اپنی طرح  
 جوہر تیغ ادا، خنجر عیاری دے  
 جو دُکھے دل ہیں انھیں دولتِ درماں ہو عطا  
 درد کے ہاتھ میں مت کاسہ ناداری دے  
 کتنی فرسودہ ہے یہ جرم و سزا کی دنیا  
 سرکشی دل کو نیا ذوقِ گنہگاری دے  
 شاخ گل کب سے ہے سینے میں چھپائے ہوئے گل  
 دیکھیں کب بادِ صبا حکم چمن کاری دے  
 اے مرے شعلہ دل، شعلہ شعر و دانش  
 رات آخر ہے اسے جشنِ شرر باری دے  
 چمنِ افسردہ ہے اے جانِ چمنِ روح بہار  
 گل کو بھی اپنے تبسم کی فسوں کاری دے

26 ستمبر 1976



## غزل

موسم رنگ بھی ہے فصلِ خزاں بھی طاری  
 دیکھنا خون کے دھبے ہیں کہ ہے گلکاری  
 اس سے ہر طرح سے تذلیلِ بشر ہوتی ہے  
 باعثِ فخر نہیں مفلسی و ناداری  
 انقلابی ہو تو ہے فقر بھی توقیرِ حیات  
 ورنہ ہے عاجزی و بے کسی و عیاری  
 شعلہٴ گل کی بڑھا دیتی ہے لو بادِ بہار  
 تہہٴ شبنم بھی دہک اٹھتی ہے اک چنگاری  
 لمحہ لمحہ ہے کہ ہے قافلہٴ منزلِ نور  
 سرحدِ شب میں بھی فرمانِ سحر ہے جاری  
 تیغ و خنجر کو عطا کرتے ہیں لفظوں کی نیام  
 ظلم کی کرتے ہیں جب اہلِ ستم تیاری  
 حرفِ سردار میں پوشیدہ ہیں اسرارِ حیات  
 شعرِ سردار میں ہے سرکشی و سرشاری  
 شعرِ سردار میں ہے شعلہٴ بیباک کا رنگ  
 حرفِ سردار میں حق گوئی و خوش گفتاری

دسمبر 1976



## خاموشی

خاموشی خواب بھی ہے  
درد کا احساس بھی ہے  
شع بھی دل کے اندھیرے کے لیے  
حرف

جولب سے تراشے نہ گئے  
ذائقہ جن کا زباں نے کبھی چکھا ہی نہیں  
بلبلیں ہیں، جو تمنا کے چمن زاروں میں  
رنگ آئے گا تو مصروف ترنم ہوں گی  
آج وہ حرف ہیں بس حرف ہی حرف  
نا تراشیدہ و نا فرمودہ

روح کے تار پہ مضرب کا رقص  
شوق کا نغمہ بے صوت و صدا

4 دسمبر 1976



## چھوٹا سادل

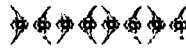
میں بازارِ مہر و وفا میں  
چھوٹا سادل بیچ رہا ہوں  
اس کی قیمت تیرہ روپے  
لعل و گہر میں ناممکن ہے  
تاج شاہی، تختِ رعوت  
سب سے ہیں، دل مہنگا ہے

کیا کوئی ایسا ہے جو ہونٹوں کی افسردہ شاموں کو  
صبح تبسم عطا کرے  
پیاس کے پیلے برگِ خزاں کو  
فصلِ گل کی مے میں ذبودے  
کیا کوئی ایسا ہے جو بھیلی آنکھوں سے  
آنسو کے قطرے چُخن لے  
اور موتی کر کے واپس دے دے  
جو خالی بے بس ہاتھوں کو  
کام کی دولت عطا کرے  
ماپوسی کو کوئے تمنا میں لے جائے

شاید فردا کے جلوؤں سے دل کی جوت جگائے  
 جو دھرتی کی بھوک مٹائے  
 اس کا آئینہ گیہوں کے خوشوں سے بھر دے  
 انسان کی تفریق مٹا کر  
 انسان کی تخلیق کرے

کیا کوئی ایسا ہے جس کی پلکوں پر  
 میرے خوابوں کا یہ عکس ملے  
 میں اس کے قدموں میں اپنا قیمتی دل  
 چھوٹا سا دل  
 پھول کی صورت رکھ دوں گا

جنوری 1977



## تین شعر

مژدہ شوق ابھی باو صبا لائی ہے  
 ارض مشرق میں نئے جشن کی تیاری ہے  
 لالہ و گل سے فروزاں ہے گزرگاہ و خیال  
 ہر طرف خونِ تمنا کی جو گلکاری ہے  
 قریہ و شہر میں جھکائیں ہیں زنجیروں کی  
 اور ویرانوں میں تخلیق جنوں طاری ہے

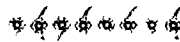
1976



## غزل

بوئے گل لانی ہے گلشن کی ہوا سے خوش ہیں  
 ہم اے ان قفس باد صبا سے خوش ہیں  
 گل کو دیکھیں گے ترے حسنِ جفا کا انداز  
 آج لے دن تو ترے عہد وفا سے خوش ہیں  
 حکم تھا ان کی نگاہوں کا تقاضا دل کا  
 ہم خطا کر کے بہت اپنی خطا سے خوش ہیں  
 کاش صدیوں کی ممانعت کو بہا لے جائے  
 مصرِ نو ہم ترے سیلابِ بلا سے خوش ہیں  
 اپنی بے باک نگاہوں میں سایا نہ کوئی  
 اور وہ ہیں کہ ہر اک تازہ خدا سے خوش ہیں  
 ہم کو آتا نہیں خوش رنگِ بغاوت کا جلال  
 ورنہ سردار کے اندازِ نوا سے خوش ہیں

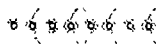
جولائی 1977



## غزل

وہی حسن یار میں ہے، وہی لالہ زار میں ہے  
 وہ جو کیفیت نشے کی سے خوش گوار میں ہے  
 یہ چمن کی آرزو ہے کوئی لوٹ لے چمن کو  
 یہ تمام رنگ و نکبت ترے اختیار میں ہے  
 ترے ہاتھ کی بلندی میں فروغ کبکشاں ہے  
 یہ جو مہماں و انجم ترے انتظار میں ہے  
 بس اسی کو توڑتا ہے یہ جنوں نفع خوری  
 یہی ایک سرو خنجر دل روزگار میں ہے  
 ابھی زندگی حسیں ہے ابھی ذکر موت کیسا  
 ابھی پھول کل رہے ہیں ابھی تو کنار میں ہے  
 ابھی میکدہ جواں ہے ابھی موج میں ہے ساقی  
 ابھی جام رقص میں ہے ابھی سے بہار میں ہے  
 یہی میرا شعرو نغمہ یہی میری فکر و صمت  
 جو سرور و درد مندی دل بے قرار میں ہے

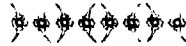
اگست 1977



## اشعار

اس لی یاد میں دل سے آنکھ تپ رہا، فوں آیا  
 تشنگی بجھانے کو جام لالہ فوں آیا  
 دشت جاگ اٹھے ہیں، رقص کرتے ہیں سحر  
 موسم بہاراں ہے، جوش میں فوں آیا  
 حرف شوق سنتے ہی حسن پر بہار آئی  
 لب سے اک کرن پھوٹی آنکھ میں فوں آیا  
 کیا اسی کو کہتے ہیں کارو بار جمہوری  
 تنغ سر بلند آئی، صید رنگوں آیا

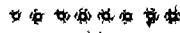
اگست 1977



## تین شعر

مثالی ماہِ رنجِ نو پہن کر ہم نکلتے ہیں  
 مگر روشن ہیں اپنے دل کے سورج کے اجالے سے  
 یہ اپنا جام ہے، جامِ سفالیں ہو کہ چلو ہو  
 کبھی پیتے نہیں مانگے ہوئے زریں پیالے سے  
 نہیں اہل ہوس کی بھوک میں کوئی کمی ملن  
 کبھی بھرتا نہیں ہے پیٹ سونے کے نوالے سے

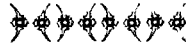
1977



## ہندستان کے بھوکے اساتذہ

وہاں زمین کی سب نعمتیں میسر ہیں  
یہاں پہ نجمِ مقدر کی ایک ضو بھی نہیں  
ہمارے پاس ہے حرفِ سخن کی دانائی  
مگر نصیب میں چھوٹی سی نان جو بھی نہیں

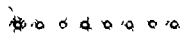
1977



## اشعار

ریگزاروں کو بہاروں کی بشارت دے کر  
نغمہ طائرِ نو بخش دیں خاموشی کو  
زندگی تہنیت لالہ و گل سے ہو جواں  
ایک پیغامِ ترد تازہ ہو مدہوشی کو  
توڑ کر ظلم کے خنجر کو زمیں پر پھینکیں  
کر دیں محرومِ ستم و سب ستم کو  
مقتبِ سیلِ مے ناب میں گم ہو جائے  
اس طرح عام کریں ذوقِ قدحِ نوشی کو  
آرزو سینے مایوس میں پھر پیدا ہو  
رنگِ خورشید ملے شب کی سیاہ پوشی کو

یکم فروری 1978



## نظم

اب بھی ہے اسی جسمِ بربند کی نمائش  
 زخموں سے جسے پیرہنِ درد ملا ہے  
 ہونٹوں پہ وہی خشکیِ افلاس کے دھبے  
 چہروں پہ وہی بھوک کی ٹھہری ہوئی شامیں  
 بیگانہ ہیں جو روشنیِ رنگِ سحر سے  
 آنکھیں ہیں وہ انگارے جو اشکوں نے بجھائے  
 اور ہاتھ جو بیکاری و افلاس سے شل ہیں  
 ہے کوئی جو سوئے ہوئے شعلے کو جگادے  
 ہے کوئی جو ہنگامہ فردا کو صدا دے

مارچ 1978





## اقبال کی آواز

فرعون و موسیٰ و ہنر ہیں تہہ خاک  
اے اہل نظر نشہ قوت ہے خطرناک  
تاریخ کا یہ حرف صداقت ہے ازل سے  
مظلوم بہت جلد ہی ہو جاتے ہیں بیباک  
مجبور ہیں جو ہاتھ وہ مجبور نہیں ہیں  
کر دیتے ہیں چنگیز و ہلاکو کی قبا چاک  
یہ دیکھ کہ کس طرح بدلتا ہے زمانہ  
ہو تو بھی اگر میری طرح صاحب ادراک  
اقبال کا آہنگ ہے آہنگ بغاوت  
جاگ اٹھتے ہیں آفاق دہل جاتے ہیں افلاک

مارچ 1978



## تین شعر

انقلاب کا پرچم جو اٹھا نہیں سکتے  
کاسہ گدائی ہے دست بے ہنر اُن کا  
آرزو سے محرومی جان و دل کا نقصان ہے  
آہ نارسا ان کی نالہ ہے اثر اُن کا  
آسمان پہ اڑنے کا حوصلہ نہیں جن کو  
نامراد رہتا ہے ذوقِ بال و پر ان کا

28 مارچ 1978



## غزل

فروغ دیدہ و دل، لائے سحر کی طرح  
اچالا بن کے رہو شمع رگہور کی طرح

پیہروں کی طرح سے جیو زمانے میں  
پیام شوق بنو دولت ہنر کی طرح

یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے ہم نفو  
ستارہ بن کے جٹے، بجھ گئے شرر کی طرح

ذرا سکی نہ مجھے تیرگی زمانے کی  
اندھیری رات سے گزرا ہوں میں قمر کی طرح

سمندروں کے مخاطم نے مجھ کو پالا ہے  
چمک رہا ہوں اسی واسطے گہر کی طرح

تمام کوہ و قتل و بجز و بر ہیں زیرِ نعلیں  
کھلا ہوا ہوں میں شاہیں کے بال و پر کی طرح

تمام دولتِ کونین ہے خراج اس کا  
یہ دل نہیں کسی لوئے ہوئے نگر کی طرح

گزر کے خار سے، غنچے سے، گل سے، شبنم سے  
میں شاخِ وقت میں آیا ہوں اک شکر کی طرح

میں دل میں تلخی زہرِ ابِ غم بھی رکھتا ہوں  
نہ مثلِ شہد ہوں شیریں نہ میں شکر کی طرح

خزاں کے دستِ ستم نے مجھے چھوا ہے مگر  
تمام شعلہ و شبنم ہوں کاشمیر کی طرح

مری نوا میں ہے لطف و سرورِ صبحِ نشاط  
ہر ایک شعر ہے رندوں کی شامِ ترکی طرح

یہ فاتحانہ غزلِ عمرِ نو کا ہے آہنگ  
بلند و پست کو دیکھا ہے دیدہ ور کی طرح

یکمئی 1978



## تہنیت

(اقبال نے 1930ء کے آس پاس افغانستان کو انقلاب کی دعوت دی تھی۔

رومی بدلے، شامی بدلے، بدلا ہندستان

تو بھی اے فرزند کہستاں، اپنی خودی پہچان

اپنی خودی پہچان

اے غافل افغان

میری یہ تہنیتی نظم اقبال کی زمیں میں ہے)

## نظم

تو جاگا اور جاگ اٹھے ہیں تیرے کو ہستان

تیری خودی کی بیداری سے اونچی ہو گئی شان

اے ہائے افغان

ناچ اٹھا چشموں کے دل میں چاندی جیسا پانی

سخت چٹانیں پہنیں گی محل کی قبائیں دھانی

رقص کرے گا مست ہوا میں چشموں کا طوفان

اے ہائے افغان

گرم ہے سورج، کرنیں شعلہ اور ہوائیں تیز  
 موسم اچھا، پانی وافر، مٹی بھی زرخیز  
 وقت یہی ہے سنبھلیں اپنے کھیتوں کو دہقان  
 اے ہائے افغان  
 مشرق و مغرب حیرت میں ہیں، کیسے کا یا پٹی  
 پتھر کے سوکھے پیالوں سے کیسے سہبا جھلکی  
 دیکھ رہے ہیں پیار سے تجھ کو ہند اور پاکستان  
 اے ہائے افغان  
 تیرے کھیتوں تیرے باغوں پر ہے تیرا راج  
 تیرے سر پر تیری اپنی محنت کا ہے تاج  
 تیرے اس دہقانی پن پر سلطانی قربان  
 اے ہائے افغان  
 تو اقبال کے دل کی دعا ہے، میرے دل کا گیت  
 تیرے دل کی جیت ہے ہمدے پہ ہمدیس کی جیت  
 تیرا نغمہ سرکش و شیریں اونچی تیری تان  
 اے ہائے افغان

14 جون 1978



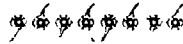
## غزل

گلشن کہو تم یا جن، ہے اہل دل کی انجمن  
 صد بلبل شوریدہ سر، صد الہِ خونی کفن  
 اس باغ میں آئی ہے اک محبوبہ گل پیر بن  
 شیریں نوا، شیریں ادا، شیریں خن، شیریں دہن  
 وہ گل بھی ہے، سورج بھی ہے بجلی بھی ہے، بادل بھی ہے  
 دیکھا نہ تھا پہلے کبھی، ایسا حسین بانکا جن  
 پیکر کو اس نے، شعر کے پیکر میں، کیونکر ڈھالیے  
 خاموش ہیں حیران ہیں، سب شہر یارانِ خن  
 پیشانی سیمیں ہے، یا صبح تخیل کی چمک  
 شائستگی فکر و فن، اس نے تبسم کی کرن  
 خور و پری شرمندہ ہے، وہ اس قدر تابندہ ہے  
 دیکھے سے نکھرے رنگ رخ، چھوٹے سے میلا ہو بدن  
 بس دور سے دیکھا کرو، اس شمع بزمِ تاز کو  
 وہ رونق کاشانہ دل، حیرت صد انجمن  
 آؤ چلیں دیکھیں ذرا وہ جانِ عالم کون ہے  
 سردار کے شعروں میں ہے زلف معبر کی شکن

## قطعہ

نئی کووِ الوند کی ہوا میں  
دماوند سے آرہی ہیں صدائیں  
کہ ہر چیز فانی ہے، ہر چیز فانی  
وہ ہو تاج کسریٰ کہ تخت کیانی

ستمبر 1978



## تین شعر

(کشمیر میں موسم سرما کی ایک شام)

موسم زمیں پھر دولت بہاراں دے  
خٹک کو: ماروں کو: قی آباراں دے  
جنس خزاں کو پھر حتم شعلہ باری ہو  
سرد برف زاراں کو آتش چناراں دے  
تہنیت گل تر کو حسن دے رنگ و تکبت کی  
خارہ خس و فاشن کے مرکب میاراں دے

اکتوبر 1978



(نوٹ: الوند اور دماوند ایران سے پہاڑ ہیں۔)

## کاسہ سر

(تضمین بر اشعار خواجہ حافظ شیرازی)

جہانِ نالہ • فریاد ہو گیا برباد  
کریں گے اہل جنوں تازہ بستیاں آباد  
لرز رہے ہیں دروہام قصر پرویزی  
جواں ہے ضربتِ حکیم سے تیشہ فرہاد  
نہ اس کا خوف ہی باقی ہے نہ طاب اس کی  
حقیر آتشِ نمرود و جہنمِ ہذا  
تڑپ سے مرغِ چمن کی ہلکے حلقہ دام  
نہ زورِ بختِ گلچیں نہ بازوئے صیاد  
بدل رہی ہے فضا نرم ہو گئی ہے ہوا  
دلوں کے باغ میں چلنے لگی ہے بادِ مراد  
ز انقلابِ زمانہ عجب مدار کہ چرخ  
ازیں فسانہ ہزاراں ہزار • ارمیاد  
قدحِ بشرطِ ادب گیرزاں کہ ترلہش  
ز کاسہ سر بہشید و بہمن مست • قباد

تمبہ 1978



## لمحہ آفتاب

ہر طرف گولیوں کی بارش ہے  
ہر طرف ہیں جلوس نعروں کے  
خون آلودہ ہے فضا ساری  
اڑ رہے ہیں بغاوتوں کے عقاب  
پیس سڑکوں پہ ہے برہنہ سر  
بھوک آمادہ انتقام پہ ہے  
شب کے حلقوں میں انتشار سا ہے  
صبح کا نور بیقرار سا ہے  
وقت کروٹ بدلنے والا ہے

# غزل

(ایرانی طلبہ کے نام)

خونِ ناحق سے ہوا رنگیں گلستانِ عجم  
مشعلوں کی طرح روشن ہیں جوانانِ عجم

دل کی ٹھنڈک، روح کی گرمی، نگاہوں کا سرور  
شعلہ و شبنم کے پیکر ہیں حسینانِ عجم

آندھیوں کا زمزمہ، بیتاب طوفانوں کا گیت  
ہیں قیامت کے معنیِ نغمہ سنجانِ عجم

نوجوان سینوں پہ زخموں کے سنہری آفتاب  
آخرش ظاہر ہوئے افکارِ پنہانِ عجم

حدی و فردوسی و حافظ کی آتی ہے صدا  
خود عجم کے درد میں پنہاں ہے درمانِ عجم

جبر کر سکتا ہے کب تک عزم و ہمت کو اسیر  
کھٹکسا کر ہنس پڑی دیوارِ زندانِ عجم

خرمِ ظلم و ستم کا آخری لمحہ ہے یہ  
 بن چکی ہے برقِ زنجیر غلامانِ عجم  
 صلابِ سرمایہ ہوں گے اب تہیِ دستانِ شرق  
 بر قسمتِ دل ہے اک لعلِ بدخشانِ عجم  
 سر و جنِ سینوں میں ہے احساسِ انسانی کی آگ  
 باں اُدھر بھی ایک شعلہ، شعلہِ دستانِ عجم  
 مٹ رہا ہے فرقِ سلطان و گدا، میر و فقیر  
 نامنہ اعمال ہے اور محشرِ ستانِ عجم  
 اے گلِ خونیں جگر چاکِ گریبانم تھر  
 پڑیں چراغِ الہ سوزم در خیابانِ عجم

5 نومبر 1978



## افریقی لڑکی

اسے خبر نہیں خود  
 کس قدر حسین ہے وہ  
 اسے خبر نہیں کتنا حسین جسم ہے وہ  
 وہ آبنوس کا جسم  
 اسے خبر نہیں وہ کس طرح چمکتا ہے

اگر وہ رقص کرے ہاریل کے سایوں میں  
 بدبند رقص کرے سبز رنگ مایوں میں  
 اور اپنے عکس کو دریا میں صوفیوں دیکھے  
 تو اس کے ننھے سے دل کو یقین آ جائے

مگر یہاں تو نہ کپڑوں کی درخت نہیں  
 کہ اس زمین پہ پتھر کے پیر اگتے ہیں  
 رکابیوں میں لرزتے غلیظ پانی میں  
 نہ آئینہ ہے، نہ عکس جیسے، نہ عکس بدن  
 نہ رخ کا نور، نہ سینے کا نوجوان چمن  
 بس اس میں دُوب کے بجھ جاتی ہے ہر ایک کرن

27 اکتوبر 1978

## حبشی میرا بھائی

ہاتھی دانت کے اس جنگل میں  
 اس کا کالا جسم  
 کالا بادل جو منڈلائے  
 کالی بجلی جو لبرائے  
 کالے اعضا کا دریا  
 جو سسے سکڑے اور مل کھائے  
 آگ برقی جو پ میں چمکے  
 اور نیزہ بن جائے  
 طبل و دھول کی تال پتا پتے  
 دشمن سے ٹکرائے  
 حبشی میرا بھائی  
 جنگل جنگل پھول پنے  
 بھائی کے پاؤں ال ال گار ب

27 اکتوبر 1978

(ماخوذ)

بھائی میرا حبشی

## یارانِ میکدہ

1954-55 کی نظمیں جو کسی کتاب میں شامل نہ ہو سکیں



## لوئی آراگوں

(فرانس کا عظیم شاعر اور ناول نگار جس نے زشتہ جنگ عظیم میں جرمن حملہ آوروں کے خلاف فرانسیسی ادیبوں کو منظم کیا۔)

اک تبسم شعلہ ہائے گل کو شرماتا ہوا  
ایک شعلہ مسکراتا ، ناچتا گاتا ہوا

ایک نغمہ تیغ کی جھنکار میں ڈوبا ہوا  
ایک نعرہ لوریوں کے راگ برساتا ہوا

ایک طوفان بجلیوں کے بادباں کھلے ہوئے  
ایک ساحل اپنے طوفانوں سے ٹکراتا ہوا

نوعروں رنگ و کھبت دل میں مانند گلاب  
ارضِ پیر کی طرح لیکن سراپا انقلاب

(پیرس)

}}}}{



## پابلونرودا

(چلی، جنوبی امریکہ کا عظیم اور نہایت حسین شعروں کا شاعر جو ہسپانوی زبان کا سب سے بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے اور وہ یرسوں جلا وطن رہا اور موت اس کا پیچھا کرتی رہی۔ امریکہ کی نئی نسل کو اس نے بہت متاثر کیا۔ 1950 میں ہندستان آیا تھا۔ 1951 میں اس کو لینن انعام ملا۔ 1971 میں نوبل انعام۔ 1973 میں انتقال ہوا۔)

ارض مشرق کا کنول وادی مغرب کا گلاب  
سوز میں ڈوبا ہوا تارِ رگِ جاں کا رباب

دشت و کہسار کا شہزادہ گلستاں کا امیر  
محفلِ انجم و مہتاب میں انساں کا سفیر

شبِ تاریک کے سینے سے ابھرنے والا  
چاند کی طرح سے تابندہ گزرنے والا

اس کو معلوم ہے دریا کی روانی کیا ہے  
عشق کیا چیز ہے مے کیا ہے جوانی کیا ہے

آسماں پر کبھی بادل ہے کبھی تارا ہے  
سطح کیتی پہ نئی صبح کا نظارا ہے

ایک شمشیر بھی، اک جام بھی، اک ساز بھی ہے  
اور پرستانوں میں کھوئی ہوئی آواز بھی ہے

بار غم سب کا اٹھاتا ہے سفینے کی طرح  
دل انساں میں دمکتا ہے جھنجھنے کی طرح

دوست روئی کا، چمکتے ہوئے پانی کا رشتہ  
اپنی نفرت میں عینیت، اپنی محبت میں شفیق

لرزہ گلچیںوں پہ طاری ہے وہ گلشن ہے یہی  
جلیبوں سے جو بنا ہے وہ نشین ہے یہی

(اسناک ہوم)



## جولیو کیوری

(فرانس کا مشہور عالم ایسی سائنس داں جو اپنی موت کے وقت تک عالمی امن کانفرنس کا صدر تھا، نوٹل انعام یافتہ)

جان کر راز ستاروں کی گزر گاہوں کا  
آرزو خاک پہ مصروف سفر ہوتی ہے

فکرِ چالاک میں سورج کی شعائیں ہیں اسیر  
زندگی کی شب تاریک سحر ہوتی ہے

وہ تھکی کہ جو ذروں میں نہاں تھی اب تک  
صرف تعمیرِ گلستانِ ہنر ہوتی ہے

مے دانش کا نشہ رند کی اوقات پہ ہے  
خیر ہوتی ہے حقیقت میں نہ شر ہوتی ہے

اپنا سر شر کے قدم پر نہ جھکایا تو نے  
علم کو خیر کی تفسیر بنایا تو نے

(پیرس)



## پال رو بسن (1)

(امریکہ کا مشہور عالم جشی موسیقار جس کے نغموں نے دوستوں اور دشمنوں سب سے خزانِ تحسین وصول کیا۔)

یہ پوچھا میں نے اک دن بلبلِ شاہینِ سطوت سے  
تری آواز سے صیاد پر کیوں خوف طاری ہے

محبت تیرا نغمہ، حسن انسانی نوا تیری  
مگر سرمایہ داری کے جگر سے خون جاری ہے

جواب رو بسن میں کیا کہوں نعتی بلاغت تھی  
مرا صیاد ساری نوعِ انساں کا شکاری ہے

محبت ہو، حسین نغمہ ہو، بچوں کا تبسم ہو  
یہ جنگی دیوتاؤں کے لیے اک ضربِ کاری ہے

کلی کھلتی ہے جس دم خون ہو جاتا ہے کانٹوں کا  
خزائن کے دل کو پیغامِ فنا بادِ بہاری ہے

(لندن)

## پال رو بسن (2)

اپنے نغمے پہ کوئی ناز تجھے ہو کہ نہ ہو  
 نغمہ اس بات پہ نازاں ہے کہ ہے فن تیرا  
 دیس ہیں دور بہت دل تو بہت دور نہیں  
 میرے گلشن ہی کے پہلو میں ہے گلشن تیرا  
 تیرے نغمے نے لیا دہلی و شیراز کا دل  
 ماسکو تیرا ہے غرناطہ و لندن تیرا  
 اپنی پلکوں سے پچا خون شہیدانِ حبش  
 کتنے گلزاروں سے گزرگ ہے دامن تیرا  
 تیری آواز بلال حبشی کی ہے نوا  
 نور سے دل کے ترے حرف ہے روشن تیرا  
 بوئے گل رہ نہ سکی قہرِ گلستان میں اسیر  
 سرحدیں توڑ کے سب پھیل گیا فن تیرا  
 کرشن کا گیت ہے، موکل کی حبسِ شام ہے تو  
 آ کیلجے سے لگا لیں کہ یہ غام ہے تو

(ماسکو میں رو بسن سے ملاقات اور اس کا نغمہ سننے کے بعد جنوری 1960)



## ایلیا اہرن برگ

(سوویت یونین کا بزرگ ادیب اور صحافی۔ بین الاقوامی امن تحریک کا رہنما)

جنگ کی بے یقین دنیا میں  
امن کا اک یقین محکم ہے  
اک ضعیف و نحیف پیکر میں  
ساری انسانیت مجسم ہے  
ایک محشر جلو میں ہے اس کی  
انجمن ایک اس کی ذات میں ہے  
اور ہر شخص یہ سمجھتا ہے  
میری ہی بات اس کی بات میں ہے

(ہاسکو)



## فیض احمد فیض

سوز ہے دل میں لگا ہوں میں محبت کا گداز  
ایک بجلی ہے کہ جو شعلہ فشاں ساز میں ہے  
کاٹ تلوار کی شعروں کو عطا کرتی ہے  
وہ کک درد کی جو فیض کی آواز میں ہے



## کرشن چندر

کتنا خوش رنگ ہے یہ وادی کشمیر کا پھول  
اپنے سینے میں لیے سارے جہاں کی خوشبو

بال جبریل کی جنبش ہے قلم کی رفتار  
حرف ہے شعر ترا، حرف ترا ہے جادو

تتلیاں لفظوں کی صفحات پہ اڑتی دیکھیں  
دوڑتے دیکھے تخیل کے سنہری آہو

سطریں اس طرح سے کرتی ہیں ترنم ریزی  
عالمِ نغمہ میں جس طرح معنی کا گلو

ظلم و افلاس میں جاگا ہوا انسان کا ضمیر  
تیرہ و تار فضاؤں میں ستاروں کا نمو

کبھی لکار کے سانچے میں دھلی ہے فریاد  
بن کے شعلہ کبھی چکا ہے غریبوں کا لہو

درد کو دل کے لیے شمع بنایا تو نے  
روح انسان کو نیا خواب دکھایا تو نے

(بسمی)



بعد کی چند نظمیں و غزلیں





# کربلا

(ایک رجز)

پھر آتش کی ہے صدا  
جیسے رجز کا زحرہ  
پھر ریک صحرا پر رواں  
یہ اہل دل کا کارواں  
نہر فرات آتش بجائے  
راوی و گنگا خونچکاں  
کوئی یزید وقت ہو  
یا شمر ہو یا خرمہ  
اس کو خبر ہو یا نہ ہو  
روزِ حساب آنے کو ہے  
نزدیک ہے روزِ جزا  
اے کربلا! اے کربلا!

(2)

گوئی نہیں ہے یہ زمیں  
گوئی نہیں ہے آسمان  
گوئی نہیں حرف و بیان  
گوئی اگر ہے مصلحت  
زخموں کو ملتی ہے زباں

وہ خود جو رزقِ خاک تھا  
 تابندہ ہے پابندہ ہے  
 صدیوں کی سفاکی سہی  
 انسان اب بھی زندہ ہے  
 یہ جبل کی پرچھائیاں  
 لیتی ہوئی انگڑائیاں  
 زندہ ہے اعجازِ فغاں  
 ہر ذرۂ پامال میں  
 دل کے دھڑکنے کی صدا  
 اے کر بلا! اے کر بلا!

(3)

عرشِ رعونت کے خدا  
 ارضِ ستم کے دیوتا  
 یہ ٹین اور لوہے کے بت  
 یہ تیم و زر کے کبریا  
 بارود ہے جن کی قبا  
 راکٹ کی لے جن کی صدا  
 طوفانِ غم سے بے خبر  
 یہ کم سواد و کم ہنر  
 نکلے ہیں لے کر اسلحہ  
 لیکن جل اٹھا زیرِ پا  
 ریگِ نواحِ کاظمہ  
 ریگِ نواحِ نینولی  
 اندھی ہے مشرق کی ہوا  
 شعلہ فلسطین کی فضا  
 اے کر بلا! اے کر بلا!

(4)

یہ مدرسے دانش کدے  
 علم و ہنر کے میکدے  
 ان میں کہاں سے آگئے ؟  
 دانش وران بے یقین  
 غیروں کے دفتر کے امیں  
 الفاظ کے خواجہ سرا  
 ان کے تصرف میں نہیں  
 خون بہار زندگی  
 ان کے تصرف میں نہیں  
 برہم ہے ان سے رنگ گل  
 آزرہ ہے بادِ صبا  
 اے کربلا! اے کربلا!

(5)

لیکن یہی دانش کدے  
 ہیں عشق کے آتش کدے  
 ہیں حسن کے تابش کدے  
 پلتے ہیں جن کی گود میں  
 لے کر انوکھا بانگین  
 عصرِ رواں کے کوہکن  
 میرے جوانانِ چمن  
 بلبلِ نوا، شاہیں ادا  
 اے کربلا! اے کربلا!

(6)

اے غم کے فرزندو اٹھو  
 اے آرزو مندو اٹھو  
 دل کی نسیم جانفزا

ہونٹوں کی کلیوں میں جواں  
 یہ کرسکوں کے گھونسلے  
 زلفوں کی کلیوں میں رواں  
 بوئے گل و بوئے فتا  
 آنکھوں میں تاروں کی چمک  
 ہاتھوں میں سورج کی دھب  
 دل میں جمالِ شامِ غم  
 زخ پر جلالِ بے نوا  
 گونجی ہوئی زیرِ قدم  
 تاریخ کی آوازِ پا  
 شمشیر ہیں دستِ دعا  
 اے کربلا! اے کربلا!

(7)

چاسوں کے آگے آئیں گے  
 آئیں گے لائے جائیں گے  
 آسودگانِ جامِ جم  
 سب صاحبانِ بے کرم  
 کھل جائے گا سارا بھرم  
 جگ جائیں گے تیغ و علم  
 پیشِ سفیرانِ قلم  
 رخشندہ ہے روجِ حرم  
 تابندہ ہے روئے صنم  
 سردار کے شعروں میں ہے  
 خونِ شہیداں کی ضیا  
 اے کربلا! اے کربلا!



## آبلہ پیا

(۱)

سائے میں درختوں کے  
 بیٹھے ہوئے انسانو !  
 اے وقت کے مہمانو !  
 کس دیس سے آئے ہو  
 کس دیس کو جانا ہے  
 اے سوختہ سامانو !  
 یہ وسیع میداں ہے  
 یا درد کا صحرا ہے  
 اک دھوپ کا جنگل ہے  
 یا پیاس کا دریا ہے  
 دریا کے پرے کیا ہے  
 پتھر ہے کہ چشمہ ہے  
 نفہ ہے کہ نالہ ہے  
 شبنم ہے کہ شعلہ ہے  
 شاید کوئی ساحر ہے  
 جو ڈوبتے سورج کے  
 دروازے پہ بیٹھا ہے  
 افسون تماشا ہے

(2)

ہے رات کی راہوں میں  
تاروں کا سفر جاری  
اور بادِ بیابانی  
سر دست غزل خواں ہے  
ہر ذرے کے سینے میں  
اک شمع فروزاں ہے  
ہر خار کے نیزے پر  
خوابوں کا گلستاں ہے

(3)

اے عشقِ جنوں پیشہ  
اس سمت میں چلنا ہے  
ڈوبا ہے جہاں سورج  
نکلا ہے جہاں سورج  
واں ریت کے ٹیلے پر  
یا ناقہ لیلیٰ ہے  
یا محملِ سلئی ہے

(4)

صد قافلہ پنہا ہے  
صد قافلہ پیدا ہے  
آوازِ جرس لیکن  
اس دشت میں تنہا ہے

صدیوں سے اسی صورت  
 ہے صم سفر جاری  
 زمانہ تہم جاری  
 اطلال کرم جاری

(5)

پھولوں کے کنوروں میں  
 شبنم کی گلابی ہے  
 اور بادِ سحر گاہی  
 بدست شرابی ہے  
 کل صبح کے دامن میں  
 تم ہو گے نہ ہم ہوں گے  
 بس ریت کے سینے پر  
 چھ نقش قدم ہوں گے  
 سائے میں درختوں کے  
 پھر لوگ بہم ہوں گے  
 کس دیس سے آئے ہو  
 کس دیس کو جانا ہے  
 اے وقت کے مہمانوں  
 اے شمع تمنا پر  
 جلتے ہوئے پروانو  
 اے سوختہ سامان



## غزل

آئے ہم غائب و اقبال کے نعمات کے بعد  
مصہبِ عشق و جنوں حسن کی آیات کے بعد

اے وطن، خاکِ وطن وہ بھی تجھے دے دیں گے  
بچ گیا ہے جو لہو اب کے فسادات کے بعد

نارِ نمرود یہی اور یہی گلزارِ خلیل  
کوئی آتش نہیں آتشِ کدہ ذات کے بعد

رام و گوتم کی زمیں حرمتِ انساں کی امیں  
بانجھ ہو جائے گی کیا خون کی برسات کے بعد

تھکی ہے کہ بجھائے نہیں بجھتی سردار  
بڑھ گئی کوڑ و تسنیم کی سوغات کے بعد



## غزل

عقیدے بجھ رہے ہیں شمع جاں گل ہوتی جاتی ہے  
 مگر ذوق جنوں کی شعلہ سامانی نہیں جاتی  
 خدا معلوم کس کس کے لہو کی لالہ کاری ہے  
 زمین کوئے جاں آج پہچانی نہیں جاتی  
 اگر یوں ہے تو کیوں ہے یوں نہیں تو کیوں نہیں آخر  
 یقین محکم ہے لیکن دل کی حیرانی نہیں جاتی  
 لہو بہتا تھا سارا صرف مقل ہو گیا لیکن  
 شہدائے وفا کے رُخ کی تابانی نہیں جاتی  
 پریشاں روزگار، آشفۃ حالاں کا مقدر ہے  
 کہ اُس زلف پریشاں کی پریشانی نہیں جاتی  
 ہر اک شے اور مہنگی اور مہنگی ہوتی جاتی ہے  
 بس اک خونِ بشر ہے جس کی ارزانی نہیں جاتی  
 نئے خوابوں کے دل میں شعلہ خورشیدِ محشر ہے  
 ضمیرِ حسرتِ انساں کی سلطانی نہیں جاتی  
 لگاتے ہیں لیوں پر مہرِ اربابِ زباں بندی  
 ملی سردار کی شانِ غزل خوانی نہیں جاتی



## غزل

یہ بے کس و بے قرار چہرے      صدیوں کے یہ سوگوار چہرے  
 مٹی میں پڑے دک رہے ہیں      ہیروں کی طرح ہزار چہرے  
 لے جا کے انھیں کہاں سجائیں      یہ بھوک کے شکار چہرے  
 افریقہ و ایشیا کی زینت      یہ نادر روزگار چہرے  
 کھوئی ہوئی عظمتوں کے وارث      کل رات کے یادگار چہرے  
 غازے سے سفیدے سے رنگیں      اس دور کے داغ دار چہرے  
 گزرے ہیں نگاہ و دل سے ہو کر      ہر طرح کے بے شمار چہرے  
 مغرور انا کے گھونسلے میں      بیٹھے ہوئے کم عیار چہرے  
 قابلِ التفات آنکھیں      نا قابلِ اعتبار چہرے  
 ان سب سے حسین تر ہیں لیکن      رعدوں کے گناہ گار چہرے



## سیلِ وقت (رقصِ خزاں)

(شمالی امریکہ کے موسمِ خزاں کے استعارے میں اکتوبر 1994)

خزاں رسیدہ نگارِ بہارِ رقص میں ہے  
عجیب عالمِ بے اختیارِ رقص میں ہے

برس رہے ہیں درختوں سے رنگِ صورتِ برگ  
طلسمِ خانہ لیل و نہارِ رقص میں ہے

گذر رہا ہے زمانہ، بہار ہے نہ خزاں  
بس اک تبسمِ برق و شرارِ رقص میں ہے

نہ جانے کون ہے معشوق کون ہے عاشق  
نہ جانے کس کا دلی بیقرارِ رقص میں ہے

جنوں نے پیرہنِ برگ و بار اتار دیا  
برہنگی ہے کہ دیوانہ وارِ رقص میں ہے

یہ کائنات کا حیرت کدہ طلسمِ وجود  
ازل کے روز سے بے اختیارِ رقص میں ہے



## خواب پریشاں

میرے دشمن کی بیٹی تھی وہ  
 اس کی راہوں میں بارود تھی  
 فرشِ عمل نہ تھا  
 آگ کے پھڑتے  
 اور شاخوں میں انگاروں کے پھول تھے  
 سر پہ میرے وطن کے جہاز  
 اور دشمن کے طیارے معرکہ پیکار تھے  
 آسمان سے قیامت برسنے لگی تھی

اس کو معلوم تھا اس کے دشمن کا بیٹا ہوں میں  
 مجھ کو معلوم تھا میرے دشمن کی بیٹی ہے وہ  
 اس کی آنکھوں میں مصوویت، خوف اور بے بسی تھی  
 میری آنکھوں میں بھی شاید ایسا ہی ایک خوف تھا  
 اور اس خوف کے گہرے عاروں میں  
 ہر چیز گم ہو چکی تھی  
 رہنماؤں کی تقریریں  
 اہل سیاست کے دیوانے پن کے بیانات

اخباروں کے اقتباسات  
 ہتھیاروں کے تاجروں کے جنوں فیضان  
 راکٹوں کی صدا اور طیاروں کی گھن گرج  
 کچھ نہ تھا  
 صرف اک دل دھڑکنے کی آواز تھی  
 دو دلوں کی وہ آواز جو ایک دل بن گئے تھے  
 ہاتھ سے ہاتھ مس ہونے کی  
 جسم سے جسم چھونے کی آواز  
 اور ہم دونوں  
 بیتاب سانسوں کے بے ربط سے سانسوں کے تے  
 خوف کے غار میں  
 سب بلاؤں سے محفوظ تھے  
 اس کا سارا بدن پیاری پیار تھا  
 میرا سارا بدن حسن ہی حسن تھا  
 اک ندی تھی جو خاموشی سے بہہ رہی تھی  
 کوٹلیں ہنس رہی تھیں  
 پھول خاموشی سے کھل رہے تھے  
 اور دشمن کے سرحد کی ٹھنڈی ہوائیں  
 اور میرے وطن کی مہکتی ہوائیں  
 گلے مل رہی تھیں  
 ان کو پروا نہ رہا داری کی کوئی ضرورت نہ تھی

## قصِ ابلیس

اور اتنے میں ذرات پھنسنے لگے  
 اور ہر ذرہ کے دل سے خورشید کا خون اُبلنے لگا  
 نور نے تاریکی شکل میں  
 سارے جہات، سارے شیاطین کے پاؤں کی  
 بیڑیاں کاٹ دیں  
 اور فضاؤں میں زہریلے سورج برسنے لگے  
 پھر خلاؤں میں سورج برستے رہے  
 ایک سورج میں لاکھوں جہنم  
 ہر طرف قصِ ابلیس تھا  
 قصِ ابلیس کا دیکھنے والا کوئی نہ تھا  
 ہر طرف اس کی آواز تھی  
 جیسے اک آتشیں قہقہہ  
 کوئی بھی سننے والا نہ تھا  
 بس خدا.... اک خدا  
 وحدہ، لا شریک

## قصِ ابلیس کے بعد

عمار تیں اُڑ گئیں فضا میں  
 پہاڑ ہنکی ہوئی روئی کے دہکتے گالے  
 جو اپنے شعلوں سے آسمانوں کو چاٹتے ہیں  
 خلاؤں کی آتشیں ہوائیں<sup>1</sup>  
 جو قلبِ خورشید میں پٹی ہیں  
 غرور سے قص کر رہی ہیں

زمین ویرانہ ہو چکی ہے  
 تو تلے حرف ہیں نہ ماؤں کی انگلیاں ہیں  
 نہ ننھے منے حسین کپڑے  
 نہ پلٹے ہیں نہ کوئلیں ہیں  
 زمیں اک آگ کا ہے کمرہ  
 درخت ہیں آگ کے  
 ہوا آگ کی  
 اور آگ کے سمندر



نہ کوئی سرمایہ دار باقی  
 نہ کوئی مزدور رہ گیا ہے  
 نہ اب کوئی انقلاب ہوگا  
 نہ کوئی تعبیر اور نہ کوئی  
 حسین، دیوانہ خواب ہوگا  
 نہ شام ہوگی نہ جام ہوگا  
 نہ دل کے صحنِ حسین میں کوئی  
 حسین مجو خرام ہوگا  
 ہر ایک شے آگ بن چکی ہے  
 چیخوں میں بدل چکی ہے  
 جو اگلے بیچے تھے  
 وہ سب ہیں نذرِ آتش  
 جنہیں تھی ہتھیاروں سے محبت  
 وہ نذرِ آتش  
 جنہیں تھی ہتھیاروں سے عداوت  
 وہ نذرِ آتش  
 جو قتل کرتے تھے نذرِ آتش  
 جو قتل ہوتے تھے نذرِ آتش  
 ہزار ہا سال بعد اگر پھر زمیں بنے گی  
 نہ جانے کیا نظام ہوگا  
 خبر نہیں کیا وہاں بشر کا بھی نام ہوگا  
 سنواک آواز، آسمانوں سے آ رہی ہے  
 نظامِ شمسِ اداس ہے  
 اس کا ایک ستارہ کھو گیا ہے

جو وسعت کائنات کا شوخ و شنگ نیلم تھا<sup>1</sup>  
 اٹک بن کر چمک گیا ہے  
 یہ خطہ زمہ پر جس پر  
 کروڑوں صدیاں گزر چکی ہیں  
 کروڑوں نوری برس جہاں اپنا سارا مفہوم کھو چکے ہیں<sup>2</sup>

بسا طور قاصد فلک تھا  
 زمیں کی نیلم پری کا مسکن  
 اور اس کے اطراف کہکشاؤں کے سلسلے تھے  
 تمام ستاروں سے مقدس  
 ہیبروں کی زمیں  
 آیات آسمانی کی جو امیں تھی  
 وہ نفع خوروں کی شیطنت سے  
 ٹھکست کھا کر خلا میں روپوش ہو گئی ہے

یہ خواب خواب پریشاں تھا اور کچھ بھی نہ تھا  
 بشر نے روک دیا دس ظلم و ظلمت کا  
 زمین اب بھی درخشاں ہے اب بھی رقصاں ہے  
 پھر آرزو کے چراغوں سے دل فروزاں ہے  
 وہ خوف و درد کے غاروں سے آفتاب اُگے  
 وہ حسن و عشق کے رنگین ماہتاب اُگے  
 وہ بوسہ بوسہ چمن در چمن گلاب اُگے



- 1 آسمانی پردازوں کا بیان ہے کہ خلا سے زمین ایک نیلے رنگ کے ستارے کی طرح دکھائی دیتی ہے۔  
 2 آسمانوں میں وقت کا حساب سورج کے گرد زمین کی گردش سے نہیں ہوتا بلکہ روشنی کے سفر کی رفتار سے ہوتا ہے۔ یہ رفتار کائنات میں سب سے زیادہ تیز ہے۔ نوری برس یا نوری سال کو انگریزی میں Light year کہتے ہیں۔

## دعائے مغفرت

برائے رباب جعفری  
ہمشیرہ علی سردار جعفری

رباب درد ہے خاموش دلی کے تاروں میں  
نہ کوئی نعمتِ جانکاہ ہے نہ شعلہ آہ  
بس ایک اشک کا قطرہ ہے بھیگی پلکوں پر  
تمہارا کربِ مسلسل کے خاتمے کا گواہ  
سکون کہتا ہے چہرے کا باغِ جنت سے  
جنابِ فاطمہ زہرا کی پڑ رہی ہے نگاہ  
تمہارا زادِ سفر عشقِ اہل بیتِ رسول  
تمہاری دولتِ ایمان تمہارا توشہِ راہ  
جوارِ رحمتِ حق میں ملے جگہ تم کو  
بحقِ ائبد ان لا الہ الا اللہ

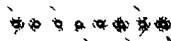
ولادت 30 جولائی 1918ء، ملتان

وفات 29 جولائی 1997ء، ممبئی



## ایک شعر

ہر شخص اپنے بارِ نشاط و الم کے ساتھ  
اک کاروانِ شوق ہے جو رگنر میں ہے



## نومبر، میرا گہوارہ (آپ بیتی اور جگ بیتی)

### قصہ تخلیق

جب کہیں پھول بنے  
جب کوئی طفل سر راہ ملے  
رات کی شاخ سیرنگ پہ جب رات کھلے  
دل یہ کہتا ہے حسین ہے دنیا  
چیتھڑوں میں ہی سہی ماہ جہیں ہے دنیا  
دست صیاد بھی ہے بازوئے حملاء بھی ہے  
قصہ تخلیق جہان گزراں جاری ہے

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ  
نومبر، میرا گہوارہ ہے، یہ میرا مہینہ ہے  
اسی ماہِ سحر میں

مری آنکھوں نے پہلی بار سورج کی سنہری روشنی دیکھی  
مرے کانوں میں پہلی بار انسانی صدا آئی  
مرے تارِ نفس میں حبشِ بادِ صبا آئی  
مشامِ روح میں  
مٹی کی خوشبو پھول بن کر مسکرا اٹھی

لبو نے گیت گایا  
شمع ہستی جگمگا اٹھی  
یہ لمحہ، میلادِ آدم تھا۔  
میں ستر سال پہلے اس تماشا گاہِ عالم میں

اک آفاقی کھلوتا تھا

ہوا کے ہاتھ سہلاتے تھے میرے نرم بالوں کو  
 مری آنکھوں میں راتیں نیند کا جلا لگاتی تھیں  
 سحر کی پہلی کرنیں چوتھی تھیں میری پلکوں کو  
 مجھے چاند اور تارے مسکرا کر دیکھتے تھے  
 موسموں کی گردشیں جھولا جھلاتی تھیں  
 بھری برسات میں بارش کے چھینے  
 گرمیوں میں لڑکے جھوٹے  
 مجھ سے ملنے کے لیے آتے  
 وہ کہتے تھے ہمارے ساتھ آؤ  
 چل کے کھیلیں باغ و صحرا  
 مری ماں اپنے آنچل میں چھپا لیتی تھی ننھے سے کھلونے کو  
 مری حیرت کی آنکھیں  
 اس محبت سے بھرے چہرے کو نکلتی تھیں  
 جس آئینے میں پہلی بار میں نے  
 اپنا چہرہ آپ دیکھا تھا

وہ چہرہ کیا تھا

سورج تھا، خدا تھا یا تیسر تھا  
 وہ چہرہ جس سے بڑھ کر خوبصورت  
 کوئی چہرہ ہو نہیں سکتا  
 کہ وہ اک ماں کا چہرہ تھا  
 جو اپنے دل کے خوابوں، پیار کی کرنوں سے روشن تھا

وہ پاکیزہ مقدس سینہ زریں

وہ اس میں دودھ کی نہریں

وہ دوج کوڑ و تسنیم تھیں  
 یا شہد و شبنم تھیں  
 انھیں کی چند بوندیں آج اعجازِ سخن بن کر  
 انھیں کی چند بوندیں سرِ حرف و جاوے لفظ و میاں بن کر  
 مرے ہونٹوں سے خوشبوئے زباں بن کر  
 سرِ لوح و قلم آتی ہیں تو شمشیر کی صورت چمکتی ہیں  
 حسینوں کے لیے وہ غازہ و رخسار و عارض ہیں  
 کھلتی چوڑیاں، بجتی ہوئی پائل کو اک آہنگ دیتی ہیں  
 زمیں کی گردشوں، تاریخ کی آواز پائیں و حلقی جاتی ہیں  
 جواب میری زباں ہے  
 مرے بچپن میں وہ میری ماں کی لوری تھی  
 یہ لوری اک امانت ہے  
 مرا ہر شعر اب اس کی حفاظت کی ضمانت ہے

اقراء علم بالقلم

مرا پہا سیتی اقراء  
 ہے تحسین قلم جس میں  
 ہے بحریم قلم جس میں  
 قلمِ تحریکِ ربانی  
 قلمِ تخلیقِ انسانی  
 قلمِ تہذیبِ روحانی  
 قلم ہی شایعِ طوبیٰ بھی ہے انکسوفِ حنائی بھی  
 مرے ہاتھوں میں آکر رقصِ مکر تی ہے  
 ہزاروں دائروں میں چاند اور سورج کی عمرائیں  
 درخشاں علم اور وحدت کی قدیلیں

حائل نو کا سینہ ماو کا کل کا خزانہ ہے

مری انگلی نے پہلے خاک کے سینے پہ حرف اولیں لکھا  
پھر اس کے بعد تختی پر قلم کا نقش ثانی تھا  
قلم انکشتِ انسانی کا جلوہ ہے  
عروجِ آدمِ خاکی کا دلکش استعارہ ہے

### فطرت کی فیتا خیاں

مجھے سورج نے پالا  
چاند کی کرنوں نے نہلایا  
ہر اک شے مجھ سے تھی مانوس  
مجھ سے بات کرتی تھی  
درختوں کی زباں  
چڑیوں کے نغے میں سمجھتا تھا  
ہوا میں تتلیاں پرواز کرتی تھیں  
میں ان کے ساتھ اڑتا تھا  
مری مٹھی میں جگنو جگمگاتے تھے  
میں پر یوں کے پرستانوں میں جاتا تھا  
اندھیرا کانپتا تھا بجلیوں کے تازیانوں سے  
میں اس پر مسکراتا تھا  
گر جے بادلوں سے دو تھی تھی  
خاک پر چلتے ہوئے کیڑوں پہ بھج پیا آتا تھا  
ہر اک شے جیسے میری ذات تھی، میری حقیقت تھی  
ان الحق ہی صداقت تھی  
برے نیلے سنہری سرخ انڈے

آشیانوں میں پرندوں کے  
وہ میرے سب کھلونے تھے  
میں آفاقی کھلوتا تھا  
میں خود فطرت تھا فطرت میری ہستی تھی  
اسی فطرت نے میرے خوں میں لاکھوں بجلیاں بھر دیں  
میں بھیگیں رگ و پے میں جنوں کا بانگین آیا  
مرے آگے نئے رنگوں میں دنیا کا چمن آیا  
براک شمشاد پیکر لے کے فردوسِ بدن آیا

جدھر دیکھو ادھر برنائیاں ہیں  
جدھر دیکھو ادھر رعنائیاں ہیں  
شفق کے رنگ میں بھگی ہوئی پر چھائیاں ہیں

مرے لغزیدہ لغزیدہ قلم نے  
اک رنگیں اور خوشبودار کاغذ پر  
بڑی مشکل سے رکتے رکتے حرفِ عشق لکھا  
اور کسی کی بارگاہِ حسن میں بھیجا  
حیا کی شمع جل اٹھی حریمِ دلربائی میں  
گمما یا سر جھکا کر دیر تک کنگن کھائی میں

ذکر اس پری و ش کا اور بھر بیاں اپنا

کہاں سے آئی ہو  
کون ہو تم  
نہ کل نہ خوشبو  
مگر تمہارا وجود خود روحِ گلستاں ہے  
وہ کائناتِ سرور جس کا



خود اپنا سورج ہے چاند اپنا  
میں کائنات سرور میں سانس لے رہا ہوں  
لکھنؤ ہے یہاں نہ بیلن

نہ ہیر ہے اور نہ جولیت ہے  
فقط تمہارے بدن کا موسم  
جو میری نظروں کی نرم بارش میں  
رنگ اور نور بن گیا ہے

کوئی نہیں تم سے بڑھ کے دنیائے دلبری میں  
کوئی نہیں تم سے بڑھ کے دنیائے عاشقی میں  
ہر ایک سے تم حسین تر ہو  
ہر ایک سے میں عظیم تر ہوں

تمہارے ہونٹوں کے خم میں جو لفظ بن رہے ہیں  
وہ میرے سینے میں پھول کی طرح کھل رہے ہیں  
تمہاری ہاں اک گلاب ہے تازہ و کھلتا  
کہ جس سے ایوان جاں معطر  
نہیں، بھی نمی سی اک کلی ہے  
جو دل کی نازک سی شاخ میں سورجی ہے

خواب بہار بن کر  
یہ خواب تعبیر کے گستاخ کا خنجر ہے  
تمہارے دلکش بدن کے دھنوں میں مضطرب ہے  
تمہاری آنکھوں سے مہمکتا ہے  
تمہاری سانسوں میں کاہتا ہے  
مجھے نہیں کی کلی مٹا ہو  
کہ جس سے ہاں کا گلاب ہے

تھارے شہر بہمال میں  
 مرے دل کا کار۔  
 بھٹک رہا ہے  
 تم اپنے ہونٹوں کا شہد  
 آنکھوں لے پھول  
 ہاتھوں کا چاند ہے وہ  
 یہ غلی کی سیاہ رانیں وہ چہ نظر کر رہی ہیں

زمین کا رنگ تم میں کا بہمال تم ہو  
 زمیں کی دولت  
 زمیں کی بنی  
 تم اپسراؤں سے اور دوروں سے پاک تر ہو  
 کہ وہ تصور سے آنکھوں کی چٹلیاں ہیں  
 تمام حس نماں کا پیکر  
 مگر تم اس خاک کی چلب ہو  
 کہ جس کی نس نس میں  
 سیب آگور اور کیہوں کی فصل کا خوں رواں دواں ہے  
 سحر کا سورج تمہارے ماتھے کو چومتا ہے  
 بدن میں شبنم کی روشنی ہے

ہو انیس جو میری راز داں ہیں  
 وہ میرے ہونٹوں سے لفظ لے کر  
 تمہارے کانوں کی سیپیوں میں  
 گھر کے مانند ذاتی ہیں  
 میں مسکراتا ہوں  
 تم بھی ہنستی یہ

اور دونوں

نئی تہاؤں کے جزیروں میں گھومتے ہیں  
 نہ کوئی محکوم ہے نہ حاکم  
 نہ کوئی قانون ہے نہ سختی  
 بس ایک زنجیر لطف، شمشیرِ دلربائی

### ورقی ناخواندہ

میں اک ورق ہوں  
 لکھا ہے کس نے  
 پڑھا ہے کس نے  
 ہر اک درخت اک قلم ہے ہر شاخ اک قلم ہے  
 -سندروں کی دوا بت  
 ندیوں میں پھیلی چاندی کی روشنائی  
 فضا کے سیال نیلگوں سے  
 ہواؤں کے ہاتھ لکھ رہے ہیں  
 ستاروں کا نور لکھ رہا ہے  
 زمین کا رقص لکھ رہا ہے  
 زمین کی پشت سے نکلتا گلابی سورج  
 سنہری کرنوں سے لکھ رہا ہے  
 گذرتے لمحات اپنی تیروں سے لکھ رہے ہیں  
 گذرتی تاریخ اپنے نیروں سے لکھ رہی ہے  
 تمام احباب لکھ رہے ہیں  
 تمام اغیار لکھ رہے ہیں  
 حریفوں کے خجروں پہ بخوں ہے  
 سیاست مکر و فن کی تلواریں لکھ رہی ہے

مہکتے زخموں کے پھول الفاظ بن گئے ہیں  
 تبسم لفظ یا رکازِ حرف ہے غنچہ شگفتہ  
 حدت کے خاروں کی نوک میں جتیشِ قلم ہے  
 زبان و شام لکھ رہی ہے  
 زبان بدنام لکھ رہی ہے  
 زبان ناکام لکھ رہی ہے  
 مگر مرادل، مرا جنوں بھی تو لکھ رہا ہے  
 میں اک ورق ہوں  
 تمام احساسِ ناتمامی  
 مگر کھل کتاب جیسے  
 جو پڑھ سکو تو مجھے بتانا کہ اس صحیفے میں کیا لکھا ہے

### صحیفہ کائنات

یہ دو دورتی ہیں  
 زمین اور آسمان جن پر  
 صحیفہ کائنات تحریر ہو رہا ہے  
 فسانہ ہستی کا نیستی کا  
 فسانہ نیکی کا اور بدی کا  
 فسانہ ظلمت کا روشنی کا  
 صحیفہ کائنات تحریر ہو رہا ہے  
 جو کل کلی تھی  
 وہ آج گل ہے  
 جو آج گل ہے  
 وہ کل شمر ہے

ہر ایک شے وقت کی ہواؤں کی زد پہ  
 اک شمع رہنڈ رہے  
 جو بجھ رہی ہے  
 جو جل رہی ہے  
 وجود پر ناز کر رہی ہے

ہواؤں کے تند و تیز جھونکے  
 جب آندھیوں کا لباس پہنے  
 اترتے ہیں عارتِ چمن پر  
 تو شاخِ گل اپنا سر جھکا کر سلام کرتی ہے  
 اور پھر سر اٹھا کے ہنستی ہے  
 اور کہتی ہے مجھ کو دیکھو  
 میں فطرتِ لازوال کا رنگِ شاعری ہوں  
 وجود کا رقصِ دلیری ہوں  
 جسے مٹانے کی کوششیں ہیں  
 وہ مٹ سکا ہے نہ مٹ سکے گا  
 یہ رنگِ صحنِ چمن سے ابلے گا  
 مقتلوں سے طلوع ہوگا

## حرفِ بد

مرے خلاف اٹھایا قلمِ حریفوں نے  
 مرا غرور بڑھا اور سر بلند ہوا  
 یہی سلیقہ ہے بس حرفِ بد سے بچنے کا  
 کہ اپنی ذات کو اتنی بلندیاں دے دو  
 کسی کا رنگِ ملامت وہاں تک آنے سکے

سداے کوئے ملامت تابش کرتی رہے  
مگر نوائے بہار آشنا کو پا نہ سکے  
چراغِ علم و ہنر کو کوئی بجھانہ سکے

جیو تو اپنے دل و جاں کے میکدے میں جیو  
خود اپنے خونِ جگر کی شرابِ تاب پیو  
جہاں کے سامنے جب آؤ تازہ رو آؤ  
حضورِ محسوب و شیخ میں سیواؤ  
دلِ شائستہ میں بڑھنے دو روشنیِ غم کی  
یہ روشنی ہے تو میراثِ ابنِ آدم کی  
یہ روشنی کہ جو تلواریں بھی سیر بھی ہے  
مری نگاہ میں پیانا ہنر بھی ہے

حسد

حسد کی آنکھوں میں رنگ دیکھو  
جو دل کے اندر بھرے ہوئے ہیں  
وہ زہرِ آلودہ سنگ دیکھو  
جو باتھ میں ہیں وہ پھول دیکھو  
جو روح میں ہیں بول دیکھو  
لبوں پہ جو ہے وہ حرف دیکھو  
حقیر کتنا ہے ظرف دیکھو  
کہ دوست ہے

اور دوست کے منہ پہ بات کہنے سے ڈر رہا ہے  
وجودِ ظاہر میں ہے مکمل  
مگر وہ اندر بکھر رہا ہے

وہ اپنی غرت کا زہر لے کر  
 خود اپنے خوں میں اتر رہا ہے  
 وہ تنگ دل بھی ہے تنگ جاں بھی  
 تینک ضمیر اور تینک زباں بھی  
 خبر نہیں اس کو وہ کہاں ہے  
 کہ ہر طرف اک شخص ایسا نظر کے اندر بسا ہوا ہے  
 کہ جس کے سایے سے کانپتا ہے  
 جب اپنا قد اس سے ٹپتا ہے  
 تو اپنے خنجر کو توڑتا ہے  
 حسد کا مارا ہوا یہ بندہ غریب شہر دیا رخو ہے  
 شرافتِ نفس مرچکی ہے بے چارہ خویش آشنا نہیں ہے

مگر اسی دوست کی بدولت  
 میں خود کو پہچاننے لگا ہوں  
 میں اس کا احسان مانتا ہوں  
 خدا کرے اس کا دل کہیں سے  
 سکوں کی دولت تلاش کر لے

### قاتل کی شکست

اس کہیں گاہ میں ہیں کتنے کماں دار بتاؤ  
 تیر کتنے ہیں سیرِ ترش میں  
 گن کے دیکھو تو ذرا  
 کون سا تیر ہے مخصوص مرے دل کے لیے

ابن مریم کو کیا تم نے سر دار بلند  
 اور وہ زندہ ہے





## دل اور شکستِ دل

وفا پیکر تھی وہ لیکن وفا نا آشنا نکلی  
وہ نغمہ تھی شکستِ شیعہ دل کی صدا نکلی

چراغِ لالہ صحرا کی صورت دل میں روشن تھی  
مگر پل بھر میں صحرائوں کی بے پروا بو نکلی

بہت بے باک آنا تھا، بہت دُزدانہ جانا تھا  
یہ میرے دل کی دھڑکن بھی وہی آوازِ پا نکلی

وفا کیسی، کہاں کی بے وفائی، عشق کی منزل  
تھی مقتلِ گاہِ جس میں حسن کی تیغِ ادا نکلی

یہ سارا کھیل تھا جو وقت کے شاطر نے کھیلا تھا  
نہ سمجھ اس کی خطا نکلی نہ کچھ اپنی خطا نکلی

کوئی منزل نہیں آوارہ کوئے تمنا کی  
نئی خوشبوئے پیراہن لیے بادِ صبا نکلی

نگارِ آتشیں رخ اور کوئی آنے والا ہے  
دل ویراں کی تاریکی میں ہلکا سا اجالا ہے

کوئی تو زخمِ دل پر مرہمِ مہر و وفا رکھے  
کوئی تو درد کے رخسار پر دستِ شفا رکھے

پھر وہی مہر و مروت پھر وہی شوقِ فضول  
پھر وہی صحرائے درد اور درد کے صحرا کا پھول

نہ کوئی اس کی طرح ہے نہ وہ کسی کی طرح  
کرشمہ حسن کا حافظ کی شاعری کی طرح

تمام شہید وصال و تمام زہرِ فراق  
وہ نو بہارِ تمنا ہے زندگی کی طرح

یہ میرا عشق کہ اس کے بدن کا شعلہ ہے  
یہ اس کا حسن کہ ہے میری نقشبندی کی طرح

ملے تو ایسے ملے جیسے دوستِ برسوں کے  
چھٹے تو ایسے کہ لگتے ہیں اجنبی کی طرح

چرایا جس نے کوئی صاحبِ نظر ہو گا  
چمک رہی تھی وہ ہیرے کی روشنی کی طرح

جن میں روح کے تپ کی طرح آئی تھی  
اور اب گئی ہے تو ساون کی چاندنی کی طرح

تمام کیفیتِ جسم و جاں تمام ہوئی  
کسی کا پیار نہیں اس کی دلبری کی طرح

چمک رہا تھا مژدہ پر ستارۂ سحری  
اداس وہ بھی تھی سردارِ جعفری کی طرح

## اے شہ سوارو

پھیلا ہوا ہے دشتِ جگر تاب  
 پیاسے ہیں چشمے پیاسے ہیں گرداب  
 کچھ اور ہوں مے جینے کے آداب  
 خونِ جگر ہی اب ہے مے تاب  
 اے شہ سوارو  
 اے شہ سوارو

انٹتے مگولے عفریت پیکر  
 سورج کی کرنیں سفاک خنجر  
 مگرتے ہیں کٹ کر شاہیں کے شہ پر  
 شوقِ سفر ہی اپنا ہے رہبر  
 اے شہ سوارو  
 اے شہ سوارو

وادی بہ وادی منزل بہ منزل  
 صحرا بہ صحرا ساحل بہ ساحل

قاتل ہی قاتل، قاتل ہی قاتل  
 دل سا سپاہی سر، کے مقابل  
 اے شہ سوارو  
 اے شہ سوارو

آئی کہاں سے بوئے بہاراں  
 جادو بھری ہے صوت ہزاراں  
 شاید یہیں ہے شہر نگاراں  
 کچھ اور ہمت اے زوقی یاراں  
 اے شہ سوارو  
 اے شہ سوارو

جانا ہے آگے جذبِ نظر تک  
 عزمِ سفر سے ختمِ سفر تک  
 موجِ بلا سے موجِ گہر تک  
 خشکیِ لب سے دامنِ تر تک  
 اے شہ سوارو  
 اے شہ سوارو



## العطش

العطش، العطش، العطش  
 ہم نفس گرم لو، ہم قدم خار و خس  
 زیرِ پا بجلیاں، آندھیاں پیش و پس  
 سارباں اور کچھ تیز بانگِ جرس  
 العطش  
 العطش  
 العطش

رہگذر، رہگذر، کارواں، کارواں  
 پیاس کی سرزمین پیاس کا آسمان  
 خواب در خواب رقصاں ہے جوئے رواں  
 سارباں اور کچھ تیز بانگِ جرس  
 العطش  
 العطش  
 العطش

محملوں میں یہ سب بے راہ کون ہیں  
 پاہ زنجیر یہ بے نوا کون ہیں  
 یہ شہیدان راہ وفا کون ہیں  
 سارباں اور چھ تیز بانگ جس  
 اعطش  
 اعطش  
 اعطش

خون سے سرخ سورج ہیں نیرواں پہ سر  
 سرخ ہیں شہر مظلوم کے بام و در  
 شب کے سینے میں خنجر ہے رنگ سحر  
 سارباں اور کچھ تیز بانگ جس  
 اعطش  
 اعطش  
 اعطش

حق و باطل کی ہر عہد میں جنگ ہے  
 ہر زمانہ شہادت سے لگ رہا ہے  
 ہر رجز شعلہ نور و آہنگ ہے  
 سارباں اور کچھ تیز بانگ جس  
 اعطش  
 اعطش  
 اعطش

## پس دیوارِ زنداں

پس دیوارِ زنداں کیا ہے  
 آنسو ہیں کہ تارے ہیں  
 بھیجی مغموم آنکھیں ہیں  
 کہ انکارے دہکتے ہیں  
 تمناؤں کا سیلِ نغمہ ہے  
 یا جوشِ گریہ ہے  
 محافہ پنچہ نہیں کہتے  
 مگر زنجیر کی آواز یہ مژدہ سنا تی ہے  
 کہ حلقے ٹوٹ جائیں گے  
 پیچھے عشقِ سب آوارہ میکش لوٹ آئیں گے  
 اگرچہ جامِ وسائی قید ہیں  
 اور تختِ تختِ عدالت پر  
 ریاکاروں کے حلقے میں  
 سیکاروں کے پیرے میں  
 مگر کب تک  
 کہ زنجیروں کی جھکڑوں کا نغمہ بڑھتا جاتا ہے  
 کہ زندانوں کی دیواروں کا قامت گھٹتا جاتا ہے  
 صلیبوں پر آسمی  
 پیغمبروں کی صحرانی ہے

## چار شعر

جب سے انسان کی عظمت پہ زوال آیا ہے  
ہے ہر اک بت کو یہ دعویٰ کہ خدا ہو جیسے  
ایک آواز سی ہے وقت کے سنائے میں  
دل تپتی کے دھڑکنے کی صدا ہو جیسے  
ہے افق تا بہ افق خون شہیداں کی شفق  
کسی شعلے کے لپکنے کی ادا ہو جیسے  
دل کو اس طرح سے چھوتی ہے کسی حسن کی یاد  
عارض گل پہ لب بادِ مباح ہو جیسے



## ہوسِ دل

(ہوس کو بے نشانہ کا کر کیا کیا)

غالب

ہوسِ دل ہے کہ رقصِ مہ و سال اور ابھی  
لطفِ معشوقِ خورشیدِ جمال اور ابھی  
در ابھی بندہ ہو شوق کے میخانے کا  
جامِ جم اور ابھی جامِ سفال اور ابھی  
اک غزل اور کسی دشمنِ جاں کی خاطر  
وہی آتشِ کدو ہجر و وصال اور ابھی  
بس نکھرنے ہی کو ہے درد کے شعلے کا جمال  
بشمِ مظلوم میں تھوڑا سا جمال اور ابھی



## دو شعر

یہ کون آیا شب وصل کا جمال لیے  
تمام عمر گزشتہ کے ماہ و سال لیے

ہزار رنگ خزاں کا بدن پہ پیراہن  
زوالِ حسن میں بھی حسنِ لازوال لیے



## نئی نسل کے نام

مجھے نظر سچا کر کہاں جاؤ گے

اے مرے آفتابو

راہ میں رات کی بے کراں جھیل ہے

اور اونچی ہیں لہریں

آسمانِ سخن کے نئے ماہتابو

تیرگی ڈھونڈتی پھر رہی ہے تمہارا پتہ

اور وہ صرف میں جانتا ہوں

ورد کی شاہراہ سے گذر کر

آنسوؤں کی ندی کے کنارے

غم کی بستی میں جو نور کا جھونپڑا ہے

اس میں رہتے ہو تم

میری ہی طرح خانہ خرابو

سازشیں کر گسوں کی طرح اڑ رہی ہیں  
 ان کے پر تھک کے گر جائیں گے  
 اور تمھاری بلندی نہ چھو پائیں گے  
 تم اسی طرح پرواز کرتے رہو گے  
 اور تمھارے پروں کی چمک  
 کہکشاں کہکشاں گیت گاتی رہے گی  
 اے مرے شعلہ پیکر عقابو

اپنے لوح و قلم تو دکھاؤ ذرا  
 سچ کہو کیا تمھارے تراشے ہوئے لفظ میں  
 میری آواز کا شائبہ بھی نہیں  
 میری آواز جو پہلے غالب کی آواز تھی  
 اور پھر روج اقبال کا زمزمہ بن گئی  
 آج کے نغمہ شوق میں ڈھل گئی  
 صبح فردا کی وادی میں جوئے رواں  
 میری آواز  
 پتھر میں شعلہ ہے  
 شعلہ میں شبنم  
 اور طوفان میں طوفاں  
 اور تمھارے بھی سینے میں اس کی چھین ہے  
 سچ کہو  
 آنے والے زمانے کی روشن کتابو

مجھ سے نظروں چرا کر کہاں جاؤ گے؟

{ } { } { }

## غزل

کوئی ہو موسمِ تھم نہیں سکتا رقصِ جنوں دیوانوں کا  
زنجیروں کی جھنکاروں میں شورِ بہاراں باقی ہے

عشق کے مجرم نے یہ منظرِ اوجِ دار سے دیکھا ہے  
زنداں زنداں محسوسِ حلقہٴ یاراں باقی ہے

برگِ زرد کے سایے میں بھی جوئے ترنم جاری ہے  
یہ تو شکستِ فصلِ خزاں ہے صوتِ ہزاراں باقی ہے

مستحیوں کی خشکیِ دل پر ایک زمانہ ہنستا ہے  
تر ہے دامن اور وقارِ بادہ گساراں باقی ہے

پھول سے چہرے، چاند سے کھڑے نظروں سے روپوش ہوئے  
عارضِ دل پر رنگِ حنا ہے دس ہزاراں باقی ہے

XXXXX

## ایک شعر

آتشِ خون میں تر پیار جلتے ہو مگر  
کیا غضب کرتے ہو خنجر تو چھپاؤ صاحب



## غزل

کبھی کبھی، کبھی گریاں، کبھی رقصاں چلیے  
دور تک ساتھ ترے عمر گریزاں چلیے

ذوقِ آرائش و گلِ کاریِ اشکِ خوں سے  
کوئی بھی فصل ہو فردوسِ بداماں چلیے

رسمِ دیرینہٗ عالم کو بدلنے کے لیے  
رسمِ دیرینہٗ عالم سے گریزاں چلیے

آسمانوں سے برستا ہے اندھیرا کیسا  
اپنی پلکوں پہ لیے جسنِ چراغاں چلیے

شعلہٗ جاں کو ہوا دیتی ہے خود بادِ سوم  
شعلہٗ جاں کی طرح چاکِ گریباں چلیے

عقل کے نور سے دل کیجئے اپنا روشن  
دل کی راہوں سے سوئے منزلِ انساں چلیے

غمِ نئی صبح کے تارے کا بہت ہے لیکن  
لے کے جب پرچمِ خورشید زرافشاں چلیے

سربکف چلنے کی عادت میں نہ فرق آ جائے  
کوچہٗ دار میں سرست و غزلخواں چلیے



## غزل

لو کے موسم میں بہاروں کی ہوا مانگتے ہیں  
ہم کعبہ دستِ خزاں پر بھی حنا باندھتے ہیں

ہم نہیں سادہ دلی ہائے تمنا مت پوچھ  
بے وفاؤں سے وفاؤں کا صلہ مانگتے ہیں

کاش کر لیتے کبھی کعبہ دل کا بھی طواف  
وہ جو پتھر کے مکانوں سے خدا مانگتے ہیں

جس میں ہوسطوتِ شاہین کی پرواز کا رنگ  
لب شاعر سے وہ بلبل کی نوا مانگتے ہیں

تاکہ دنیا پہ کھلے ان کا فریبِ انصاف  
بے خطا ہو کے خطاؤں کی سزا مانگتے ہیں

تیرگی جتنی بڑھے حسن ہو افزوں تیرا  
کبکشاں مانگ میں ماتھے پہ ضیاء مانگتے ہیں

یہ ہے وارثِ شوق کا عالم سردار  
بارشِ سنگ ہے اور بادِ صبا مانگتے ہیں

~~~~~

غزل

جس پہ نازل ہو رہا ہے اب مثنیوں کا عذاب
نغمہ شائستگی دست کاراں تھا یہ شہر

خاکِ دل اڑتی ہے اب جس طرح پروانوں کی خاک
صبح گل، روزِ طرب، شامِ بہاراں تھا یہ شہر

کون ہے فریاد رس، مانگیں گے کس سے خوں بہا
زیرِ پائے نخواستِ آدمِ شکاراں تھا یہ شہر

طوقِ زریں گردنِ خرمیں نظر آتا ہے آج
کل تک جولانگہ چابک سواراں تھا یہ شہر

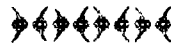


ایک شعر

خدا حسین و جمیل ہے اور تمھاری آنکھوں میں جلوہ گر ہے
وہ موجِ رنگِ بہارِ تم جس سے گلے فشاں ہو مری نظر ہے

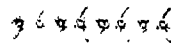
ایک شعر

مصعب رخ پہ جو زلفوں نے لکھا بسم اللہ
آئی زنجیر کے حلقوں کی صدا بسم اللہ



ایک نظم

جو آسماں پہ چمکتا ہے وہ قمر ہے کچھ اور
جسے ہم اپنا کہیں وہ قمر زمیں پہ ہے
وہ جس کے حسن سے روشن جہیں ستاروں کی
وہ جس کے حسن سے رنگینیاں بہاروں کی
وہ حسن پھول میں، ذرے میں، آفتاب میں ہے
وہ حسن حرف میں، نغمے میں ہے، کتاب میں ہے
وہ حسن شعلے میں، شبنم میں ہے شراب میں ہے
وہ حسن جس سے ہے تصویر کائنات میں رنگ



سہمندر کی بیٹی

(ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہے)

پریم چند

جب وہ بوجھ اٹھاتی ہے
 اور ٹوکری سر پر رکھتی ہے
 دو ہاتھوں کی قوس قزح میں
 اس کی گردن اور بھی اونچی ہو جاتی ہے
 اک تلواری کھینچ جاتی ہے
 یہ گردن جو کبھی نہیں جھک پاتی ہے
 (ہاں شرماء کر جھک جانے کی بات الگ ہے)
 یہ گردن
 جو جسم کے اوپر
 چہرے کے گلہ سے کو
 اور ہونٹوں کے برگ گل کو
 آراستہ کرنا جانتی ہے
 جیسے کوئی دستِ حنائی
 ناز و اداسے عشق و جنوں کو
 حسن کا تحفہ پیش کرے

دریاؤں کی سمنی چاندنی
 سونے جیسی دھوپ میں جھلک، جھلک کرتی
 نہ بکوں اور لگیوں سے ایسے مڈرتی ہے

جیسے کوئی مغرور جوانی
 اپنے بدن پر، اپنے بدن کی کرنوں کا پیرا من پہنے
 بہک رہی ہو
 اس کی چال میں پھرتی لوج ہواؤں کا
 پانی کی لہروں کی روانی
 اس کا سینہ بوجھ کے نیچے
 اور ابھر کر
 چاند اور سورج پر ہنستا ہے
 اس کی بھوؤں کی شوخ کمانیں
 تن جاتی ہیں
 کو لیے اور کر کی جنبش
 رانوں سے پیروں کے ٹکڑوں تک بل کھاتی چلی جاتی ہیں
 اس میں ہے رفتار زمانہ کی بے باکی
 جو صدیوں سے تاج و تخت کو ٹھکراتی
 اور محلوں کو قبروں میں سلاتی
 رواں دواں ہے

اونچی ایزی
 ہرن کھری کی جوتیاں پہنے
 اچک اچک کر چلنے والی دو تیزائیں
 گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتی ہیں
 اور چھیرن اپنی چاندی اپنا سوتا
 سر پہ اٹھائے
 آگے بڑھ جاتی ہے
 اس کے بالوں اور بالوں میں جے ہوئے پھولوں کی خوشبو

چاروں سمت بکھر جاتی ہے
 دور سے ایک آواز آتی ہے
 مچھلی لے لو
 مچھلی لے لو

روزِ محرم کو
 نیلے ساحل کی یہ نیلیم پیکرِ بنی
 رنگِ شفق سے ظاہر ہو کر
 شامِ تلک
 پھر رنگِ شفق کے پردے میں چھپ جاتی ہے
 اور سمندر گیت سنا سنا رہتا ہے
 میں نے اجنٹا کی آنکھوں میں
 اس کو فروزاں دیکھا ہے



دو شعر

تصور اپنا، اپنی آرزو، شوقِ فضول اپنا
 بس کے، عارضِ اس کے، تبہبِ زلفِ دراز اس کی

خوشی ایک گلِ بانگِ بہارِ عاشقانہ ہے
 تبسم اس کی غزلیں روئے روشن ہے عارضِ اس کی

دولتِ دنیا کا حساب

تم کہ ہو محاسبِ سیم و زر و لالہ و مہر
ہم سے کیا مانگتے ہو دولتِ دنیا کا حساب
چند تصویرِ تماں، چند حسینوں کے خطوط
چند ناکردہ گناہوں کے سلگتے ہوئے خواب

ہاں مگر اپنی فقیری میں غنی ہیں ہم لوگ
دولتِ دردِ دل و دردِ جگر رکھتے ہیں
خسکی لب ہے تو کیا دیدہ تر رکھتے ہیں
اپنے قبضے میں نہیں اطلس و سحاب و سور
جسم پہ پیرہنِ شمس و قمر رکھتے ہیں
گھر تو روشن نہیں الماس کے فانوسوں سے
قصر و ایوان پہ جو برسے وہ شرر رکھتے ہیں
جو زمانے کو بدل دے وہ نظر رکھتے ہیں

اس خزانے میں سے جو چاہو اٹھالے جاؤ
اور بڑھ جاتا ہے یہ مال جو کم ہوتا ہے
ہم پہ تو روزِ زمانے کا کرم ہوتا ہے
شاخِ گل بنتا ہے جب ہاتھ قلم ہوتا ہے

کرشمہ

مرے لہو میں جو توریت کا ترنم ہے
مری رگوں میں جو یہ زمزمہ زبور کا ہے
یہ سب یہود و نصارا کے خوں کی لہریں ہیں
پہل رہی ہے جو میرے لہو کی گنگا میں

میں سانس لیتا ہوں جن پیمبروں کی جنبش سے
کسی معنی آتش نفس نے بجھنے ہیں
جواں ہے مصعب یزداں کا لہجہ داؤدی

کسی کی زمکی آنکھوں کا زمکی پردہ
مری نظر کو عطا کر رہا ہے بیٹائی
نگاہ شوق کی ہیں بے قراریاں کیا کیا
طلوع مہر کی ہیں نقش کاریاں کیا کیا
مہ و نجوم کی ہیں جلوہ باریاں کیا کیا
زمیں سے تا بہ فلک رقص میں ہیں لیلائیں
تکلف صورت و گل، ہر طرف تمنائیں

خدا کا شکر ادا جب زبان کرتی ہے
تو دل تڑپتا ہے اک ایسی کافرہ کے لیے
خدا بھی میری طرح جس کو پیار کرتا ہے
وہ جسم تاز محب الجمال کا نغمہ

وہ سر سے پاؤں تک ماہ و سال کا نغمہ
 جلال ہجر و شکوہ وصال کا نغمہ
 جہان عشق میں تفریقِ اسم و ذات نہیں
 جہانِ حسن میں تقسیمِ ہند و پاک نہیں
 سوا گلوں کے گریباں کسی کا چاک نہیں
 یہ عالمِ بشری احترام کا عالم
 تمام تر ہے درود و سلام کا عالم
 نفسِ نفس میں مرے زمزمہِ محبت کا
 مرا وجود قصیدہِ بشر کی عظمت کا
 یہ سب کرشمہ ہے انسانیت کی وحدت کا



پروین شاکر

وہودیاتی کی شاعری کی
 معصوم و حسین و شوخِ رادھا
 وہ اپنے خیال کا کنہیا
 اس شہر میں ڈھونڈنے لگی تھی
 دستور تھا جس کا سنگِ باری

وہ فیضِ مذاق سے زیادہ
 تقدیسِ بدن کی نغمہ خواں تھی

تہذیب بدن کی رازداں تھی
 گلزار لیوں کی تہنیت میں
 گلزار لیوں سے گلشن تھی
 لب آشنا لب غزل کے مصرعے
 جسم آشنا جسم نظم پیکر
 لفظوں کی ہتھیلیاں حنائی
 تشبیہوں کی انگلیاں گلابی
 سرسبز خیال کا گلستاں
 مہم سے کچھ آنسوؤں کے چشمے
 آہوں کی وہ ہلکی سی ہوائیں
 صد برگ ہوا میں منتشر تھے
 تلی تھی کر قص کر رہی تھی
 اور درد کے بادل سے چھن کر
 نغموں کی پھوار پڑ رہی تھی
 پر شور منافقت کے بازار
 افواہیں فروخت کر رہے تھے

وہ اپنی شکلہ شخصیت کو
 اشعار کی چادروں کے اندر
 اس طرح سمیٹنے لگی تھی
 احساس میں آ رہی تھی وسعت
 نظروں کا اقی بدل رہا تھا
 اور درد و جہان آدمیت
 نوٹے ہوئے دل میں ڈھل رہا تھا

اس عالم کیف و کم میں اک دن
 اک حادثے کا شکار ہو کر
 جب خوں کا کفن پہن لیا تو
 از میں صلیبیں نو در خواں تھی
 خاموش تھا کرپ خود گلای
 اب کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے باقی
 باقی ہے سخن کی دلو بازی

جنت میں ہے حسن نو کا سماں
 محفل میں مجاز و بآزن ہیں
 موجود ہیں کیس اور شبلی
 یہ مرگ جواں کے سارے عاشق
 خوش ہیں کہ زمین پاک سے اک
 نو مرگ بہار آگئی ہے
 لپٹی ہوئی خاک کی ہے خوشبو
 اور سایہ گلن صحاب رحمت



صفارت خانہ جاں

(ایک نظم ہزار سال پرانی)

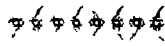
ہمارے دل میں اک صفارت خانہ جاں ہے
 صفارت جس کا پرچم دل جلوں کی آہ سوزاں ہے
 بس اک دستور عشق و عاشقی جو میر ساماں ہے
 یہاں آنے کا رستہ کوچہ چاک گریاں ہے
 یہاں ہے روشنی تنہا چراغ جسم پر نم کی
 یہاں آؤ تو کھل جائیں گی راہیں سارے عالم کی

یہاں کشمیر بھی، ڈھاکہ بھی ہے، کاشی بھی کعبہ بھی
 زمیں کا حسن بھی اور جلوہ عرش معلیٰ بھی
 یہاں جمیل بھی ہے دجلا بھی ہے ذنب و گنگا بھی
 عقب میں دور تک پھیلا ہوا دھبہ تنہا بھی
 سرو و منزل ما کبریا، اس کا ترانہ ہے
 حقیقت ہے فقط انسان، باقی سب فسانہ ہے



نذرِ اختر الایمان

رواں ہے لشتی عمر رواں آہستہ آہستہ
خیال و خواب ہو گا یہ جہاں آہستہ آہستہ
جو اٹھتا ہے دل و جاں سے دھواں آہستہ آہستہ
بھی جاتی ہے کوئی کہنشاں آہستہ آہستہ

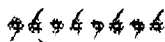


تین شعر

تری دلبری کا تحفہ، یہ ستارہ بار آنکھیں
مے شوق سے اچھلتی خوش و پر خمار آنکھیں

مرسدل پہ سایہ فگن مری روح و جاں میں روشن
یہ فرشتہ کیر زلفیں یہ خدا شکار آنکھیں

رہے تا ابد سلامت یہ دل و نظر کی جنت
یہ صدا بہار پیکر یہ صدا بہار آنکھیں



احمد فراز کے نام

(چلو میں ہاتھ بڑھاتا ہوں دوستی کے لیے)

فراز

تمہارا ہاتھ بڑھا ہے جو دوستی کے لیے
مرے لیے ہے وہ اک یا غم سار کا ہاتھ
وہ ہاتھ شاخِ گلِ گلشنِ تنہا ہے
مہک رہا ہے مرے ہاتھ میں بہار کا ہاتھ

خدا کرے کہ سلامت رہیں یہ ہاتھ اپنے
عطا ہوئے ہیں جو نفسِ سنوار نے کے لیے
زمین سے نقشِ مٹانے کو ظلم و نفرت کا
فلک سے چاند ستارے اتارنے کے لیے

زمینِ پاک ہمارے جگر کا گھڑا ہے
ہمیں عزیز ہے دہلی و بھنوی کی طرح
تمہارے لہجے میں میری نوا کا لہجہ ہے
تمہارا دل ہے حسیں میری آرزو کی طرح

کریں یہ عہد کہ اوزارِ جنگ جتنے ہیں
انھیں مٹانا ہے اور خاک میں ملانا ہے
کریں یہ عہد کہ اربابِ جنگ ہیں جتنے
انھیں شرافت و انسانیت کھٹکانا ہے

جینیں تمام حسینانِ خیبر و لاہور
 جسیں تمام جوانانِ حبِ کشمیر
 ہوں بے غم و مہر و وفا کی تابانی
 کتابِ دل پہ فقط حرفِ عشق ہو تحریر

’تم آؤ گلشنِ لاہور سے چمنِ بردوش
 ہم آئیں صبحِ بنارس کی روشنی لے کر
 ہمایہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر
 پھر اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے‘



وید مقدس

شعورِ انساں کے آفتابِ عظیم کی اولیں شعائیں
 جو لہن و آواز بن گئی ہیں
 وہ اولیں عالمِ تحریر
 زمین کیا آسمان کیا ہے؟
 ستارے کیوں جگمگا رہے ہیں
 تحریر اک نغمہٴ مسلسل
 تحریر اک رقصِ والہانہ
 تحریر اک فکرِ عارفانہ

کوئی ہے خالق تو وہ کہاں ہے؟
 اگر نہیں ہے تو پھر یہ کیا ہے؟
 یہ دل میں کس نور کی ضیاء ہے؟
 بشر کا جلوہ ہے یا خدا ہے؟



چنڈالکا 1

یہ خاک پاک جو گوتم کے قدموں سے متور ہے
 شراوتی کی بستی ہے
 یہاں اک سادہ و معصوم دل
 روشن ہوا تھا عشق کے پاکیزہ شعلے سے
 دھواں اٹھا
 بدن سے عود و عنبر کی مہک آئی
 وہ خوشبو
 اب بھی آوارہ ہے جنگل کی ہواؤں میں



1 میرے وطن بلرام پور سے چند میل کے فاصلے پر شراوتی کا قدیم علاقہ ہے جہاں گوتم بدھ نے بہت سی مائیں گزاریں۔ چنڈالکا ایک اچھوت لڑکی ہے جو گوتم بدھ کے ایک شاگرد آنند پر عاشق ہو گئی تھی یہ عشق اس کو گوتم بدھ کے ہار تک لے آیا اور وہ وہیں رہ گئی۔

غزل

شمع کا، مے کا، شفق زار کا گلزار کا رنگ
سب میں اور سب سے جدا ہے لبِ دلدار کا رنگ

تہہ عارض جو فروزاں ہیں ہزاروں شمعیں
لطیف اقرار ہے یا شوخی اقرار کا رنگ

آئی مہکی ہوئی پھر جشنِ ملاقات کی رات
جام میں ڈھلنے لگا شام کے رخسار کا رنگ

عکسِ ساقی سے دکھ اٹھی ہے ساغر کی جبین
اور کچھ شوخ ہوا بادۂ گلزار کا رنگ

ان کے آنے کو چھپاؤں تو چھپاؤں کیسے
بدلا بدلا سا ہے میرے در و دیوار کا رنگ



